شیرازہ
جموں ۔ کشمیر ۔ لداخ
قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں (جلد نمبر ۸)
جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ماہنامہ

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

جلد: ۵۰

جموں۔ کشمیر۔ لداخ

قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں (جلد: ۸)

شمارہ: ۹ تا ۱۱

نِگراں : خالد بشیر احمد

مُدیراعلیٰ : محمد اشرف ٹاک

معاون مدیر: سلیم سالکؔ

معاونین: سلیم ساغرؔ، محمد اقبال لون

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپیوٹر کمپوزنگ: بشارت احمد بابا

مطبع: میکاف آفیسٹ پرنٹرس

قیمت: مجلد: ۱۵۰ روپے ، پیپر کور : ۱۰۰ روپے

'شیرازہ'' میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی یا اِدارے کا کُلّا یا جزواً اتفاق ضروری نہیں۔

سَرورق: فردوس فیروز

☆......خط وکتابت کا پتہ:

محمّد اَشرف ٹاک

مدیرِ اعلیٰ ''شیرازہ'' اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

سرینگر / جموں

Email ID:- sheerazaurdu@gmail.com

فہرست

.... ✦ ✦ ✦ ....

حرفِ آغاز

شیرازہ کے ''جموں۔ کشمیر۔ لداخ۔ قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں'' کو مرتّب کرنے کے جس پروجیکٹ کی ابتداء آج سے قریب ایک دہائی قبل کی گئی تھی، وہ کامیابی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ اِس جامع پروجیکٹ کی سات جلدیں پہلے ہی ہمارے قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ کر دادو تحسین حاصل کرچکی ہیں اور آج اِس سیریز کی آٹھویں جلد آپ کے ہاتھوں میں دے کر شیرازہ ایک نئی تاریخ رقم کر رہا ہے۔ اِس پروجیکٹ نے ریاست کی ثقافت کے بعض ایسے گوشوں کو منصۂ شہود پر لایا ہے جن پر اِس سے قبل بہت کم لکھا گیا تھا۔ زیرِ نظر جلد میں لوک کہانیوں میں تواریخ، برٹش لائبریری میں کشمیر، سر جیمز ڈوئی کی مشہور کتاب ''تصویرِ کشمیر'' لداخ کے بروکھپا، قدیم کشمیر میں ثقافتی سرگرمیاں، ضلع کٹھوعہ: تاریخ کے تناظر میں اور کشمیری مثنویوں میں کشمیر کی منظر کشی جیسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ اِن موضوعات پر فاضل مقالہ نگاروں نے بعض نئے زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ ہماری ریاست کے ایک حصے بلتستان، جسے تبتِ خورد بھی کہا گیا ہے، کے بارے میں ہمارے پاس بہت کم معلومات ہیں۔ کشمیر اور بلتستان کے درمیان قدیم روابط رہے ہیں۔ وہاں کے بعض علاقوں میں کشمیری اور بلتی پر مبنی ایک مخلوط زبان بولی جاتی ہے اور وہاں کشمیریوں نے شادی بیاہ کی اپنی رسومات

جاری رکھی ہیں۔پوری دُنیا میں کھیلے جانے والے ''پولو'' کا ماخذ بلتی ہے جس کے معنی گول چیز یا گیند ہیں۔بعض تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ یہ کھیل بلتستان ہی سے آیا۔بلتستان کے لوک گیت لداخ کی تاریخ اور تمدن پر معلومات کا خزینہ ہیں جس پر ابھی تک کوئی منضبط کام نہیں ہوا ہے۔کشمیری لوک کہانیاں میں یہاں کی پُر پیچ تواریخ کے کتنے ہی خزینے دفن ہیں۔اگرچہ لوک ادب تواریخ کا مکمل متبادل نہیں ہوسکتا تاہم اِس میں اُس وقت کے سماجی حالات رسوم ورواج عقائد وخواہشات اور تجربات ہوتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ کشمیری زبان کی بہت سی لوک کہانیوں کشمیر کی تواریخ کو ضبطِ تحریر میں لائے جانے سے قبل بھی گردش میں تھیں اور اجتماعی ذہن اِن کو ہر زمانے میں محفوظ ہوتا رہتا تھا جو اصل تحریری تواریخ کی عدم موجودگی میں سماجی تواریخ کا کام کرتی رہتی تھیں۔غلام نبی آتش نے ''کشمیری لوک ادب میں تواریخ'' کے عنوان سے اپنے مقالے میں کشمیری کی ہزاروں برسوں پر محیط تواریخ پر لوک ادب کے اثرات کو مترشح کیا ہے جس سے تاریخ کی بعض گم گشتہ کڑیوں جوڑنے میں مدد ملتی ہے۔

برٹش لائبریری میں قدیم مخطوطات کا ایک بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔اِن میں دیگر مخطوطات کے ساتھ ساتھ کشمیر سے تعلق رکھنے والے بعض نادر ونایاب مخطوطات بھی شامل ہیں۔برٹش لائبریری میں اِن مخطوطات کے حوالے سے کافی کام ہوا ہے لیکن کشمیر میں اِن مخطوطات کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ڈاکٹر ایاز رسول نازکی صاحب نے اِن میں سے بعض مخطوطات کا احاطہ کرنے والا معلوماتی مقالہ ہمیں مرحمت فرمایا ہے جو کہ شاملِ اشاعت ہے۔اِسی طرح قریب ایک سو برس قبل سر جیمز میک ڈوئی کی کتاب ''پنجاب شمال، مغرب صوبہ سرحد اور کشمیر'' شائع ہوئی۔جیمز میک ڈوئی نے تاجِ برطانیہ کے ملازم کی حیثیت سے اِس خطے میں پینتیس سال گزارے۔اُس کا مشاہدہ نہایت تیز اور معلومات نہایت وسیع تھیں۔اُس نے اپنی مذکورہ

کتاب میں اِس خطے کی جغرافیائی تفصیلات حیوانات، نباتات، آبادی اور اِنتظامیہ سے متعلق آنکھوں دیکھی یاداشتیں جمع کی ہیں جو قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔

جموں خطّے کے بھدرواہ علاقے کی زمانہ قدیم ہی سے منفرد اور جداگانہ شناخت رہی ہے۔ کسی زمانے میں یہ خود مختار علاقہ رہا ہے اور قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ ثقافتی لحاظ سے بھی مالا مال رہا ہے۔ اِس علاقے پر لکھنے والوں میں پنڈت کلہن، جی۔ ٹی۔ وینی، فیڈرک ڈریو، فادر ووگل، ہچی سن، سر چارلس اِلیی سن بیٹس، مولوی حشمت اللہ خان اور بعض دیگر معتبر مورّخین شامل ہیں۔ بشیر بھدرواہی صاحب نے اِن تمام ماخذوں سے استفادہ کر کے بھدرواہ پر ایک نہایت ہی وقیع مضمون ہمیں مرحمت فرمایا ہے جن سے علاقے کے بارے میں بعض نئی باتیں سامنے آجاتی ہیں۔ زیرِ نظر اشاعت ۱۸۹۸ء میں تحریر کردہ ''رہبرِ سیاحت'' اور بعض دیگر کتابوں پر سیرِ حاصل تبصرے شامل کئے گئے ہیں جن سے آج سے ایک، ڈیڑھ سو برس قبل کے کشمیر کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

جیسا کہ پہلے ہی تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ یہ سلسلہ قریب ایک دہائی قبل شروع کیا گیا تھا اور کامیابی کے ساتھ اپنی منزلیں طے کر رہا ہے۔ آٹھویں جلد پریس میں بھیجنے کے بعد نوّیں جلد کے لئے تیاریاں شروع کی گئیں اور ہمارے فاضل مورّخین اور مقالہ نگاروں کی کرم فرمائیں شاملِ حال رہیں تو بہت جلد اس سیریز کی نوّیں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔

اِس اِشاعت میں شامل مضامین کے بارے میں آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

☆...... محمد اشرف ٹاک

✿...... عبدالغنی شیخ

بلتستان

ڈوگرہ دورِ حکومت میں بلتستان ریاست جموں و کشمیر کا حصہ تھا اور ضلع لداخ کی ایک تحصیل تھا۔ ڈوگرہ جرنیل زور آور سنگھ نے ۱۸۴۰ء میں بلتستان پر فوج کشی کی اور ڈوگرہ قلمرو میں شامل کیا۔ اس سے پہلے بلتستان کو بلتی یُول یا بلتی دیش کہا جاتا تھا۔

مقامی طور بلتستان، بلتی یُول کا فارسی ترجمہ ہے۔ بلتستان کو تبتِ خورد بھی کہا گیا ہے۔ بلتستان کے تین ضلع ہیں جو ۲۹۹ مواضعات پر مشتمل ہیں۔ ریاست کے اس دیرینہ ہمسایہ سے متعلق جانکاری میں قارئین کے لئے دلچسپی کا سامان ہے۔

جغرافیہ اور آبادی بلتستان کا مجموعی رقبہ ۲۶,۲۰۵ مربع کلو میٹر ہے۔ ۱۹۷۱ء کی لڑائی میں تقریباً ۳۸۸ مربع کلومیٹر کا علاقہ ہندوستان کے قبضے میں آیا۔ یہ تورتوک، تخشی، چولونکھا اور تھنگ گاؤں پر مشتمل ہے۔ رقبہ میں بلتستان لداخ سے چھوٹا اور آبادی میں زیادہ ہے۔

بلتستان کی آبادی سوا چار لاکھ کے قریب ہے۔ نوے فیصدی آبادی امامیہ اثنا عشریہ اور نور بخشیہ پر مشتمل ہے۔ باقی اہل سنت اور اہلِ حدیث ہیں۔ سکردو میں چند اسماعیلیہ گھرانے ہیں اور ایک بہائی خاندان ڈوگرہ دورِ حکومت سے آباد ہے۔

تقسیمِ ملک سے پہلے متحدہ ہندوستان کے شہر شملہ، مسوری، ڈلہوزی، سرینگر، کشمیر اور کئی شہروں میں کم و بیش دس ہزار بلتی تھے۔

بلتستان دو پہاڑی سلسلوں کوہ قراقرم اور کوہِ ہمالیہ کے درمیان واقع ہے۔ قراقرم کی ۱۵۰ چوٹیاں بلتستان کی حدود میں واقع ہیں، جن میں دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے۔ٹو بھی ہے۔ یہ سکردو سے ۲۰۱ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

قطبِ شمالی اور قطبِ جنوبی کے بعد بلتستان اور لداخ میں دنیا کے سب سے زیادہ اور بڑے گلیشیر پائے جاتے ہیں۔ دونوں خطوں کے برفانی پہاڑوں میں ۴۴۶۳ گلیشیر ہیں۔ ان میں دریائے سندھ کے طاس میں ۷۹۶ اور دریائے شایوق کے طاس میں ۲۶۶۷ گلیشر ہیں۔ ۲۰۰۹ء کی ایک سروے رپورٹ کے مطابق سندھ طاس ۲۲۲۵ مربع کلومیٹر رقبے میں آٹھ ذیلی طاسوں Basins پر محیط ہے۔ ان میں لیہہ، سورو، ہنلے، زنسکار وغیرہ کے علاقے شامل ہیں۔ شایوق طاس ۱۷۰۵ مربع کلومیٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں نو ذیلی طاس ہیں جن میں نوبراہ، رنگدو، سومدو، سالٹرو، چنگ چھنو وغیرہ شامل ہیں۔ شایوق وادی میں دنیا کے چند عظیم ترین گلیشر ہیں جن میں ایک سیاچن گلیشر ہے۔ اس کی لمبائی ۷۳ کلومیٹر ہے۔ اسی وادی میں دو اور بڑے گلیشر ہیں جو ۴۳ اعشاریہ ۵۷ کلومیٹر اور ۱۳۱ اعشاریہ ۲۵ کلومیٹر لمبے ہیں۔ قطبین کے بعد یہ دنیا کے بڑے گلیشر ہیں۔ سیاچن کا مطلب بلتی یا لداخی میں گلاب گلیشر ہے۔ ستم ظریفی ہے کہ اب یہ دنیا کا بلند ترین میدانِ جنگ بنا ہے۔

ماسوائے چند زیادہ تر گلیشر چھوٹے چھوٹے ہیں۔ اوسطاً یہ ایک کلومیٹر سے چھوٹے ہے۔ سندھ طاس میں ایسے گلیشروں کی تعداد ۵۳ فیصد ہے جبکہ ۴۲ فیصد گلیشروں کی لمبائی ایک کلومیٹر اور پانچ کلومیٹر کے درمیان ہے۔ شایوق طاس میں ۴۵ فیصد گلیشیر ایک کلومیٹر سے چھوٹے ہیں جبکہ لگ بھگ ۵۰ فیصد گلیشیر ایک کلومیٹر سے لمبے

اور پانچ کلو میٹر سے چھوٹے ہیں۔

صدیوں سے ہزاروں لوگ ان گلیشیروں کے دامن اور ان کی گھاٹیوں میں بسے ہیں اور انہی کے سہارے جیئے ہیں۔ بلتستان اور لداخ کی نوے فیصد آبادی گلیشیر کے پگھلے پانی سے کھیتی باڑی کرتی ہے۔ اپنے باغ، باغیچوں کو سیراب کرتی ہے۔ اسی کا پانی پیتی ہے۔ لداخی کہاوت ہے۔ 'اگر وادی کے بالائی حصے میں گلیشیر ہیں تو اس کے نشیبی حصّے میں اس کا کچھ پانی ضرور پہنچے گا'۔ آب و ہوا میں تبدیلی اور سورج کی حدّت سے اب یہ گلیشئر تیزی سے پگھل رہے ہیں۔

بلتستان اور لداخ کے دریاؤں کا منبع یہی گلیشئر ہیں۔ بلتستان کے چار اور لداخ کے چار معاون دریاؤں کا پانی دریائے سندھ میں جاتا ہے۔ بلتستان میں چھوٹی بڑی متعدد جھیلیں اور سرد اور گرم پانی کے چشمے ہیں۔ اسی طرح لداخ میں بھی کئی بڑی جھیلیں اور گرم پانی کے چشمے ہیں جو گلیشئروں کی دین ہیں۔

لداخ اور بلتستان میں پرانے زمانے سے گلیشئروں کی بقا کے لئے ان کا تحفظ کیا جاتا رہا ہے اور نئے گلیشئر کی پرورش کی جاتی ہے۔ گلیشئر کے تحفظ کے لئے اس کے گرد دیوار بندی کی جاتی ہے۔ بلتستان میں مصنوعی گلیشئر کی ساخت اور پرورش کے لئے کسی قدیم گلیشئر سے کئی من یخ جائے مقصود پر پہنچایا جاتا ہے۔ جگہ کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ یہ ٹھنڈی ہوا اور دھوپ کم لگے۔ گلیشئر کو نر اور مادہ میں تقسیم کیا گیا ہے اور دونوں جنسوں کے گلیشئر سے یخ لیا جاتا ہے۔ نقل و حمل کے دوران کہیں رکنا اور بات چیت کرنا منع ہے۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ان لوازمات کا پاس نہ رکھیں تو یخ نشو و نما نہیں پاتا ہے۔ یخ کو ایک گڑھے میں ڈالا جاتا ہے اور اس کو کوئلہ اور بھوسے سے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ اس کے اوپر ایک جھونپڑی بنائی جاتی ہے جس کی چھت کے سوراخ سے یخ پر پانی کے قطرے ٹپکانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس طرح گلیشئر پروان چڑھتا ہے۔ بلتستان

میں ایسے بڑے مصنوعی گلیشئر ہیں۔

کشمیر اور بلتستان: یہ کشمیر اور بلتستان کے درمیان اچھے تعلقات رہے ہیں۔ بلتستان کے راجاؤں نے مختلف ادوار میں کشمیر سے مختلف پیشوں سے منسلک کاریگروں کو یہاں لاکر بسایا تھا۔ کچھ لوگ تجارت کے سلسلے میں بلتستان میں آئے تھے اور یہاں بس گئے تھے۔ ان کی اولاد وانگا، مہدی آباد، سیک میدان وغیرہ میں کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ وانگا میں کشمیر اور بلتی پر مبنی ایک مخلوط زبان بولی جاتی ہے جس میں زیادہ تر کشمیری الفاظ ہیں۔ سیک میدان نو آباد کار کشمیریوں کا رکھا ہوا نام ہے۔ سیک کشمیری میں ریت کو کہتے ہیں۔ یہ میدان ریتیلا ہوگا۔ کشمیریوں نے یہاں کے معاشرہ پر کچھ نہ کچھ اپنا اثر چھوڑا ہے۔ محرم پر کہیں کہیں کشمیری میں مرثیہ پڑھا جاتا ہے۔ کشمیریوں نے شادی بیاہ کی اپنی رسومات جاری رکھی ہیں۔

لداخ اور بلتستان: لداخ اور بلتستان کے درمیان صدیوں سے سماجی، ثقافتی اور تجارتی تعلقات رہے ہیں۔ دونوں ایک خاندان کے افراد کی طرح ہیں جو حوادث زمانہ سے منقسم اور الگ ہوئے ہیں۔ آب و ہوا، جغرافیائی اور تمدنی لحاظ سے دونوں خطوں میں گہری مماثلت ہے۔ دونوں ایک جیسے سیاسی اور تاریخی حالات سے گزرے ہیں۔ اکیسویں صدی میں دونوں کے سامنے یہ چیلنج ہے کہ کیونکر روایات اور جدیدیت کے درمیان توازن پیدا کیا جائے۔

لداخ اور بلتستان پہاڑی علاقے ہیں۔ پہاڑ ننگے ہیں جن پر کہیں کہیں چھدری چھدری سبز گھاس اگتی ہے۔ آب و ہوا سرد و خشک ہے۔ دونوں علاقوں میں ایک جیسے نباتات اور جنگلی جانور پائے جاتے ہیں۔ لداخ کو شکاریوں کی جنت کہا گیا ہے۔ بلتستان بھی شکاریوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہر سال سینکڑوں شکاری لداخ اور بلتستان شکار کے لئے آتے تھے جو عموماً یورپی ہوتے تھے۔ بلتستان کے جنگلی جانوروں میں

مارخور، کیل، اڑیال، ہرن، برفانی چیتا، بھیڑیا، ریچھ، خرگوش، لومڑی، جنگلی بلی، سگِ آبی، سیاہ گوش، لکڑ بگا اور Marmot شامل ہیں۔ چکور اور رام چکور دو شکاری مرغابیاں ہیں۔

دونوں خطوں کے باشندے منگول نسل کے ہیں۔ جس میں آریائی خون کی آمیزش ہے۔ ۱۸۴۶ء میں انگریز محقق الیکزنڈر کنینگھم کی سروے کے مطابق دونوں نسلوں کے لوگوں کی اوسط قد و قامت یکساں ہے۔ البتہ چہرے کے نقوش قدرے مختلف ہیں۔

عمومی طور دونوں کے تمدن، خوراک، زبان، رہن سہن اور لباس میں گہری یکسانیت ہے۔ لداخیوں کی طرح روایتی طور بلتی اونی چوغے پہنتے ہیں اور کمر باندھتے ہیں۔ ماضی میں اون لداخ سے برآمد ہوتی تھی۔

زمانہ حال میں سکردو میں لوگوں نے روایتی لباس کو خیر باد کہا ہے۔ راقم الحروف اور نوانگ چھرنگ شقسپو ۱۹۹۵ء میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لئے اسلام آباد گئے تھے۔ ایک بلتی سکالر سید محمد عباس کاظمی نے شقسپو سے لداخی لباس لیا۔ وہ اسے دوبارہ مروّج کرنے کے خواہش مند تھے۔

لداخ میں خلسے، ٹانگچے، تارو، مُلبیک جیسے مقامات اور بلتستان میں ستپورہ وادی، شگر وغیرہ میں ایک جیسے سنگ تراشی کے نمونے ملے ہیں۔

دونوں خطوں کی بول چال کی زبان کا ماخذ تبتی ہے اور ایک ہی رسم الخط ہے۔ فی زمانہ بلتیوں نے فارسی یا اردو رسم الخط اختیار کیا ہے۔ بلتی ادیبوں نے اس سلسلے میں ایک اردو قاعدہ مرتب کیا ہے۔ اردو میں ۳۷ حروف تہجی ہیں جبکہ لداخی میں ۵۰ حروف تہجی ہیں۔ چنانچہ لداخی میں صوتی لحاظ سے چند ایسے حروف ہیں جن کے متبادل حروف اردو میں نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں اردو کے چند حروف تہجی پر اعراب ڈال کر اضافی لداخی حروف کے متبادل حروف وضع کیئے ہیں۔ اردو رسم الخط میں بلتی شاعری کا سرمایہ بہت بڑا ہے۔

بلتی بول چال کی زبان لداخی بول چال کی زبان کے مقابلے میں تلفظ اور لہجے

کے لحاظ سے کلاسیکل لداخی کے زیادہ قریب اور صحیح بتائی جاتی ہے۔

لداخی بلتستان کو سکردو کہتے ہیں۔جس طرح یہ مشرقی ترکستان یا شین جیانگ کو یارقند کہتے ہیں۔سکردو اور یارقند ان خطوں کے دو شہر ہیں۔سکردو بلتستان کا صدر مقام اور مرکزی شہر ہے۔یارقند چینی ترکستان کے چھ بڑے شہروں میں ایک شہر ہے۔جن دنوں لیہہ وسطِ ایشیا کا اہم مرکز تھا، یارقند ایک اہم تجارتی شہر تھا۔باقی پانچ اہم شہر اُروچی (موجودہ راج دھانی)، ختن، کاشغر، کارغالیک اور کوچہ ہیں۔چینی ترکستان کے لوگ اپنے وطن کو اسی بنا پر آلتے شہر یا چھ شہروں کا ملک کہتے ہیں۔

بلتی سکالر سید محمد عباس کاظمی نے سکردو کا مفہوم بیابان اور اجاڑ قرار دیا ہے۔لداخیوں نے سکردو کا الگ مطلب بیان کیا ہے۔ان کے مطابق سکر سے مراد گھر ہوا اور دُو کا معنی چٹان ہے۔یعنی چٹانوں سے گھری ہوئی زمین۔

بلتی کا لفظی معنی آبی وادی ہے۔بل کے معنی وادی اور تی سے مراد پانی ہے۔بلتی مغربی تبّت کی قدیم اور بڑی سلطنت جنگ جونگ کی بولی سے ماخوذ ہے۔جنگ جونگ کی سلطنت مغربی تبّت سے گلگت تک پھیلی ہوئی تھی اور بلتستان اور لداخ اس میں شامل تھے۔ایک مورّخ کے مطابق چینی ترکستان کا شہر ختن بھی اس میں شامل تھا۔

لداخی زبان میں کئی ایسے الفاظ ہیں جن کا لاحقہ تی ہے جیسے چُگتی (بارش سے چھت سے ٹپکتا ہوا پانی)، ناتی (ناک سے بہتا ہوا پانی) اور راتی (سیلاب کا پانی)

جنگ جونگ کی بولی ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی ہے۔

لداخ میں کئی مقامات بلتیوں سے منسوب ہیں۔جیسے بلتی برانگسا (بلتی کیمپ) بلتی پُولو (بلتی Hut یا کٹیا) بل کھنگ (بلتی بستی) آیو وغیرہ۔بلتی کیمپ لیہہ، چینی ترکستان کے تجارتی راستے پر لیہہ سے ۲۷۲ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے جبکہ بلتی کٹیا اسی راستے پر لیہہ سے ۲۰۵ کلومیٹر دور ہے۔بل کھانگ لیہہ بازار کے شمالی سرے پر واقع تھا۔بلتی

بیوپاری وغیرہ اسی جگہ رہتے تھے۔ لیہہ سے چار کلومیٹر دور ایک بلتی خاتون نے ایک قریہ بسایا تھا۔ شروع میں اس کا نام ایوم (اماں) پڑا تھا۔ جو بگڑ کر اب ایو ہو گیا ہے۔

تبّت کا حصہ: ساتویں صدی میں تبت پورے خطے میں ایک عظیم طاقت تھا اور چین سے نبرد آزما رہتا تھا۔ بلتستان کی سرحد پر واقع دروں کے لئے، جنہیں اس زمانے میں بولور یا شاید پورٹو کہا جاتا تھا، محاذ آرائی ہوتی تھی۔ بلتستان وقتاً فوقتاً میدانِ کارزار بنا۔ بعد میں اس لمبی جنگ میں عرب اور کشمیر کے حکمران للتہ دیتہ کود پڑے۔ ۷۵۱ء کے فوراً بعد تبّتی فوج بلتستان پر قابض ہوئی۔ Kingdom of Ladakh کے مصنف لوسینو پیٹک نے چینی دستاویز سے ایک اقتباس کا حوالہ دیا ہے، جس کے مطابق تبتیوں نے بلتیوں کو کہا تھا۔ 'ہم تمہاری قلمرو کے خلاف کوئی سازش نہیں کر رہے ہیں بلکہ چار گریسن پر حملہ کرنے کے لئے آپ کے علاقے کے صرف راستے کا استعمال کر رہے ہیں'۔

لمبی مدّت تک اس جنگ میں فریقین کی پیش قدمی اور پسپائی جاری رہی۔ کئی دفعہ تبّتی فوج بلتستان سے ہوتے ہوئے چین کی سرحدوں تک پہنچی۔ تاہم فتوحات دائمی طور قائم نہیں رہی۔ چند مورخین کے مطابق اس دوران لداخ میں فوجوں کی نقل و حرکت رہتی تھی۔

تبّتی دورِ حکومت میں بلتستان بلتی یول (بلبتوں کا دیش) اور لداخ، مریُول، (سرخ رنگ کی مٹی کا دیش) کے ناموں سے جانے جاتے تھے۔

آٹھویں صدی میں عرب جرنیل قتیبہ بن مسلم نے چین ترکستان کا شہر کاشغر فتح کیا۔ نویں صدی میں سارا وسطِ ایشیا عربوں کے قبضے میں آیا اور سارا وسط ایشیا حلقہ بگوش اسلام ہوا۔

۷۳۷ء میں بلتستان اور ختن کے حکمران اسوار اور من تبّت ساتھ ایک لڑائی میں مارا گیا۔ وہ پلولا شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ تب بلتستان اور ختن میں گہرے دوستانہ

تعلقات تھے۔اسواراور من کی ہلاکت کے بعد سکردو کے راجا کا ولی عہد وجے یاور من نے دونوں ملکوں کی حکومت سنبھالی۔خیال کیا جاتا ہے، تب بلتستان کے لوگ ہندو دھرم کے پیرو کار تھے۔روایات اور تاریخ کے مطابق بلتیوں نے مختلف ادوار میں پارسی (زرتشت کا مذہب)، بون چھوس اور بدھ مت اختیار کئے۔بدھ مت سے تبّت نے روشناس کیا۔ بون چھوس مغربی تبت سے آیا اور بلتستان تک پھیل گیا۔تبّتی تمدّن اور مذہب پر بون چھوس نے اثر ڈالا ہے۔تبّت میں آج بھی بون چھوس کے ماننے والے ہیں اور ان کے مندر ہیں۔دلائی لاما کے ہمراہ بون چھوس کے کچھ پیرو کار بھی ہندوستان آئے اور مندر تعمیر کئے۔لیہہ کے قریب تبّتی بستی کے ساتھ بون چھوس کے چند پیرو کاروں کے لئے ایک چھوٹا سا مندر بنا ہے جس میں بون کا پروہت رہتا ہے۔

شین رب میدو نامی ایک شخص کو بون مت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔

ایک بلتی سکالر غلام حسن لو بسانگ اپنی کتاب ،تاریخِ بون فلسفہ، میں بون بنیادی عقائد کے بارے میں لکھتا ہے۔

'بون مت کے ماننے والے وجود کو دو حالتوں میں منقسم تصوّر کرتے تھے۔ایک وجود مخفی اور دوسرا وجودِ ظاہری۔وجودِ مخفی سے مراد وہ ماورائی ہستیاں جو کائنات میں موجود تو ہیں مگر وجود ظاہری یعنی انسان انہیں دیکھ نہیں سکتے۔البتہ محسوسات کی مدد سے ان کی موجودگی کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔وہ وجودِ مخفی کو بھی دو مختلف شجروں میں منقسم تصوّر کرتے تھے۔جن میں ایک شجرے کو ''ہلا'' کے نام سے جبکہ دوسرے کو ''ہلو'' کے نام سے یاد کرتے تھے معروف تہذیبی پسِ منظر میں ہلا سے دیوتا اور ہلو سے ارواحِ خبیثہ مراد ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے۔وہ انہی دو قوتوں کی ایما پر ہوتا ہے۔جس واقعہ یا کام میں انسانی فلاح نظر آتی، اسے دیوتا سے منسوب کرتے جبکہ ضرر رساں واقعات کو ہلو کی کارستانی قرار دیتے ...... بون مت کے پیرو کار دونوں قوتوں کو خود مختار سمجھتے

تھے...... بون مت میں بقا اور نجات کے حوالے سے "ہلو" کو ایک منفی قوت کے طور پر اور "ہلا" کو ایک مثبت قوت کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا...... بون مذہب کے پیروکاروں کا عقیدہ تھا کہ "ہلا" جہاں انسانوں کو ارواح خبیثہ کے شر سے بچائے رکھتا ہے وہاں بداعمال انسانوں کی روحوں پر ارواحِ خبیثہ مسلط کر کے انہی خوف و ہراس اور ذہنی کرب میں مبتلا کر دیتا ہے...... بون مذہب کا عبادت خانہ جہاں لوگ "ہلا" کی پرستش بجالاتے تھے ہلا کھنگ کے نام سے موسوم تھا...... بون مذہبی عالم اپنے عبادت خانوں میں عوام الناس کو مذہبی تعلیمات سے روشناس کراتے۔ نیز خاص تہواروں پر "ہلا" کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے مختلف عملیات کی بجاآوری کے لئے ریاضت بھی کرتے تھے۔

دسویں صدی میں تبت خانہ جنگی سے کمزور ہوا۔ اس کا ایک بڑا سبب بدھ مت کے ماننے والوں اور بون چھوس کے حامیوں کے مابین آپسی ناچاقی تھی۔ بلتستان اور لداخ تبت کی دستبرد سے آزاد ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد سکردو، خپلو اور شگر میں اپنی اپنی حکومتیں قائم ہوئیں۔ وہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ یہ سلسلہ مغلیہ دورِ حکومت میں بھی جاری رہا، جب ایک کمزور حکمران وقتاً فوقتاً کشمیر کے مغل گورنر کی وساطت سے مغل حکومت یا لداخی راجوں سے اپنی حکومت کی حفاظت یا بحالی کے لئے مدد کے طلبگار ہوتے تھے۔

تبت نے بلتستان میں اپنا ورثہ چھوڑا جو دیرپا اور دوررس تھا۔ صدیوں تک تبتی زبان، رسم الخط، طب، جنتری، کیسر کی رزمیہ داستان وغیرہ کا اثر رہا۔

۱۳۸۱ء میں میر سیدّ علی ہمدانیؒ بلتستان آئے اور بلتیوں کو اسلام کی دعوت دی اور بہت سارے لوگوں نے ان کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ انہوں نے سب سے پہلے کھری ڈونگ میں ایک مسجد تعمیر کی۔ اس کے بعد گمبہ سکردو میں جامع مسجد تعمیر کی اور نمازِ جمعہ کی شروعات کی۔ وہ شگر، خپلو، تھلے، سالتورو، چولونکھا وغیرہ گئے اور اسلام کا پیغام پہنچایا۔

ترکستان اور ماوراء النہر کے علاقوں میں ڈیڑھ سال گزارنے کے بعد شاہ ہمدان

۱۳۸۳ء میں دوبارہ بلتستان آئے۔ اب کے وہ شگر کے موضع برالدو گئے۔ انہوں نے کئی مقامات پر مساجد تعمیر کرائیں۔

شاہِ ہمدان ۱۳۸۱ء یا ۱۳۸۲ء میں لداخ بھی آئے اور لیہہ سے ۱۲ کلومیٹر دور شے میں مسجد تعمیر کی۔ یہ لداخ کی پہلی مسجد ہے اور شاہِ ہمدانؒ کی نسبت سے اسے ایک آستانہ کا درجہ حاصل ہے۔ اُن دنوں شے لداخ کا دارالخلافہ تھا۔

میر سیّد علی ہمدانیؒ ایک عظیم المرتبت خدارسیدہ شخص تھے۔ ان کے زہد و تقویٰ، معرفتِ الٰہی اور عشقِ سرمدی کا شہرہ آج بھی خطے میں ہے۔ غالباً ان کی اسی ہمہ گیر شخصیت کا سحر ہے کہ لداخ اور بلتستان میں اکثر مساجد کی تعمیر کا سہرا ان کے سر باندھا گیا۔

ان کے بعد شیخ میر دانیال اور میر شمس الدین عراقی آئے اور اسلام کے نوربخشیہ مکتبہ فکر کی اشاعت کی۔ نئی تحقیق کے مطابق میر شمس الدین عراقی نے امامیہ مکتبۂ فکر کی تبلیغ نہیں کی۔ نئی تحقیق کی روشنی میں سید نوربخش بھی بلتستان یا لداخ نہیں آئے۔ ان کے مذکورہ جانشینوں اور مقلدین نے بلتستان میں ان کا پیغام پہنچایا۔ نیز ان میں سید ناصر طوسی، سید علی طوسی اور سید حیدر طوسی شامل ہیں۔ اول الذکر دو ۱۶۰۳ء میں آئے اٹھارہویں صدی میں کشمیر سے دو بھائی میر عارف اور میر ابوسعید چپلو وراد ہوئے۔ عارف نے تھگنس میں اور ابوسعید نے کریس میں جامع مسجدیں تعمیر کیں۔ ان کے بعد سلسلۂ نوربخشیہ کے دو مبلغین اور اور ابوسعید کے بیٹے میر سید یحییٰ اور میر مختار بلتستان کے موضع شگر پہنچے۔

شیعہ مسلک اور اہلِ سنت کے علما ان کے بعد پہنچے۔ محمد یوسف حسین آبادی کی تصنیف ''بلتستان پر ایک نظر'' اور غلام حسن سہروردی کی کتاب ''تاریخ بلتستان'' ۱۹۹۲ء کے مطابق پہلے پہل اہل سنت مکتبۂ فکر کی اشاعت ایک حنفی عالم دین محمد حسین المعروف ملا پشاوری نے کی۔ وہ ۱۸۹۰ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان براستہ چھوربٹ بلتستان آئے۔

اہلِ سنت کی آبادی اہلِ حدیث میں بٹ گئی۔ بعد میں مولانا سید ابوالحسن، مولانا

رضا الحق، حافظ محمد موسیٰ، مولانا عبدالرحیم، مولانا عبدالکریم وغیرہ کی تبلیغ سے مزید تقویت پہنچی۔

بلتستان میں شیعہ مسلک کی اشاعت کا آغاز سید محمد عباس (متوفی ۱۹۲۸ء) سے ہوا۔ ان کے علاوہ اوّلین شیعہ مبلغین میں شیخ جواد ناصر الاسلام، آغا سید عباس، شیخ غلام حسین، سید شاہ عباس اور شیخ عبداللہ بلتستان کے پہلے مقامی ہم عصر علماء تھے۔ شیخ جواد سید شاہ عباس اور شیخ غلام حسین نجف اشرف کے فارغ التحصیل تھے۔ شیخ جواد ۱۹۳۰ء اور آغا دسیّد عباس ۱۹۲۸ء میں انتقال کر گئے۔ غلام حسن سہروردی کے مطابق یہ علماء ایران کے حوزہ ہائے علمیہ سے بھی آراستہ ہو کر لوٹے تھے۔ ان کے ہاتھوں بلتستان میں شیعہ مکتبۂ فکر کو عروج حاصل ہوا۔ بعد میں ان کے شاگردوں نے تبلیغ جاری رکھی۔ اور اہلِ بیت اثنا عشریہ کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔

لداخیوں اور بلتیوں میں تنازعے: لداخ اور بلتستان کے درمیان دوستانہ تعلقات میں گاہے گاہے دراڑ آتی رہی۔ گذشتہ ایک ہزار سال کے دوران دونوں میں جھگڑے ہوئے ہیں اور دونوں نے ایک دوسرے پر فوج کشی کی ہے۔ لداخ نے لہا چھن، اوت پالا اور گیالپو سینگے نمگیل جیسے جنگجو بادشاہ پیدا کئے ہیں۔ جن کی حدودِ سلطنت لداخ کی سرحدوں سے بہت دور قائم ہوئیں۔ خاص کر اوت پالا کے عہد میں لداخ مغربی ہمالیہ میں سب سے طاقت ور ملک تھا۔

بلتستان نے علی میر شیر خان اور رنچن جیسا جنگجو حکمران پیدا کیا ہے۔ رنچن کا مطلب طاقت ور ہے۔ اور 'اعظم' کے معنی میں بھی لیا جاتا ہے۔ علی میر لداخ پر قابض ہوا تھا۔

علی میر شیر خان کی بیٹی گل خاتون کا عقد ۱۵۹۱ء مغل شاہزادہ ولی عہد جہانگیر سے ہوا۔ تب اکبرِ اعظم کی حکومت تھی۔ بلتیوں کو اس شادی پر بڑا ناز تھا۔ علی میر کا اکبر کے

دربار سے دیرینہ رابطہ تھا۔ ۱۵۹۵ء میں آگرہ سے موسیقار اسکردو لائے گئے اور بلتی موسیقار تربیت کے لئے دہلی بھیجے گئے۔

اسکردو میں مغلوں کے طرز کا ایک محل اور ایک باغ بنایا گیا۔ مغل دربار کی تقلید میں اسکردو کے راجا کے ہاں دن میں پانچ مرتبہ نوبت بجائی جاتی تھی۔ اکبر کے دربار میں یورپ سے تمباکو پہنچنے کے دس سال بعد لداخ میں تمباکو پہنچا تھا۔

گل خاتون جوانی میں چل بسی۔

بلتیوں کے ساتھ لڑائیوں میں عام طور لداخیوں کا پلہ بھاری رہتا تھا۔ ایسے میں بلتی دہلی کے مغل حکومت سے مدد کی اپیل کرتے تھے۔ مغلوں نے دونوں خطوں کی علاقائی خودمختاری کو قائم رکھا تھا۔ منگول اور تبتی حملہ آور فوج کو لداخ سے پسپا کرنے کے لئے لداخی راجا دے لیکس نمگیل نے مغل حکومت سے مدد مانگی اور لداخی حکمران کے ایک وفد نے وزیرِ اعظم کی قیادت میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب سے سرینگر میں ملاقات کی۔ اورنگ زیب کے حکم پر ۸۴۔۱۶۸۳ء میں کشمیر کے مغل گورنر نے لداخ فوج بھیجی اور منگول تبتی مشترکہ فوج کو پسپا کیا۔

بلتستان اور لداخ کے مابین لڑائیوں سے دونوں قوموں کے درمیان کسی قسم کی تلخی یا عداوت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ فریقین نے وقتاً فوقتاً دوستی اور صلح وصفائی کا ہاتھ بڑھایا اور تجارتی تعلقات قائم رہے۔ دونوں شاہی خاندانوں میں کئی مرتبہ ازدواجی رشتہ قائم ہوا ہے۔ راجا سینگے نمگیل کی ماں گیال خاتون بلتستان کے خپلو کے بلتی راجا یبگو شیر غازی کی بیٹی تھی۔ ایسا ہی ازدواجی رشتہ پودیگ (علاقہ کرگل) کے مسلم اور لداخ کے بودھ شاہی خاندانوں میں بھی تھا۔

ڈوگرہ سرکار کی محکومی سے زمانۂ حال تک:

ڈوگروں کے حملوں اور ۱۸۳۰ء کی دہائی میں لداخیوں کی ایک سے زیادہ مرتبہ

بغاوت کا علم بلند کرنے کے بعد زور آور سنگھ نے لداخ کو محکوم بنادیا اور ۱۸۴۰ء میں بلتستان پر حملہ کیا۔ زور آور سنگھ نے لداخی راجا چھیپ تندو بہ نمگیل کو بلتستان کی مہم میں اپنے ساتھ لیا۔ راجا سکردو میں چیچک سے چل بسا بلتستان پر قابض ہونے کے بعد زور آور سنگھ نے سکردو کے راجا احمد شاہ اوران کے بیٹے محمد علی خان، کو تبّت کی لڑائی میں زبردستی اپنے ساتھ لیا۔ زور آور سنگھ کی ہلاکت اور ڈوگرہ فوج کی تباہی کے بعد احمد شاہ اور کئی لداخی لیڈر بلتیوں کے قیدی بنے۔ احمد شاہ کو باعزت رہا کیا گیا۔ لداخیوں اور بلتیوں نے ایک اور مرتبہ بڑے پیمانے پر بغاوت کی اور آزادی اور خودمختاری کی بحالی کے لئے بڑی قربانیاں دیں لیکن یہ قربانیاں رائیگاں گئیں۔ باہمی ناچاقی اور سازش کی وجہ سے بلتی اور لداخی اپنے مقصد میں ناکام ہوئے اور بے پناہ مصائب کے شکار ہوئے۔ راجا احمد شاہ اوران کے عزیزوں کو حراست میں لے کر جموں لیا گیا اور انہیں قید کر کے جموں سے کشتواڑ منتقل کیا جہاں حالت قید میں ان کا انتقال ہوا۔ حالات معمول پہ آنے کے بعد ان کے تین بیٹوں کو وادی کشمیر میں ترال کے دیہہ پنیر میں کچھ اراضی بطورِ جاگیر واگذار کی۔ تینوں بیٹے بلتی میں مرثیہ گو شاعر تھے۔ چوتھا بیٹا امیر حیدر محزون بھی غالباً شاعر تھا۔ محزونؔ ان کا تخلص ہونا چاہیئے۔ وہ بلتستان میں ڈوگرہ فوج کی جارحیت کے دوران ہلاک ہوا تھا۔ راجا احمد شاہ کا ایک بیٹا حسین علی خان محبؔ بلند پایہ شاعر تھا۔ ان کے دوسرے بیٹے ملک حیدر مخلصؔ کا بیٹا محمد علی خان ذاکر کا مرتبہ بطور مرثیہ گو شاعر بہت بلند تھا۔ محمد حسن حسرتؔ نے ان دونوں کو بلتی مرثیہ گوئی کے آسماں پر طلوع ہونے والے درخشندہ ستارے بتایا ہے۔ کاچو اسفندیار خان نے محبؔ اور ذاکر کے بلتی کلام کو داستانِ کربلا' کے نام سے کتابی صورت میں ترتیب اور تالیف کی ہے اور رقم طراز ہے کہ اہلِ ادب اگر محبؔ کو بلتستان کا انیسؔ نہیں مانتے ہیں تو ذاکر کو بلتستان کے دبیر کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ کاچو اسفندیار خان کے مطابق غریب الوطنی کے دوران بھی ان کے مرثیہ ترال سے پوریگ اور بلتستان پہنچ کر زبان زد

عام ہو جاتے تھے۔

محمد علی خان ذاکر جولائی ۱۹۴۹ء میں ترال پنیر میں فوت ہوا۔ ان کے جنازے میں پنیر کے سارے باشندے اُمڈ آئے۔

حسین علی خان محبؔ کا پوتا اور راجا احمد شاہ کا چشم و چراغ راجا احمد علی خان پنیر میں سکونت پذیر ہیں جن کے آبا و اجداد نے بلتستان کی تاریخ میں ایک اہم داستان رقم کی ہے۔

۱۸۹۹ء میں ڈوگرہ سرکار نے بلتستان، لداخ اور گلگت کو ایک ضلع بنایا۔ دو سال بعد فرانٹیئر لداخ کے نام سے لیہہ، بلتستان اور کرگل تحصیلوں پہ مشتمل ایک نیا ضلع بنایا گیا اور اس کے منتظمِ اعلیٰ کو وزیرِ وزارت کا نام دیا گیا۔ سکردو کو سرمائی صدر مقام اور لیہہ کو گرمائی صدر مقام بنایا۔ وزیرِ وزارت ستمبر سے مارچ تک سکردو میں رہتا تھا۔ اس کے بعد تین ماہ کرگل اور تین ماہ لیہہ میں گزارتا تھا۔ بعد میں وزیرِ وزارت کا دفتر چھ ماہ لیہہ اور چھ ماہ سکردو میں کام کرنے لگا۔

ڈوگرہ حکومت کے دور میں لداخیوں اور بلتیوں کی زندگی میں مثبت تبدیلی نہیں آئی۔ اعلیٰ تعلیم چند افراد تک محدود تھی۔ گذشتہ صدی کے آغاز میں دونوں خطوں میں معدودے چند لوگ پڑھے لکھے تھے۔ سکردو اور لیہہ میں ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کی دہائی میں چند افراد کو لاہور سے اردو اخبارات اور رسائل آتے تھے۔ تین غیر مقامی افراد کے پاس ریڈیو گرام تھے۔ تاہم محدود وسائلِ مواصلات اور رسل و رسائل کی کمی کے باوجود بہت سارے لوگ متحدہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی سے آگاہ تھے۔ لداخ کے واحد مجاہدِ آزادی منشی عبدالستار کو ۱۹۳۳ء میں آزادی کی تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں سکردو کے جیل خانہ میں قید کیا گیا۔ منشی عبدالستار لیہہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں مجھے بتایا کہ سکردو کے باشندوں کو ان سے گہری ہمدردی تھی۔ وہ ڈوگرہ انتظامیہ سے ٹکراؤ کے لئے تیار تھے۔ منشی نے انہیں باز رکھا۔ چھ ماہ بعد ان کو جیل سے رہا کیا گیا۔

۱۸۷۵ء میں برٹش جوائنٹ کمشنر کی پہل پر ڈوگرہ انتظامیہ نے لیہہ اور سکردو میں ڈاک خانہ کھولا۔ برٹش جوائنٹ کمشنر کو برطانوی ہند حکومت نے وسطِ ایشیا کے امورِ تجارت کی دیکھ بال کے لئے لیہہ میں تعینات کیا تھا۔ وہ گرمیوں کے چند مہینے لیہہ میں گزارتا تھا۔ تب لیہہ وسطِ ایشیا کا اہم تجارتی مرکز تھا۔ بقولِ ایک برٹش جوئنٹ کمشنر آر، ایل کینز۔ ''نہر سوئز کے لئے پورٹ سعید کو جو اہمیت ہے وسط ایشیا کے تجارتی راستے کے لئے لیہہ کو وہی اہمیت ہے۔''

تب وسطِ ایشیا بلتیوں اور لداخیوں کے لئے کھولا گیا۔ بہت سارے بلتی اور لداخی وسطِ ایشیا میں بس گئے تھے۔ ۱۸۶۸ء میں ایک برطانوی افسر رابرٹ شا نے ایک وفد کے ساتھ چین ترکستان کا دورہ کیا۔ وہ اپنی کتاب High Territory, Yarqand and kashgar میں لکھتے ہیں۔

''بہت سارے بلتی یارقند کے گردونواح میں آباد ہیں جہاں وہ چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں زیادہ تر تمبا کو اور خربوزہ کی کاشت کرتے ہیں۔

۱۸۹۲ء میں لیہہ اور سکردو میں انتظامیہ نے پرائمری سکول کھولا اور ۱۹۰۸ء میں ان کو مڈل کا درجہ دیا۔

سکردو اور لیہہ قصبے سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کے مرکز تھے۔ خاص کر لیہہ خطے کی مشترکہ ثقافت کا مرکز تھا۔ آزادی سے پہلے دونوں قصبے بہت چھوٹے تھے۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق تب لیہہ قصبہ کی آبادی ۲۷۳۳ نفوس تھی اور سکردو کی آبادی ۲۵۳۷ تھی۔

آج لیہہ کی آبادی لگ بھگ ۴۰ ہزار ہے جبکہ سکردو میں ساٹھ ہزار لوگ رہتے ہیں۔

لداخ اور بلتستان تقریباً ایک ساتھ شخصی حکومت کی غلامی سے آزاد ہوئے۔ لالہ امرناتھ آخری وزیرِ وزارت تھا۔ لیہہ سے وہ سرمائی صدر مقام سکردو اپنے دفتر کے ساتھ حسبِ معمول منتقل ہوا تھا۔ متحدہ ہندوستان دو حصوں میں بٹ گیا۔ ۱۱ر فروری ۱۹۲۴ء کو

پولیس کے ایک سپاہی سرفراز خان نے سکردو میں لالہ امرناتھ کو قتل کیا۔

تقسیم کے نتیجے میں بلتستان پاکستان کے ساتھ گیا اور لداخ ہندوستان کے ساتھ رہا۔

ڈوگرہ حکومت نے خطے میں ۱۰۸ سال کے دوران کئی اہم اقدام کیئے۔سٹیٹ سبجیکٹ قانون پاس کیا جس کے تحت بلتستان اور لداخ کے پشتنی باشندوں کے بغیر کوئی بھی فرد یہاں زمین خرید نہیں سکتا۔قوانین بندوبست اراضی Settlement Rules نافذ کیئے۔اردو کو سرکاری زبان اور ذریعہ تعلیم بنایا۔عملی طور شجرکاری کی اہمیت سے لوگوں کو روشناس کیا۔

غریبی: مقامی راجوں کے دور حکومت میں بلتستان اور لداخ کے عام لوگ غریب تھے لیکن ڈوگرہ راج میں حالت بدتر ہوگئی۔مالیہ بھاری تھا جو کسانوں سے نقد اور جنس کی صورت میں لیا جاتا تھا۔کارِ بیگار اور ریس کا نظام مروّج کیا۔ریس کے نظام کے تحت گاؤں والوں کو سرکاری ملازموں اور سیاحوں کے لئے گھوڑے اور خوراک فراہم کرنی پڑتی تھی۔گاؤں والوں کو اکثر اپنی محنت کیلئے اجرت نہیں دی جاتی تھی۔خاص کر سرکاری ملازم گھوڑے کا کرایہ اور کھانے پینے کا معاوضہ نہیں دیتے تھے۔بیگار بڑی سخت تھی۔اس لئے عام لوگ غریب سے غریب تر ہوگئے تھے۔مشاہدین کے مطابق بلتستان کی حالت لداخ سے بدتر تھی۔وزیر حشمت اللہ نے اپنی تاریخِ جموں ولداخ میں (مطبوعہ ۱۹۳۹ء) میں لکھا ہے:۔

"بلتی لداخیوں اور کرگل والوں سے زیادہ مفلوک الحال ہیں۔تاہم وہ زیادہ خوش اخلاق اور مہذّب ہیں۔"

اسی طرح غلام محی الدین صوفی نے اپنی تصنیف History of Kashmir (۱۹۸۴ء) میں لکھا ہے:

"کشمیریوں کی غریبی ضرب المثل ہے لیکن سکردو اور شگر کے لوگوں کی حالت

بھیانک ہے۔اس میں کوئی شک نہیں۔حتیٰ کہ راستے کی بستیوں میں لکڑی کا بوجھ اٹھائے چیتھڑوں میں ملبوس بلتی، سیلانیوں کی کسی پارٹی کو جو ایک روز کے لئے پاس رُکتی ہے، ڈیڑھ آنہ کے معمولی دام پر بیچنے کے لئے نظر آتے ہیں۔ میں ذاتی تجربے سے کہتا ہوں کہ ان دو مقامات (سکردو اور شگر) کے باغیچوں میں گلی سڑی مقامی خوبانیاں لاس انجیلز، کیلی فورنیا کی بہترین خوبانیوں سے شکل اور شباہت اور نفاست میں فوقیت رکھتی ہیں۔ خربوزہ، سیب اور دوسرے پھل نقل وحمل کی عدم دستیابی کی وجہ سے ضائع ہوتے ہیں۔ان وسائل کے باوجود یہ لوگ نہایات ہی قلاش ہیں۔"

بلتستان اپنے میوؤں اور خشک پھلوں کے لئے مشہور ہے۔ان میں آلو بخار، آلوچہ، خوبانی، سیب، بادام، ناشپاتی، آڑو، اخروٹ، انگور، زرشک، توت چیری، خربوزہ، انار، پستہ اور انجیر شامل ہیں۔محمد یوسف حسین آبادی کے مطابق پھلوں کی سالانہ پیداوار پانچ لاکھ من ہے۔

بلتستان میں ہر قسم کی سبزیاں اور ترکاریاں پیدا ہوتی ہیں لیکن مالی طور لوگوں کی حالت ناگفتہ بہہ ہے۔

ایک انگریز ای، ایف، نائٹ نے ۱۸۹۳ء میں لکھا ہے:

"بلتی ایک بدنصیب اور مظلوم قوم ہے۔ان کا علاقہ گلگت سڑک کے نزدیک ہونے کے نتیجے میں زیادہ تر ان لوگوں کو اس خطرناک راستے پر بار برداری کے لئے زور زبردستی کی جاتی ہے۔"

لداخ کی حالت کو بہتر نہیں کہہ سکتے۔لیہہ کے ایک تحصیل دار اے۔این۔سپرو نے ۱۹۴۰ء کی دہائی میں لداخ کی معیشت پر ایک رپورٹ قلم بند کی ہے۔اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو: "ماسوائے لداخ قرضوں کے بوجھ میں دبے کسی اور خطے کا تصور کرنا بھی مشکل ہے، یہاں کی غیر معمولی بات یوں ہے کہ کرہ ارض پر یہ ایک غریب ترین خطہ ہے

جہاں سُود کی شرح سب سے زیادہ ہے۔'

اس کا الزام واحد سود خوروں پر ہی نہیں لگایا جاسکتا۔ سرکار لوگوں کو دیئے اپنے قرضے پر بھاری سود لیتی تھی۔

تجارت اور ثقافتی رابطے: لداخ اور بلتستان کے درمیان زمانۂ قدیم سے تجارتی تعلقات تھے۔ لداخ، بلتستان سے مکھن، خشک خوبانیاں، گری، اخروٹ، توت، زہر مہرہ سے بنی پیالیاں، چائے دانیاں اور سنگ خارا سے بنی ہنڈی اور دولتوق درآمد کرتا تھا۔ دولتوق کو بلتی کورمبو کہتے ہیں۔ بقولِ محمد حسن حسرت یہ مقامی طرز کے قدیم پریشر کُکر ہے۔ ماضی میں ہر لداخی گھر میں دولتوق ہوتا تھا اور اسے دھات کے برتنوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔

لداخ سے بلتستان پشمینہ، اون اور نمک جاتے تھے۔ عموماً ان کا تبادلہ سوکھی خوبانیوں، توت، مکھن اور ہنڈیوں سے ہوتا تھا۔

بلتی یاک کے سینگ سے حقے بناتے تھے۔ سفر میں اسے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ جب پہاڑی علاقوں میں جاتے تھے وہ اپنے ساتھ خوبانیوں کی اچھی مقدار رکھتے تھے۔ راستے میں سفر کے دوران انہیں بیچ کر کھانے پینے کی چیزیں خریدتے تھے۔ اس طرح شکم پُری کرتے ہوئے وہ اپنی منزل پر پہنچتے تھے۔

اُن دنوں بلتستان نمک کے لئے کلی طور لداخ پر انحصار رکھتے تھے۔ لداخی میں ایک کہاوت ہے۔' بلتیا ژۃ اتھو باژوقس، یعنی جیسے ایک بلتی کو نمک ملے۔'

جب کوئی آدمی مشکل یا تاخیر سے روزمرہ کی کوئی مطلوبہ چیز پاتا ہے تو وہ اس پر ٹوٹ پڑتا ہے یا کسی چیز کے لئے بے تابی دکھائے تو اسی معنی میں یہ کہاوت استعمال ہوتی ہے۔

بلتستان سے خشک شلغم بھی لداخ آتا تھا۔ اس ضمن میں لداخ میں یہ کہاوت مقبول

ہوئی ہے۔ چُپ چاپ رہنے کے بجائے ایک شلغم چباؤ۔ دوسرے الفاظ میں، اگر آپ کو کچھ کرنا نہیں ہے کم سے کم شلغم چباؤ۔

بلتستان سے متعدد لوگ، لداخی مسلمان خاص کر کرگل سے کربلائے معلیٰ، نجف اشرف، ایران اور عراق مذہبی مقامات کی زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ بہت سارے طلباء ان ملکوں کی مذہبی درسگاہوں سے تعلیم حاصل کر کے لوٹتے ہیں اور لداخ اور بلتستان میں اپنے متعلقہ علاقوں میں بطور امام، شیخ اور استاد اپنا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ سماجی، مذہبی اور معاشرتی زندگی پر ان کا گہرا اثر ہے۔

پولو: پولو بلتیوں کا قومی کھیل ہے، جو گھوڑے پر سوار ہو کر کھیلا جاتا ہے۔ سازندے سرنائیوں سے نغمہ زن ہوتے ہیں۔ بادشاہ یا ولی عہد گول کرے تو اس کے اعزاز میں مخصوص دھن بجائی جاتی ہے۔ حکمران خاندان کے دیگر افراد کے لئے دوسری دھن بجائی جاتی ہے۔ وزیروں اور عام کھلاڑیوں کے لئے الگ الگ دھنیں ہیں۔ ان میں اکا دکا دھنیں جزوی طور لداخ میں مستعمل ہیں۔

پولو بلتی لفظ ہے۔ اس کا مطلب گول چیز یا گیند ہے۔ یہ لداخ کا بھی مقبول کھیل ہے۔ چند تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ یہ بلتستان سے آیا اور راجا سینگے نمگیل نے لداخیوں کو اس سے متعارف کرایا۔ راجا نے لیہہ کے پائین میں مرژے کے مقام پر ایک پولو گراؤنڈ بھی بنا تھا۔ چند مورخین لداخ میں اس کی آمد کو قدیم آریاؤں سے منسوب کرتے ہیں جو گلگت، استور وغیرہ سے نقلِ مکانی کر کے لداخ آئے اور یہاں آباد ہوئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ پولو لیہہ کے پاس چھشوت گاؤں میں آباد کار بلتیوں کی دین ہے۔ بہرحال یہ بلتستان یا بلتستان کے راستے آیا تھا۔ یہ راجا اور پرجا دونوں میں مقبول تھا۔ پولو کھیلتے ہوئے ایک لداخی راجا نے اپنی ایک آنکھ گنوائی تھی۔

پولو سے لداخیوں کی غیر معمولی دلچسپی کا ذکر کرتا ہوا لداخ میں ڈوگرہ انتظامیہ کا

انگریز منتظمِ اعلیٰ فریڈوک ڈریو نے ۱۸۷ء کی دھائی میں لکھتا ہے:

''لوگ پولو کھیلنے کے بڑے شوقین ہیں۔ اعلیٰ رتبہ کے لوگ پولو کھیلنا زندگی کا نصب العین سمجھتے ہیں جیسے اسی کے لئے دنیا میں بھیجے گئے ہیں۔ تاہم یہ ان تک محدود نہیں۔ جنہیں بھی سواری کے لئے ایک ٹٹو ملے، وہ بھی شامل ہوتے ہیں۔ غریب ترین لوگ بھی پولو کھیلنے کا بے انتہا شوق رکھتے ہیں۔ بچے کمسنی سے ہی آنکھ اور ہاتھ میں تال میل رکھ کر ہمارک ملک (انگلستان) میں مروّج ہاکی کھیلتے ہوئے پیر سے اس کی تربیت پاتے ہیں۔''

لداخ اور بلتستان کے بہت سارے گاؤں میں پولو گراؤنڈ ہیں۔ ان میں کئی اچھی حالت میں ہیں اور پولو کھیلا جاتا ہے۔

لداخ میں آج کل بھی بلتی طرز کا پولو کھیلا جاتا ہے اور ہر سال ٹورنامینٹ لگتے ہیں۔

بلتستان اور لداخ میں تیر اندازی دوسرا مقبول کھیل ہے۔ تیر اندازوں کے درمیان مقابلہ آرائی ہوتی ہے۔ لداخ میں تیر اندازی ایک تیوہار کی طرح منائی جاتی ہے۔ اس موقعے پر کھیل تماشے ہوتے ہیں۔

دونوں خطوں کے بچوں میں گلی ڈنڈا، آنکھ مچولی اور بنٹا کھیلنا مقبول مشغلے ہیں۔

موسیقی: لداخ میں موسیقی کی ترویج اور فروغ بہت حد تک بلتستان کی رہین منّت ہے۔ راجا جمیا نگ نمگیل سے بلتی شاہزادی گیال خاتون کی شادی پر بارات کے ساتھ بلتی موسیقاروں کی ایک منڈلی بھی لیہہ آئی اور یہاں بس گئی۔ یہ موسیقار لداخ میں خرمون یا شاہی موسیقار کے نام سے جانے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھ دمامہ اور سرنائی لائی جو لداخی زبان میں بگڑ کر دمن اور سُرنا بنا ہے۔ خرمون میں بڑے ماہر سرنائی نواز پیدا ہوئے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے کہ بلتستان میں مغل ساز سنگیت لانے میں بلتی شاہزادی

گل خاتون کا ہاتھ ہے۔موسیقی کے آلات کی طرح اکثر بلتی دُھنوں اور سازوں کے نام فارسی میں ہیں۔ظاہر ہے۔یہ مغلوں کی دین ہیں یا ایران سے آئے ہیں۔حریب (حرب) یا جنگ سے متعلق راگوں کی تعداد ساٹھ بتائی جاتی ہے۔لمنہ یا لشکر کی روانگی کے دوران جو نغمے بجائے جاتے ہیں ان کی تعداد بارہ ہے۔اسی طرح پولو، تیز اندازی، گھوڑ دوڑ، تلوار ناچ، پھول ناچ وغیرہ کے لئے دھنیں ہیں جن میں چند دھنیں بلتستان سے لداخ پہنچی ہیں۔

داستان گوئی : لداخ اور بلتستان میں داستان گوئی بڑی مقبول رہی ہے۔ داستانیں اور حکایتیں موسمِ سرما کی لمبی راتوں میں سنائی جاتی تھیں۔اس کے لئے منجھے ہوئے داستان گو ہوتے تھے۔ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ بلتستان کا ایک داستان گوا پو کریم لداخ کی پرانی داستان من کُوشن نیتوق سمیت دوسری داستانیں اور حکایتیں سناتا تھا۔

سامعین داستان گو کو داد دیتے تھے۔داستان منظوم، نثر یا مخلوط زبان میں سنائی جاتی تھی۔سردی سے محفوظ رہنے کے لئے بیچ میں الاؤ روشن کیا جاتا تھا۔داستانیں اور حکایتیں مقامی اور غیر مقامی دونوں ہوتی تھیں ۔ غیر مقامی داستانیں ایران، عرب چین اور ہندوستان کے لوک ادب سے ماخوذ ہیں۔مقامی حکایتوں کی فہرست لمبی ہے۔غیر مقامی داستانوں میں الف لیلیٰ، داستان امیر حمزہ، یوسف زلیخا، پند نامہ وغیرہ پسندیدہ تھیں۔البتہ گیالم کیسر کی رزمیہ اور دیو مالائی داستان سب سے زیادہ مقبول تھی۔کیسر کی داستان چین، وسطِ ایشیا، سکم، بھوٹان، نیپال، بلتستان اور لداخ میں بڑے شوق سے سنی جاتی ہے۔چین میں Gesrology (علم کیسر) کے نام سے اس پر مطالعہ اور تحقیق کا کام ہو رہا ہے۔ بیجنگ میں داستانِ کیسر پر ایک بین الاقوامی سیمینار بھی ہوا تھا۔

لداخ کا گاؤں چیکتن زبانی لوک ادب کا خزینہ ہے۔یہاں کیسر کی داستان کو اسلامی ثقافت کے مطابق ترمیم کی گئی ہے۔کچھ نہ کچھ فرق ہر جگہ پایا جاتا ہے تاہم بنیادی کہانی اور مرکزی کردار ایک ہیں۔

کیسر کی داستان بڑی طویل ہے اور داستان گو کا طرزِ بیان بڑا دلنشین اور حافظہ بڑا تیز ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ماضی میں جب یاتری یا تاجر لیہہ سے تبت کی راج دھانی لہاسہ جاتے تھے تو داستان گورات کو بلاناغہ داستان سناتا تھا اور واپسی کے سفر میں بھی یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ لیہہ پہنچتے پہنچتے داستان ختم ہوتی تھی۔ ان دنوں لیہہ سے لہاسہ تین ماہ کا لمبا سفر تھا۔

لداخ میں کئی پہاڑیاں، چٹانیں، ٹیلے وغیرہ دیومالائی شخصیت کیسر اور اس کی بیوی سے منسوب ہیں۔ یہ کیسر کا محل، کیسر کا نقشِ قدم، کیسر کا پتھر جس پر وہ بیٹھتا تھا، کیسر کی بیوی کی تکلی، کیسر کے چولہے کی راکھ وغیرہ کے طور جانے جاتے ہیں۔

بلتستان میں ہرداس گاؤں کے نزدیک پھون کاٹو نام کی ایک جگہ کیسر کی جنم بھومی بتائی جاتی ہے۔

غرض دنیا کے ایک بڑے خطے پر اس دیومالائی داستان اور اساطیری کرداروں کی گہری چھاپ ہے۔

دوسری پرانی قدروں کی طرح داستان گوئی بھی اب ختم ہوتی جارہی ہے۔ محمد حسن حسرت اپنی کتاب، ''بلتستان۔ تہذیب وثقافت''، میں لکھتے ہیں۔ اب جدید زمانے میں مصروفیات میں اضافہ، ریڈیو، ٹیلی ویژن جیسے سمعی و بصری ذرائعِ ابلاغ کے عام ہونے اور حصولِ تعلیم کی طرف رجحان طبع کے زیادہ ہونے کی وجہ سے داستان گوئی کا رواج تقریباً ختم ہورہا ہے۔

تیوہار: لداخ اور بلتستان دونوں اپنے تیوہاروں کے لئے مشہور ہیں۔ موسمی تیوہار ساکا (آغاز موسم بہار میں ہل جتائی اور بیج بوائی کا تیوہار یارو پہلا موسمِ خزاں میں فصل کٹائی کا تیوہار) میفوق ستنمو (پھول میل مے پھنگ (آتش بازی) اور دوسرے تیوہار لداخ اور بلتستان دونوں خطوں میں منائے جاتے رہے ہیں۔ تاہم میں نے سید محمد عباس کاظمی کی

کتاب ''بلتی لوک گیت'' میں پڑھا کہ یہ موسمی تیوہار اب بلتستان میں نہیں منائے جاتے ہیں یا آہستہ آہستہ ختم ہوتے جارہے ہیں۔ 'بلتی لوک گیت' ۱۹۸۵ء میں چھپی تھی۔ البتہ محمد یوسف حسین آبادی اپنی تصنیف، بلتستان پر ایک نظر' (۱۹۸۴ء) میں رقم طراز ہیں کہ ؏پھنگ تیوہار ہر سال ۲۱ دسمبر کو منایا جاتا ہے۔ اس میلے میں رات کو مشعلیں نکالی جاتی ہیں۔ محمد حسن حسرت کے مطابق مسلسل تین جمعرات کی شام کو چراغاں کی شکل میں منایا جاتا ہے اور ہر گھر میں دعوتِ خاص و عام کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ البتہ بلتستان کے مختلف علاقوں اور وادیوں میں اس تہوار کے طریقے قدرے الگ ہیں۔

لداخ میں دسمبر میں سال نو (لوسر) کے تیوہار کے دوران کئی روز مے پھنگ یا مشعلوں کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ پہاڑوں اور مکانوں پر دیپ مالا ہوتی ہے۔ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ لوسر، بدھ مت کی آمد سے پہلے پورے خطے میں منایا جاتا تھا۔ مے پھنگ اسی کی یادگار ہے۔

محمد حسن حسرت اپنی تصنیف 'بلتستان ...... تہذیب و ثقافت (۱۹۹۵ء) میں رقم طراز ہیں: 'گزشتہ پندرہ بیس سالوں سے رسم 'مے پھنگ' کا زور ٹوٹ رہا ہے۔'
شاید اب دوسرے تیوہاروں کی طرح مے پھنگ کا تیوہار بھی بلتستان میں دم توڑ چکا ہے۔

بلتستان اور لداخ میں جنگ بندی لائن کے دونوں طرف درد قوم اپنا مخصوص تیوہار بونونو مناتی ہے۔ درد گاؤں داہ گرکون میں اس تیوہار کو شندوم، ہُنوکر گل میں تھوشل اور بلتستان کے گاؤں گنوخ میں اس کو موری پھن کہا جاتا ہے۔

لوک گیت: بلتی لوک گیت لداخ کی تاریخ اور تمدن پر معلومات کا ایک خزینہ ہیں۔ یہ لداخ اور بلتستان کے دیرینہ تعلقات کو اجاگر کرتے ہیں۔ کاظمی نے اپنی کتاب میں پچاس لوک گیت دیئے ہیں۔ جب سکردو کے نامور راجا علی میر شیر خان نے اپنی بیوی

کو جولداخ کے راجہ جمیا فنگ نمکیل کی بہن تھی، طلاق دی تو راجکماری نے ایک گیت میں اپنی دلی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ جس کا ایک بول یہ ہے:

تم نے شاہزادی کو سینکڑوں آدمیوں اور گھوڑوں کے ساتھ لایا

اس کو واپس بھیجتے وقت ایک بھی آدمی اور گھوڑا نہیں ہے

بلتستان کے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے ڈوگرہ جرنیل زور آور سنگھ نے لیہہ کے باغی گورنر مودوپ ستنزین کو ننگے پیر، ننگے سر زنجیر سے باندھ کر بلتستان لیا۔ سکردو اور شگر کے درمیان منگ منگ نام کے ایک مقام پر وہ زخمی اور تھکن سے چُور ہو کر، گر پڑا۔ اس حالتِ زار کو دیکھ کر سکردو کے ایک آدمی نے ایک گیت لکھا۔ جس کے چند بندیوں ہیں۔

منگ منگ کے صحرا میں موروپ ستنزین کا خوبصورت چہرہ جھلس رہا ہے۔

اے میرے بلند مرتبہ والا بادشاہ! آپ شاید موروپ ستنزین نہیں ہیں۔

بلتستان اور لداخ کی سرحد پر واقع ایک گاؤں میں چھرنگ زومیا نام کی ایک خوبصورت دوشیزہ کی سگائی شارا نام کے ایک لڑکے سے ہوئی تھی جو لداخ کے ایک گاؤں مُولبیک کا رہنے والا تھا۔ جب لڑکی کا منگیتر شادی پر نہیں پہنچا تو اس نے ایک دکھ بھرا گیت کہا ہے۔ جو بلتستان میں بڑا مقبول ہے۔

اسی طرح لداخ کے شاہی خاندان کی ایک راجکماری کا بیاہ چپلو بلتستان کے ایک شاہزادے سے ہوئی تھی۔ اپنے گھر اور عزیزوں سے بچھڑنے کی دلی کیفیت کو شہزادی نے ایک گیت میں یوں اجاگر کیا ہے۔

میرا جنم ہندر (لداخ کا ایک گاؤں) میں ہوا

لیکن چپلو پہنچی

میں نے چپلو میں بہت ڈھونڈا

لیکن اپنا بھائی اور کوئی عزیز نہیں ملا

.......☆.......
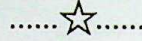
بلتی لوک ادب ایسے گیتوں سے بھرا ہے لداخ میں بلتی غزلیں بڑی مقبول ہیں۔ لداخی شعرا اسی طرز پر غزلیں کہتے ہیں۔ غالباً قوالی بھی بلتستان سے لداخ آئی تھی۔

علم وادب: بلتستان میں بہت سارے لوگ ادب سے ذوق رکھتے ہیں۔ شعرا اور قلم کار بھی بہت ہیں۔ اردو اور بلتی دونوں مقبول ہیں۔ سکردو میں دو فعال ادبی انجمنیں ہیں۔

نثری ادب بہت کم ہے۔ البتہ شاعری کا سرمایہ بہت بڑا ہے جس میں حمد، نعت، منقبت، مرثیہ، قصیدہ، غزل، نوحہ، قطعہ، مثنوی جیسی اصنافِ سخن شامل ہیں۔ کئی شعرا نے فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ حکایتوں کا بلتی میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔

محمد حسن حسرت نے اپنی کتاب 'تاریخ ادبیاتِ بلتستان' میں معروف بلتی شعراء اور مصنفین کا تذکرہ کیا ہے اور ذیلی عنوانات کے تحت بلتی زبان کے اکیس شعرا، سات مصنّفین، آٹھ اردو شعرا اور گیارہ ریڈیائی ادیب اور دیگر اہلِ قلم کی حیات اور تصنیفات پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔

اکثر قلمکاروں کا وہ تذکرہ نہیں کر پائے ہیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں۔

"موجودہ زمانے میں بلتستان میں شاعروں اور ادیبوں کی اتنی کثرت ہے کہ ان تمام اصحاب کے مختصر حالات لکھنا بھی طوالت کا باعث ہوگا۔ لہٰذا یہاں بعض اربابِ ادب کا تذکرہ کرتے ہیں۔"

۱۹۹۵ء میں اسلام آباد پاکستان میں منعقدہ بین الاقوامی سیمینار میں بلتی مصنّفین سیّد محمد عباس کاظمی، محمد یوسف حسین آبادی، محمد حسن حسرت اور فدا محمد ناشاد سے ہماری ملاقات ہوئی اور علم وادب تبادلۂ خیال ہوا۔ مذکورہ مصنّفین بلتی یا لداخی زبان کے اصلی Original بودھی رسم الخط کو بلتستان میں مروّج کرنا چاہتے تھے۔ کاظمی اور یوسف حسین آبادی نے بودھی رسم الخط سیکھ لیا تھا اور وہ واجبی بودھی لکھتے تھے۔ انہوں نے سکردو میں کئی

دکانوں کے سائین بورڈ بودھی میں بھی لکھوائے تھے۔ ان مصنّفین نے نوانگ چھرنگ شقپسو اور مجھے لداخ سے دو بودھی استادوں کو بلتستان میں بودھی رسم الخط اور لداخی زبان سکھانے کے لئے بھیجنے کا اہتمام کرنے کے لئے کہا جو ہند پاک کشیدہ تعلقات کے پیشِ نظر ممکن نہیں تھا۔ بعد میں ہم نے سنا کہ انھوں نے اسلام آباد میں چینی سفارت خانہ کی وساطت سے تبّت سے ایک بودھی دان استاد لایا ہے۔ جب تک عوامی اور حکومت کی سطح پر حمایت اور سرپرستی نہ ہو۔ بودھی لپی بلتستان میں پروان نہیں چڑھ سکتی۔ اس لپی کو ساتویں صدی میں ایک تبّتی عالم تصونمی سمبھوٹا نے وضع کیا تھا۔ تبّت کے بادشاہ رونگ ژن گیا لپو نے ان کو اس سلسلے میں ہندوستان بھیجا تھا۔ تصونمی سمبھوٹا نے یہ لپی سنسکرت رسم الخط سے اخذ کی اور تبّتی زبان کے مزاج اور صوتیات کے مطابق اس میں ترمیم کی اور حروفِ تہجی میں اضافہ کیا۔

بلتی اور کوہ پیمائی: جغرافیائی خصوصیات، ماحول اور پہاڑوں نے بلتیوں اور لداخیوں کو مضبوط، محنتی اور کوہ پیمائی میں ماہر بنادیا ہے۔ بہت سارے غیر ملکیوں نے لداخیوں اور بلتیوں کی ان خوبیوں کی تعریف کی ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے والے ایک لداخی نوعمر کوہ پیما صنم وانگیل نے راقم الحروف کو بتایا کہ جسمانی طور ہر مضبوط لداخی یہ کارنامہ سرانجام دے سکتا ہے۔ اس کا اطلاق بلتیوں پر بھی ہوتا ہے۔

Oscar Eckenstein (۱۸۹۶ء) بلتستان کے گاؤں اسکولے سے متعلق لکھتا ہے:

"یہ لوگ چٹان پر چڑھنے میں یکتا ہیں اور سوئزرلینڈ اور الپائن کے کوہ پیما رہبروں کو مات کرسکتے ہیں۔ یہاں کا سب سے اچھا آدمی کسی بھی قسم کی چٹان پر چڑھنے میں میری دانست میں بہترین کوہ پیما رہبر کو پچھاڑ سکتا ہے۔ چٹیے یا ہموار پتھروں پر چڑھنے میں اکثر مقامی آدمی سوئزرلینڈ کے بہترین کوہ پیما رہبر کو پیچھے چھوڑ دیں گے۔

اسوسکر نے ۱۸۹۲ء میں بلتستان کی سیاحت کی تھی۔

اطالوی محقق ڈاکٹر فلیپو ڈی فلیپی (۱۹۳۲ء) نے بلتیوں کی غیر معمولی طاقت اور قوتِ برداشت کی تعریف کی ہے۔

سون ہیڈین (۱۹۰۹ء)، ایریل آف ڈینمور (۱۸۹۳ء) فرانسس ینگ ہاسبنڈ (۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۶ء)، ارتھر نیوے (۱۹۱۳ء) اور بہت سارے محققوں نے انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران بلتیوں اور لداخیوں سے متعلق ایسے ہی تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے انہیں ملنسار، مرنجان مرنج، شریف، سیدھے سادے اور ہشاش بشاش رہنے والے بتایا ہے۔

زمانہ حال: پچھلی چھ دہائیوں کے دوران دریائے سندھ میں بہت پانی بہا ہے۔ اس دوران بلتستان اور لداخ میں دوررس تبدیلیاں آئی ہیں۔ اب دونوں خطوں کے لوگ خوشحال ہیں۔ خواندگی کی شرح بہت بڑھی ہے اور انہیں نئے دور کی بہت ساری سہولیات اور مراعات میّسر ہیں۔ لیہہ میں ۲۴ رمئی ۱۹۴۸ء کو ہوائی جہاز اترا۔ اس کے دس ماہ بعد مارچ ۱۹۴۹ء میں سکردو میں جہاز اترا۔

اگست ۱۹۶۲ء میں لیہہ کا سرینگر سے سڑک کا رابطہ ہوا اور لیہہ گاڑیاں پہنچیں۔ ۱۹۶۸ء میں سکردو میں گاڑیاں پہنچیں۔

ایک انگریز سیاح پیرسے گرویس (Pearce Gervis) ۱۹۵۴ء لداخ آیا۔ اس سے پہلے ۱۹۴۷ء میں اس نے بلتستان دیکھا تھا۔ دونوں خطوں کے لوگوں کی خوبیوں اور قناعت پسندی کی تعریفوں کا پل باندھتا ہوا وہ یہ سوال کرتا ہے۔

''یہ لوگ جب اپنے میں جاگرتی لائیں گے اور اس نیند سے جاگ جائیں گے جس پر وہ قانع ہیں، تو اس بنجر اور غریب زمین پر دولت کی بوچھاڑ ہوگی۔ مجھے حیرت ہوگی تب کیا وہ زیادہ خوش ہوں گے؟'

۱۹۵۲ء میں ایک اور غیر ملکی آئن سٹیفن نے شمالی علاقہ دیکھا۔ وہ اپنے سفرنامہ میں رقم طراز ہے:

'بلتستان کے اوپر پرواز کرتا ہوا پولینڈ کا ہوا باز میکسی مووِیکز Maksymicz جو حکومتِ پاکستان کا ملازم تھا، بولائی تہذیب ان لوگوں کو تباہ کر رہی ہے۔ شروع میں جب ہم آتے تھے تو یہ روپیہ کی اہمیت بہت کم جانتے تھے تو وہ سیدھے سادے اور اچھے تھے اب ان میں نئی سوچ آرہی ہے۔'

اس تاثر پر رائے مختلف ہوسکتی ہے۔

ہزاروں بلتی پاکستان، ایران اور مشرقِ وسطیٰ میں برسرِ روزگار ہیں جن سے بلتستان کو مادی طور بڑا فائدہ ملا ہے۔ پاکستان کے بڑے شہروں میں بلتیوں کی مسجدیں ہیں۔ کہیں کہیں دار العلوم ہیں، جہاں طلباء اپنے مسلک کے مطابق مذہبی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ لیکن بلتستان کو حکومتِ پاکستان نے برسوں تک آئینی اور سیاسی حقوق نہیں دیئے۔ اگرچہ ۱۹۶۱ء میں بنیادی جمہوری ادارے قائم ہوئے جن سے ترقیاتی کام ہوئے۔ دیہات سدھار کے نام پر دیہی علاقوں میں تعمیری اقدام لئے گئے۔ ۱۹۶۹ء میں شمالی علاقہ جات کی کونسل قائم ہوئی جس نے آگے جا کر اچھا ترقیاتی کام کیا۔ کونسل نے مرکزی حکومت اور عوام کے درمیان رابطے کا کردار ادا کیا ہے۔ لیکن بنیادی حقوق حاصل نہیں ہوئے۔

آئینی حیثیت حاصل نہ ہونے سے بلتستان کے لوگوں میں بڑی بے چینی پائی جاتی تھی۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں نمائندگی نہ ہونے کے باعث قومی انتخابات نہیں ہوئے۔

بلتی صحافی محمد قاسم نسیم نے اپنی کتاب 'بلتستان ...... تاریخ و سیاست، مطبوعہ (۱۹۹۴ء) میں حقائق کو اجاگر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

'بلتستان وگلگت کو ایجنسی قرار دے کر یہاں پولیٹیکل ایجنٹ کو اختیارات کلّی دے کر بھیجا گیا جو بلا شرکتِ غیرے علاقے پر حکمرانی کرنے لگا۔ پولیٹیکل ایجنٹ ایجنسی میں تمام تر اختیارات کا مالک ہوتا تھا۔

پولیٹیکل ایجنٹ اور اس کا معاون اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ دیوانی، فوجداری مقدّمات، انتظامیہ، محکمۂ مال اور سارا کام دیکھتے تھے۔

پاکستان کی موجودہ حکومت نے گلگت اور بلتستان کو اب ایک الگ صوبہ کا درجہ دیا ہے اور قانون سازیہ مجلس قائم کی ہے جو دونوں خطوں کے نمائندوں کا انتخاب کرتی ہے۔ اکثریتی جماعت کے نمائندے وزیرِ اعلیٰ کا انتخاب کرتے ہیں۔ مرکز کی نمائندگی گورنر کرتا ہے۔

قومی اسمبلی میں بھی گلگت اور بلتستان کو نمائندگی ملی ہے۔

اس طرح گلگت اور بلتستان کے عوام کا دیرینہ مطالبہ پورا ہوا ہے۔

اپنے حقوق کے حصول کے لئے کراچی، لاہور اور راولپنڈی میں جو بلتی طلبا اور افراد مقیم تھے انہوں نے 'لداخ' بلتستان متحدہ محاذ، کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ ایک ماہنامہ 'بادشمال' کے نام سے جاری کیا، جس کے ذریعے ایف، سی، آر کو ختم کرنے کے لئے آواز بلند کی۔ بلتستان میں علماء کا کردار بڑا موٗثر رہا ہے۔ بلتستان میں انجمنِ تحفظِ حقوقِ بلتستان، کے نام سے ایک تنظیم تھی۔ لیکن ایف، سی، آر کی وجہ سے یہ فعال نہیں تھی۔

سقوطِ پاکستان کے بعد جب ذوالفقار علی بھٹو اقتداء میں آئے تو انہوں نے ایف۔سی آر کو اٹھالیا۔ ساتھ ہی گلگت و بلتستان کی ایجنسی حیثیت کو ختم کرکے ان علاقوں کو ضلع کا درجہ دے دیا۔

۱۹۷۲ء میں نمبرداری اور جاگیرداری نظام کا خاتمہ کیا۔ اس کے ایک سال بعد ایف۔سی۔آر کا خاتمہ عمل میں آیا۔ اُسی سال جوڈیشل عدالت قائم ہوئی۔

ان کے بعد کچھ اور مثبت اقدامات لئے گئے۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں مرکزی مجلسِ شوریٰ میں نمائندگی دی گئی۔

۱۹۸۷ء میں وفاقی مشیر کی نامزدگی ہوئی۔ اسی سال سکردو میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن کورٹ کا قیام عمل میں آیا۔

۱۹۹۱ء میں ضلع کونسل وشمالی علاقوں کی کونسل میں خواتین کو نمائندگی دی گئی۔

اب شمالی علاقہ کو ریاست کا درجہ دیا گیا ہے اور اس کے اپنے وزیرِ اعلیٰ اور گورنر ہیں۔ اس طرح بلتستان کے لوگوں کی ایک بڑی مانگ پوری ہوئی ہے۔

۱۹۴۷ء تک لداخ اور بلتستان کے درمیان سارا سال لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ سکردو اور لیہہ میں اکادُکا بلتی اور لداخی ملازم نظر آتے تھے۔ موسم سرما میں کسی کو لداخ سے باہر جانا ہوتا وہ بلتستان کی راہ لیتا تھا جہاں سے گلگت جاتا تھا۔ گلگت سے متحدہ پنجاب کے شہر راولپنڈی پہنچتا تھا۔ ان دنوں ہر ایک کی زبان پر پنڈی ہوتی تھی۔ آج بیرونِ لداخ جانے کے لئے ہوائی جہاز واحد ذریعہ ہے۔

بلتستان اور لداخ کو علاحدہ ہوئے اور باہمی رابطہ ٹوٹے ۶۵ سال ہوئے ہیں اور دو دیرینہ ہمسایوں کے علاقے میں آنا آسان نہیں۔ ایک دوسرے کے لئے اپنا دیارِ ممنوع بنے ہیں۔ گزشتہ چھ دہائیوں کے درمیان بہت کم لوگ آجا سکے ہیں۔

تقسیمِ ملک کے بعد میرے بڑے بھائی سکردو میں پھنس گئے تھے۔ وہ لداخ وزیر وزارت میں ملازم تھے اور چھ ماہ سکردو اور چھ ماہ لیہہ میں گزارتے تھے۔ نصف صدی کے دوران ہماری دو بار ملاقات ہوئی۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد ان کو لیہہ آنے کا ویزا ملا اور وہ لیہہ میں ایک ماہ ٹھہرے۔ انہوں نے اپنے ماں اور باپ کی قبروں پر جا کر پُر نم آنکھوں سے فاتحہ پڑھی کہ ان کی وفات پر وہ لیہہ نہیں آپائے تھے۔ ہماری دوسری ملاقات ۱۹۹۵ء میں اسلام آباد میں ہوئی۔ مجھے سکردو جانے کا ویزا نہیں ملا۔ وہ ملاقات کے لئے

اسلام آباد آئے اور ایک ہفتہ رہے۔انہیں ایک دفعہ لداخ آنے کی خواہش تھی لیکن اپنی اس خواہش کو دل میں لے کر چند سال بعد وہ اس دنیا سے چلے گئے۔

کرگل اور لیہہ ضلعوں میں بہت سارے لوگوں کے اعزا و اقارب بلتستان میں ہیں۔ماں باپ اپنی اولاد کو، بھائی بہن کو اور دوست، دوست کو دیکھے اور ملے بغیر اس دنیا سے چلے گئے ہیں۔

بلتستان سے اکثر لوگ لداخ آنا چاہتے ہیں۔خاص کر ان عمر رسیدہ لوگوں کو لداخ دیکھنے کی تمنّا ہے، جو تقسیم سے پہلے لداخ آئے تھے۔یا جنہیں دونوں خطوں کے ماضی کی تاریخ کا علم ہے۔یہی صورتِ حال کم و بیش لداخ میں بھی ہے۔

میری دانست میں ایسے بھی غیر ملکی ہیں جو کبھی لداخ یا بلتستان آئے تھے جنہوں نے یا دونوں مقامات دیکھے تھے۔انہیں ایک قسم کا Nostalgia ہے اور اپنے وطن کی طرح یہ خطے یاد آتے ہیں اور ایک دفعہ دوبارہ یہاں کے لوگوں اور تبدیلیوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔

۲۰۰۵ء میں دو بلتی ادیب سیّد بہادر علی سالکؔ اور غلام حسن حسنیؔ انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فار لداخ سٹیڈیز (IALS) کے سمینار میں شرکت کے لئے لداخ آئے۔لیہہ اور کرگل میں ان کا گرم جوشی سے ستقبال کیا گیا۔کرگل میں بہت سے لوگ جذباتی ہو کر رو پڑے۔لیہہ میں انجمنِ معین الاسلام اور انجمنِ امامیہ سمیت مختلف تنظیموں نے ان کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔خود مختار لداخ پہاڑی کونسل نے عصرانہ دیا۔IALS اور ٹیا قشی، ترتوک، بیوغداتگ اور چلونکھا کے نوجوانوں نے عشائیے کا اہتمام کیا۔IALS کی طرف سے ان کو لداخی لباس پہنایا گیا۔نیز ان کے اعزاز میں کرگل اور لیہہ میں مشاعرے اور لیہہ میں ثقافتی شو پیش کئے گئے۔دونوں مقامات پر انہیں تحفے تحائف پیش کئے گئے۔

غلام حسن حسنیؔ نے واپس سکردو جا کر "سکردو سے کرگل تک" کے نام سے اپنا سفر نامہ شائع کیا۔جس کے ہر صفحہ سے ایک دوسرے کے تئیں محبت، لگاؤ اور دیرینہ دوستی کے

جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

لداخ میں ان کے قیام کے دوران یہاں ہر جگہ "کرگل، سکردو سڑک کھول دی جائے" کی مانگ کی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی۔

اس قربت کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ بہت سارے بلتی اور لداخی اپنی جڑوں (Roots) کی تلاش میں ہیں، جن سے وہ صدیوں تک ایک دوسرے سے جُڑے اور بندھے رہے ہیں۔

.................☆☆☆.................

غلام نبی آتش

کشمیری لوک کہانیاں اور تواریخ

قوموں کے اجتماعی خیالات، توہمات، عقائد، خواہشات، سوچ، نفسیاتی، سماجی، سیاسی اور مذہبی معاملات کے عکاس لوک ادب کی منتقلی سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل کے لئے فی زمانہ جاری رہی ہے۔ کشمیر اور کشمیری زبان کے وسیع اور گوناگوں لوک ادب کا بہت بڑا حصہ لوک کہانیوں پر مشتمل ہے۔ لوک ادب کی طرح لوک کہانیاں بھی عوام کے اجتماعی ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں۔ کشمیر، جو لوک کہانیوں کی بہتات اور گوناگونیت کے لئے بہت مشہور ہے، میں لوک کہانیاں کہنے اور سُننے کا رواج مدّتِ مدید سے جاری ہے۔ مشہور ہے کہ انفرادی طور پر گناڈے نے، جس کا زمانہ چھٹی صدی عیسوی سے پہلے بتایا جاتا ہے، پشاچی زبان میں کہانیوں کی "برہت کتھا" نامی کتاب لکھی تھی، جس کو بقولِ شیشی شیکھر توشخانی...... "اس لئے جلانا پڑا کہ پشاچی میں لکھنے کی وجہ سے پنڈتوں نے اُس کی نکتہ چینی کی تھی"[۱]۔ گناڈے کی روایت کو آگے لے جانے والے کئی اور مصنّف تھے، جن میں سوم دیو، جو گیارہویں صدی عیسوی میں بقیدِ حیات تھا، کو "کتھا سرت ساگر" میں شامل کہانیاں

لکھنے کی وجہ سے کافی شہرت ملی۔[۲]

انسان ابتدائے آفرینش سے اُن فطری طاقتوں اور مظاہر کو اپنے قابو میں کرنے کے لئے کوشاں رہا ہے، جو اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ وہ ہمیشہ فتح مندی اور خواہشات کی تکمیل کے خواب دیکھتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے خیالوں کی دنیا میں مافوق الفطرت، اساطیری اور دیو مالائی کردار اور کہانیاں تخلیق کرنے کا عمل جاری رکھا۔ عملی دنیا میں ناقابلِ فہم اور ناممکن ہونے کے باوجود ایسی کہانیوں اور کرداروں کو مقبولیت ملتی رہی۔ ایسی کہانیوں میں پتھر بولتے ہیں، پہاڑ ہلتے ہیں، درخت چلتے ہیں، جانداروں کی روحیں اجسام بدلتی ہیں، آسمان سے پتھر برستے ہیں، حیوانات چمتکار کرتے ہیں، پرندے انسانوں کی طرح بولتے ہیں، دیو کا خاتمہ کرنے کے لئے طوطے کی گردن اور پری کو مارنے کے لئے مینا (ہاُر) کی گردن مروڑ لی جاتی ہے، جنوں کو بوتلوں میں بند کیا جاتا ہے، اُڑنے کے لئے وُڈھہِ پڑنگ (اُڑن کھٹولا) اور سمندروں کو پار کرنے کے لئے جادوئی قالین یا کراماتی کھڑاوٗں کام میں لائے جاتے ہیں، ڈائن کو غلام بنانے کے لئے اُس کی کنگھی چُرائی جاتی ہے اور سودِ بڑور اور بودِ برور بھولے بھٹکوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس نوع کی کئی محیر العقول کہانیاں ستی سر جھیل کو خشک کر کے کشمیر کو انسانوں کی بود و باش کے لائق بنوائے جانے کے سلسلے میں کشپ ریشی، بودھ ارہٹھ اور حضرت سلیمانؑ سے منسوب بتائی جاتی ہیں بلکہ مشہور مورخ پنڈت کلہن کی تاریخ راج ترنگنی کا معتد بہ حصہ ایسی ہی دیو مالائی اور اساطیری کہانیوں پر مشتمل ہے۔[۳]

اساطیری، دیو مالائی اور مافوق الفطرت واقعات اور کہانیوں کے علاوہ کشمیری زبان میں دنیا کی کئی اور زبانوں کی طرح ہر طبقے اور پیشے سے تعلق رکھنے والے، اچھے بُرے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، ہنستے کھیلتے، روتے بلکتے، دوڑتے بھاگتے اور لڑتے جھگڑتے انسانوں، حیوانوں اور پرندوں وغیرہ سے متعلق بے شمار کہانیاں موجود ہیں، جن میں سے کئی ایک کچھ نہ کچھ بالا فطری عنصر ضرور رکھتے ہیں۔ ان کہانیوں میں بڑے بڑے

کارنامے انجام دینے والے، دم دبا کر بھاگنے والے، زیرک، عیّار، ٹھگ، ریاکار، بے وقوف، حوصلہ مند، سادہ لوح، ظریف، شریف اور رزیل کردار انسانی سماج اور انسانی فطرت وعقائد کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

لوک ادب اگر چہ تواریخ کا مکمل متبادل نہیں ہوسکتا، تاہم اس میں فی زمانہ سماجی حالات، انسانی نفسیات، رسوم ورواج، عقائد وخواہشات اور تجربات رہتے ہیں۔ کشمیری زبان کی بہت سی لوک کہانیاں کشمیر کی تواریخ کو ضبطِ تحریر میں لائے جانے سے قبل بھی گردش میں تھیں اور اجتماعی ذہن ان کو ہر زمانے میں محفوظ کرتا رہتا تھا، جو اصل میں تحریری تواریخ کی عدم موجودگی میں سماجی تواریخ کا کام کرتی رہتی تھیں۔ کہانیوں اور واقعات کے چہروں سے کوئی لائق مورّخ اگر اُن کا دیو مالائی اور اساطیری لبادہ اُتارنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو تواریخ کے کچھ گم شُدہ واقعات ہاتھ آنے لگتے ہیں۔ تواریخِ کشمیر کے طالب علموں کو معلوم ہے کہ پنڈت کلہن راج ترنگنی کو سنسکرت میں منظوم کرنے کے دوران باون راجاؤں کے حالات معلوم نہ کر پائے تھے۔ اس لئے اُن کا تذکرہ بقولِ کلہن، راج ترنگنی میں نہیں ہوسکا۔ حالانکہ راج ترنگنی سے بہت پہلے تحریر شُدہ ''رتنا کر پوران'' بھی کلہن کو دستیاب نہیں ہوسکا تھا[۴]۔ پیر غلام حسن شاہ کھویہامی نے فارسی زبان میں ''تاریخِ حسن'' کا دوسرا حصہ ۱۸۸۵ء میں مکمل کیا۔ اُس نے لکھا ہے کہ جب سلطان زین العابدین بڈشاہ (۸۲۷ تا ۸۷۹ھ) کے درباری مورّخ ملا احمد نے حکمِ شاہی کی تعمیل کے طور پر ''وقایع کشمیر'' نامی تواریخ فارسی میں لکھنا شروع کی تو چند سالوں کی تحقیق وتلاش کے بعد پراجیہ پنڈت کی مدد سے اس کو پنڈت رتنا کر کے ''رتنا کر پوران'' کے چند جُز دستیاب ہوگئے۔ اس طرح مُلا احمد نے رتنا کر پوران سے استفادہ کر کے باون گم شُدہ راجاؤں میں سے پینتیس بادشاہوں کا حال ''وقایعِ کشمیر'' میں درج کرلیا۔ خوش بختی سے تاریخِ حسن کی تالیف وترتیب کے وقت ''وقایعِ کشمیر'' کا ایک نُسخہ، جو اُسے راولپنڈی میں دستیاب ہو اتھا، مورّخ حسن کے زیرِ نظر رہا ہے۔ اس طرح پینتیس گم شُدہ راجاؤں کا حال تاریخِ حسن

میں شامل ہو گیا۔[5] ان راجاؤں میں سے چند ایسے بھی ہیں جن کے متعلق کہانیاں عوام الناس کے ذہنوں میں اس زمانے سے پہلے بھی محفوظ تھیں، جب مورّخ اُن کے حالات کی بازیافت کے لئے نیم تواریخی، تواریخی اور تحقیقی کتب کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ عوام صدیوں سے اپنے گھروں میں بیٹھ کر جاڑوں کی طویل سرد راتوں کے دوران اُن ہی راجاؤں سے متعلق کہانیاں سُن کر اور سُنا کر محظوظ ہوتے رہے تھے۔

کشمیری زبان میں "ہیمال ناگر رائے" کی مشہور عشقیہ داستان صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ ناگر رائے یا ناگ ارجن ایک ناگ شہزادہ تھا۔ کچھ محققین کے اس دعوے کے باوجود کہ...... "ناگ کبھی کشمیر نہیں آئے"[6] کشمیر میں ناگ اسطوریات کا آج تک زبردست چلن موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ناگ کشمیر کے قدیم ترین باشندے تھے اور راجا نیل اُن کا ایک نہایت پُرشکوہ اور طاقتور راجا گزرا ہے۔ "ہی مال" تاریخ حسن کے مطابق راجا بلدیو (۳۰۷ ق،م) کی حسین و جمیل بیٹی تھی، جس پر بقولِ داستان "ناگر رائے" یا ناگ ارجن عاشق ہو گیا تھا۔ راجا بلدیو، بلدیو پوری، کا راجا تھا، جس کو اب بلہ پور کہتے ہیں اور شوپیاں قصبے کے قریب واقع ہے۔ یہ راجا مورّخ حسن کے ذریعے بازیافت شُدہ پینتیس راجاؤں میں سے ایک ہے۔

مورّخ حسن نے سرسری تذکرے پر اکتفا کیا ہے لیکن عوام نے تمام تر جزیات سمیت اس اسطوری مگر المیہ رومان کو لوک ادب کا مستقل حصہ بنا دیا ہے، جس کے ٹوپو گرافیکل "Topographical" نشانات آج بھی ملتے ہیں۔ مثلاً کہانی میں یارِون، رنبی آراہ، بوٹہ وبن، سپرسومن جگہوں کے نام آئے ہیں اور یہ جگہیں آج بھی موجود ہیں۔ بلہ پورہ میں دریاے رنبی آرہ کے کنارے اگر چشمۂ ہی مال آج تک بھی موجود ہے اور اُس چشمے میں پتھر کا وہ ہودج بھی، جس میں سے گزر کر ناگ ارجن نے پاتال[7] کی راہ لی تھی۔ تو شوپیاں میں ناگر رائے (ناگ ارجن) کا چشمہ بھی ہے، جہاں ناگر رائے سدا رام کے بستے میں داخل ہو گیا تھا۔ دُنیا کی دیگر زبانوں میں بھی اس نوع کی کہانیاں موجود

ہیں۸ لیکن ہمارے یہاں اس کی مقبولیت اور متذکرہ ٹوپوگرافیکل نشانات نے اس کہانی کو کشمیری الاصل بنادیا ہے۔ کچھ محققین کے خیال میں یہ کہانی ناگوں اور آریاؤں کے ٹکراو کی ایک مثال ہے۔ بقولِ محمد یوسف ٹینگ۔ "یہ بات آشکارہ ہوتی جارہی ہے کہ ناگ کوئی سانپ عفریت وغیرہ نہ تھے بلکہ وہ کشمیر کے اصلی باشندے تھے۔ اُن کی انسان سے سانپ بن جانے کی کہانی کا رشتہ شمشیر وسناں کی بازی ہار جانے کے ساتھ جُڑ جاتا ہے۔ آریاؤں نے حملہ آوروں کے روپ میں ناگاؤں کو تخت وتاراج کردیا اور اُن کی صحیح عمرانی، نسلی اور تہذیبی تشکیل کو مسخ کردیا۔۹

تواریخی کُتب کی عدم موجودگی کے بہت پہلے زمانے سے یہ کہانی نہ صرف نسل در نسل عوام کے ذہنوں میں محفوظ رہی، شعراء نے اس کو کئی منظوم روپ دیئے۱۰ اور شعری و تخلیقی معنوں کے لئے استعمال کیا بلکہ مجموعی طور پر کشمیری زبان پر بھی اس کے اثرات مرتّب ہوتے رہے، حالانکہ اس کے تعلق سے کئی محاورے، الفاظ اور تلمیحات آج بھی ہمارے روزمرّہ میں مستعمل ہیں۔

اسی طرح ہمارے داستان سراؤں کے پاس آج بھی راجا سچی نر کی ایک ناگ شہزادی چندرلیکھا کے ساتھ زبردستی کرنے کی پاداشت میں شہر نرپور کی تباہی کی کہانی ملتی ہے۔۱۱ کلہن نے یہ کہانی تفصیل سے لکھی ہے۔ لیکن کشمیری داستان گو، کلہن اور اُس کی راج ترنگنی سے بے خبر اس کہانی کو آج تک سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ اس کہانی میں بھی ناگاؤں اور آریاؤں کی رسہ کشی عیاں ہے۔ حتی کہ راجا سچی نر اور اُس کے دارالخلافہ نرپور کو ناگوں نے نیست ونابود کردیا، شہر پر پتھر برسائے۔ چندرلیکھا کے باپ سُشرُوم اور سُشرُوم ناگ کی بہن آرمینہ نے آگ بگولہ ہوکر شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ راج ترنگنی کے شارح اس شہر کی نشاندہی بجبہاڑہ کے قریب کریوۂ چکردر (ژکدر) کے طور پر کرتے ہیں۔ حالانکہ لوک روایت ہے کہ ناگ زادی کا باپ سُشرُوم اور اُس کا خاوند و شینہ پنڈت امرناتھ یاترا کے پراچین کال کے پہلے پڑاؤ ژھجی وارہ کے راستے امرناتھ کی

طرف چلے گئے اور امرناتھ جاتے ہوئے راستے میں دو چشمے سُسر اور داماد سے منسوب ہیں۔ایک کو ششرم ناگ اور دوسرے کو جاماتر ناگ کہا جاتا ہے۔ ششروم/سُسروم کے معنی ہیں سُسر اور جاماتر سے مراد ہے داماد۔ کشمیری میں اُن کو ہیرٚ سُنٛد ناگ اور زامٹرٛی ناگ کہا جاتا ہے۔

راجا بومبوٗر جو بقول مورّخ حسن ۱۵۲۲ء کل جگ میں تخت نشین ہوا تھا اور بہت عادل تھا، اپنی چچیری بہن لولری کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اُن کے عشق کی کہانی کے چرچے آج بھی ہماری لوک شاعری اور تخلیقی شاعری میں موجود ہیں۔اس عادل بادشاہ کو عشق نے نِکما کر دیا، تاج و تخت چھوڑ کر پہاڑوں میں دیوانہ وار گھومنے لگا۔ حتیٰ کہ ایک لوک روایت کے مطابق کوہِ پیر پنچال کی بلندیوں پر بانہال علاقے میں ایک ویران و پُراسرار جگہ آج بھی راجا بومبور سے منسوب ہے، جس کو مقامی لوگ "بومبرن باغ" (یعنی بومبور کا باغ) کہتے ہیں۔اس کہانی کے حوالے سے آج تک کشمیری زبان میں کئی محاورے اور الفاظ زبان زدِ خلائق ہیں۔ دِلچسپ بات یہ ہے کہ راجا بومبور بھی کلہن کے گم شدہ بادشاہوں میں سے ایک ہے، جو مورّخ حسن نے بازیافت کیا۔لیکن عام لوگ تواریخ کی بھول بھلیوں اور گورکھ دھندوں سے ہمیشہ دور رہ کر لوک ادب سے محظوظ ہوتے رہے ہیں، اس طرح واقعات بھی ذہنوں میں محفوظ کرتے رہے۔

ہمارے پاس کسی راجا مُکند کی ایک اور کہانی ہے۔اس راجا کا نام کسی مورّخ نے نہیں لیا ہے مگر لوک روایت کے مطابق یہ ایک منصف و عادل راجا تھا۔اُس کے متعلق مشہور ہے کہ ایک بار وہ کسی پاک دامن عورت کے ساتھ دست درازی کر کے گُناہ کا مرتکب ہو گیا۔عورت پاک دامن اور خدا دوست تھی، وہ راجا کو شراپ دے گئی۔راجا کے کان اتنے بڑھ گئے گویا بھینس کے کان ہوں۔ داستان گو کے مطابق یہ واقعہ "کوٹھی یارٛ" نامی جنگل میں پیش آیا، یہ جنگل علاقہ کوٹھہار میں موجود ہے۔یہاں آج تک پانی کا ایک چشمہ اہل ہنود کی نظروں میں خاصا پوِتر ہے۔راجا دن کو باہر نہیں نکلتا تھا ایک بار شام کے

وقت حیران و پریشان ہو کر لوگوں کی نظروں سے اپنے کانوں کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔
بچے کھیل کھیل میں یہ گیت گا رہے تھے۔

ماُکن رازس مو نشے کن ییلہ سہ ولتے کوٹھی یاُرون
پاُپی پانس زلہِ ہن ہن، ادِتس ژلہِ نے ماُنشے کن

ترجمہ:۔ "راجا مکُند کے کان بھینس کے کانوں جتنے لمبے ہوگئے ہیں، جب وہ کوٹھی یاُر جنگل کے چشمے میں اپنا بدن کھرچ کر گناہ دھوڈالے گا، تب اس کے بھینس جیسے کان غائب ہو جائیں گے۔"

لوک روایت کے مطابق راجا مکند نے چشمے میں اشنان کیا، گناہوں سے خلاصی پاکر اُس کے کان پہلے جیسے ہو گئے۔

رجا سہدیو ۱۳۶۲ بکرمی میں کشمیر کا راجا بنا تھا۔ اُس کے دورِ اقتدار میں (۱۳۸۰ بکرمی) چنگیز خان کے بیٹے ہلاکو خان کے ایک دُور کے رشتہ دار زوالقدر خان، جس کو ذلچو بھی کہا جاتا ہے، ستر ہزار آتش بار سپاہیوں کی جمعیت لے کر کشمیر پر حملہ کر کے اس ملک کو تخت و تاراج کر دیا۔ سہدیو اور اُس کی فوج بُری طرح پسپا ہو گئی۔ زوالقدر خان کے سپاہی آٹھ مہینوں تک آتشزنی اور قتل و غارت میں مصروف رہ کر پت جھڑ کا موسم شروع ہوتے ہی مال و دولت اور قیدی لے کر علاقۂ دوسر کے راستے واپس جانے لگے۔ پہاڑ پر ان سب کو برفانی طوفان نے گھیر لیا اور نابود کر دیا۔ کشمیر میں بچے کھچے لوگ غاروں میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ بعد میں صرف گیارہ کنبے بچ گئے تھے، جنہوں نے سرینگر میں نئے سرے سے بود و باش اختیار کیا۔ مورّخوں نے اس حملے کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے لیکن عام لوگ کشمیری مورّخوں کے انتظار میں نہیں رہے۔ انہوں نے اس تواریخی واقعے کو لوک کہانی کا روپ دے کر ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کیا۔ اگرچہ تفصیلات کے ساتھ یہ واقعہ "ظالم خان" ۱۲ نام کی کشمیری کہانی میں آج بھی موجود ہے لیکن کہانی کو اسطوری رنگ و روپ دیا گیا ہے۔ لوک کہانی میں کوہِ قاف سے آئے

ہوئے ظالم خان کے حملے کو کشمیریوں سے سرزد ہوئے پاپوں کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔ حالانکہ کچھ پاک دامن عورتوں نے ظالم خان کو شراپ دیا۔ ان کی بددعا کے نتیجے میں ظالم خان فوج اور قیدیوں سمیت فنا ہو گیا۔

کشمیریوں کے قبولِ اسلام کے عمل سے کشمیری لوک ادب میں عرب و عجم کے اساطیری واقعات اور کردار شامل ہو گئے۔ کتبِ تواریخ سے قطعِ نظر عوام کے اجتماعی حافظے میں سلطانوں، چکوں، مغلوں، پٹھانوں، سکھوں اور ڈوگروں کے ادوار کے بے شمار حوادث، واقعات اور معاملات سے متعلق کہانیاں محفوظ رہی ہیں۔ حضراتِ سادات، ریشیوں اور دیگر صوفی بزرگوں سے متعلق بے شمار واقعات زبان زدِ خلائق ہیں۔ کشمیر کی مشہور شو یوگنی لل دید (للیشوری) اور حضرت علمدارِ کشمیر شیخ نور الدین ریشیؒ سے متعلق عقیدتی قصص کی بڑی تعداد ہمارے لوک ادب کا حصہ ہے۔ اُن کے حالات، واقعات اور کرامات مدتِ مدید تک لوگوں نے سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچائے ہیں، حالانکہ مورّخوں نے اپنی کتابوں میں اُن کا ذکر گئی صدیاں گزرنے کے بعد کیا۔[۱۳]

ہمارے یہاں کئی تواریخی شخصیات کے اردگرد اسطوریات کا لبادہ پہنایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر راجا اونتی ورمن کے زمانے کے مشہور انجینئر حکیم سُیا کے ساتھ بالا فطری واقعات باندھے گئے ہیں۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ چمتکاری تھا اور کسی چمارن نے اُسے کہیں پالیا تھا۔ لیکن بالا فطری لبادے کے نیچے وہ ایک ذہین کشمیری تھا جس نے اپنی ذہانت اور حکمتِ عملی سے خطرناک سیلابوں کو روکنے یا اُن کی شدّت کم کرنے کا اہم کام کیا تھا۔ اسی طرح کشمیر کے آخری خود مختار بادشاہ یوسف شاہ چک کی ملکہ حبہ خاتون بھی لوک ادب میں نہ صرف اپنی ذہانت اور موسیقی کی مہارت کی وجہ سے جگہ پا گئی ہے بلکہ اُس کی زندگی کے بارے میں بھی ایک لوک کہانی مشہور ہے۔[۱۴]

تاریخ کا کون طالب علم نہیں جانتا ہے کہ بادشاہ نور الدین جہانگیر کشمیر جنتِ نظیر کے ہوش رُبا مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے ۱۶۲۷ء میں آخری بار یہاں آیا تھا۔

واپسی پر اُس کی طبیعت خراب ہوگئی اور راجوری پہنچ کر چنکس کے مقام پر جان جانِ آفرین کے سپرد کردی۔ یہ تواریخی واقعہ ہے لیکن اُس کی موت کے بارے میں اُن پہاڑی علاقوں میں آج بھی کئی ایک لوک کہانیاں گردش میں ہیں۔ مغل گورنر علی مردان خان کے خزانے کے متعلق اور لعل غلام نامی جگہ پر راستہ تعمیر کرنے کے بارے میں بھی محیر العقول کہانیاں مشہور ہیں حالانکہ گورنر موصوف نہایت ذہین اور تعمیرات کھڑا کرنے کی خاصی صلاحیت رکھنے والے تھے۔ لعل غلام والی جگہ مغل روڈ میں آتی ہے۔

لوک ادب اور لوک کہانیاں اگرچہ پوری طرح تواریخ کا متبادل نہیں ہیں، تاہم موجودہ زمانے میں کئی مورخین اور محققین کے مطابق اس کو سماجی تواریخ کے حقائق جاننے اور اس کو ترتیب دینے کے لئے Source Material کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ فوک لور کی بنیاد اور شہادت پر اگرچہ سیاسی تواریخ مکمل طور پر تیار نہیں کی جاسکتی ہے پھر بھی اساطیر اور روایات تواریخ کے ٹوٹے تسلسل کو بحال کرنے میں مدد و معاون ہیں۔ [۱۵]

کشمیر اور کشمیری زبان میں موجود لوک ادب دیکھ کر یورپی فاضلوں نے اس کی بہتات اور گونا گونیت کا اعتراف کیا ہے۔ جے ہنٹن نولز نے ۱۸۸۷ء میں چونسٹھ کشمیری لوک کہانیوں کا ترجمہ Folk Tales of Kashmir کے عنوان سے ایک مجموعہ میں شائع کیا، اس کے دیباچے میں وہ یہ بڑی بات کہہ گئے ہیں:

Kashmir as a field of folklore literature is perhaps not surpassed in fertility by any other county in the world."[16]

کتابیات:

۱۔ کاشُر لُکہٕ کتھہٕ ...... شیٚے جلد...... کلچرل اکادمی
(کشمیری لوک کہانیاں: چھ جلدیں۔ مطبوعہ کلچرل اکادمی)

۲۔ راج ترنگنی (اردو ترجمہ) اصل: سنسکرت۔ مورخ: پنڈت کلہن۔ ترجمہ کار: اچھر چند، پبلشر: لائٹ اینڈ لائف پبلشرز، پہاڑ گنج نئی دلی۔ ۱۹۷۹ء

۳۔ شیرازہ (اردو) فائل، کلچرل اکادمی

انگریزی

1. M.H.Zafar , Gulshan Majeed ,Approaches to Kashmir Studies, Institute of Kashmir Studies University of Kashmir

2. Farooq Fayaz ,Kashmir Folklore, A study in Historical Prespective . Gulshan Books -2008

فارسی

۱۔ تاریخ حسن۔ حصہ اوّل ودوم۔ پیر غلام حسن شاہ کھویہامی

پبلشر: ریسرچ اینڈ پبلیکیشن ڈیپارٹمنٹ، حکومت جموں وکشمیر۔ ۱۹۵۴ء

کشمیری

۱۔ شش رنگ۔ محمد یوسف ٹینگ۔ ۲۰۰۴ء

۲۔ کاشُر کتاب۔ محمد یوسف ٹینگ۔ ۲۰۰۸ء

۳۔ کتھا سرت ساگر۔ (کشمیری ترجمہ)۔ مترجم: امر مالموہی۔ کلچرل اکادمی: ۱۹۹۶ء

حوالہ جات اور فُٹ نوٹ

۱: مقالہ: ایک ساگر کہانیوں کا۔ مقالہ نگار: شیشی شیکھر توشخانی۔ مطبوعہ شیرازہ (اردو) جلد ۲، شمارہ ۴ص : ۸۲۔ ستمبر ۱۹۶۳ء

۲: سوم دیو نے کتھا سرت ساگر راجہ اننت کی بیوی سوریہ متی کو دل بہلانے کے لئے لکھی تھی اور اُس نے کتھا سرت ساگر کے لئے بنیادی مواد برہت کتھا کے بچے کھچے حصے سے حاصل کیا ہے۔ (کتھا سرت ساگر، کشمیری ترجمہ: امر مالموہی۔

ص:۵)

۳: ہندو دیو مالا کے مطابق ستی سر جھیل کو کشپ ریشی کی نگرانی میں دیوتاؤں نے خشک کر کے اور اُس میں موجود راکھشس جلدا دبھو کو مارنے کے بعد قابلِ بود و باش بنا دیا اسی لئے اس سرزمین کا نام پہلے کشپ مر اور بعد میں کشمیر پڑ گیا۔ بودھ دیو مالا کے مطابق مہاتما گوتم بدھ نے اپنے ایک ارہت کے ذریعے ستی سر جھیل میں موجود دیو کو مروا ڈالا اور پانی نکال دیا۔ اس طرح کشمیر کو قابلِ بود و باش بنا دیا۔ لیکن کشمیر کا ایک نام "باغِ سلیمانؑ" بھی ہے۔ سعد اللہ سعادت شاہ آبادی نے فارسی زبان میں پٹھان گورنر جمعہ خان کے زمانے میں کشمیر کی جو تاریخ لکھی ہے، اُس کا نام بھی "باغ سلیمانؑ" رکھا ہے۔ مورّخ حسن نے رتنا کر اور ملا احمد کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرتِ سلیمانؑ کے کشمیر آنے سے متعلق روایت موجود ہے بلکہ اُسی نے جنوں کی مدد سے ستی سر جھیل کو خشک کروایا تھا اور اسی کے نام پر کشمیر کا نام "باغ سلیمانؑ" بھی ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے، تاریخِ حسن (فارسی) حصۂ دوم۔ ص ۴۲۔۴۱)

۴: راج ترنگنی (اردو ترجمہ) مترجم: اچھر چند۔ ص: ۲۳

۵: تاریخِ حسن (فارسی) حصۂ دوم: ص: ۱۵۔۱۶

۶: Naglore has come to stay in Kashmri. It is a fine piece of literature but we need not to make it our basis to understand the pre or historic Kashmir.No Naga aboriginals for Kashmir are attested. (Page.40) Kashmir Folkore is a rich piece of literature and it has become richer with the addition of Nag-stories who have their origins in the Jatakas, Purans and Rajtarangni of Kalhana.(No Naga presence in ancient

Kashmir: Gulshan Majeed , Approaches to Kashmir Studies.Page :40, 48

۷: کشمیری لوک ادب میں یہ روایت چلی آرہی ہے کہ پاتال زمین کے نیچے کوئی جگہ ہے، جہاں سے نأگ رائے (ناگ ارجن) ہی مال کی تلاش میں ایک چشمے میں سے سانپ کی صورت میں زمین پر آکر سدارام کے بستے میں داخل ہوا تھا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ محض مفروضہ ہے اور سندھ وادی میں ''پاتال نگری'' نام کا ایک شہر تھا، جہاں ناگ رہتے تھے۔ (دیکھئے، وبتھ آگر ،لوک ادب نمبر۔ مراز ادبی سنگم بجبہاڑہ۔ مقالہ نگار: موتی لال ساقی اور کاشُر لکھ وۄ ٹر، تحقیق تہٕ تجزیہ۔ غلام نبی آتش۔ص۔۴۲)

۹: ہی مال (فارسی): مرتّب: محمد یوسف ٹینگ۔ ناشر: کلچرل اکادمی۔

۱۰: یہ کہانی سب سے پہلے مفتی صدرالدین وفائی (وفات: ۱۳؍اگست ۱۸۱۳ء) نے فارسی میں منظوم کی، بعد میں اسی زبان میں بابا اسرار قادری اور کشمیری زبان میں ولی اللہ متو نے اس کو مثنوی کا روپ دیا۔

۱۱: راج ترنگنی: کلہن پنڈت۔کاشُر لکھٕ کتھٕ جلد ۵۔ ''ناگہٕ کورِ ہُند لڑھجہِ دب'' کلچرل اکادمی

۱۲: کاشُر لکھٕ کتھٕ: جلد ۵ ''ظالم خان'' کلچرل اکادمی

۱۳: ان بزرگوں کی وفات کے تقریباً دوسوسال بعد بابا داؤد مشکواتیؒ اور بابا نصیب الدین غازی نے ''اسرار الابرار'' اور ''نورنامہ'' میں اُن کا ذکر کیا ہے بلکہ نورنامہ میں تفصیلات درج ہیں۔

۱۴: ''حبہ خاتون'' سے متعلق لوک کہانی غلام محمد حنفی سوپوری نے کسی داستان گو غلام عثمان سے سُن کر کشمیری میں منظوم کی تھی۔ پروفیسر محی الدین حاجنی نے

یہ کہانی اپنی کتاب ''لکہ رس'' میں شامل کی ہے۔ کہانی کے مطابق حبہ خاتون کو گریز کے راجہ کی بیٹی بتایا گیا ہے۔ راجہ کے پاس للہ ہوم نامی گاؤں کے ایک تاجر حیابند کا بہت قرضہ واجب الادا تھا۔ وہ قرضہ نہیں چکا سکا۔ اس کے عوض اپنی خوبصورت بیٹی کو حیابند کے بیٹے کے پلے باندھ دیا۔ سسرال میں اسے تنگ کیا گیا اور طلاق دے دی گئی۔ اسی اثناء میں یوسف خان، حبہ خاتون کو اپنے پاس لے آتا ہے، بیوی بنا کر نہیں بلکہ ایک عارفہ کی حیثیت سے اپنا گرو بنا کر اپنے یہاں رکھتا ہے۔ بقولِ داستان گو دونوں میں جنسی تعلق نہیں تھا۔ حبہ خاتون کے باپ کا نام ملک داراب اور خاوند کا نام خواجہ لالہ بتایا گیا ہے۔ گریز میں آج تک ایک پہاڑ حبہ خاتون سے منسوب ہے۔

۱۵ؔ: I do not mean that poltical history can not be constructed or reconstructed on the basis of oral evidence but the fact of matter is that the degree of historical continuity that is required to document political history can not be fully attained or acclaimed with the help of folklore or oral evidence. In Kashmir we have a good number of legends in vogue. these legends have stood against the test of time and These of course, have helped in linking the the broken knots of Kashmir.(Farooq Fayaz-Kashmir Folkore)

..................☆☆☆..................

ایاز رسول نازکی

برٹش لائبریری میں کشمیر

لائبریری آف دی انڈیا آفس میں برصغیرِ ہند، برما اور دیگر متعلقہ علاقوں سے متعلق دستاویزات جمع کی گئی تھیں۔ یہ تمام دستاویزات اب برٹش لائبریری کا حصّہ ہیں۔ فارسی قلمی نسخوں سے متعلق لائبریری آف دی انڈیا آفس کا ایک کیٹا لاگ ۱۹۰۳ء میں آکسفورڈ'' پریس نے شائع کیا۔ اس کٹیالاگ کا ایک نسخہ راقم الحروف کی دسترس میں ہے۔ اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ انکشاف ہوا کہ ان فارسی قلمی نسخوں میں درجنوں ایسے بھی ہیں جن کا تعلق یا تو کشمیر سے ہے یا پھر کسی کشمیری سے۔ ان قلمی نسخوں کی تفصیلات کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ بات پوری شدّت کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر اور اہلِ کشمیر نے علم وادب، شاعری، تاریخ، معاشرتی زندگی، غرض زندگی کے لگ بھگ ہر شعبے میں قابلِ قدر سرمایہ چھوڑا لیکن وقت کی ستم ظریفی کہ آج وہی کشمیران معاملات میں خود اپنے آپ سے اور اپنے اسلاف سے بے خبر ہے۔ جن تین بزرگوں کا ذکر کرنا اس مضمون میں مقصود ہے، انہوں نے اپنے اپنے زمانے میں اپنے علمی اور ادبی وجود کا لوہا منوایا تھا۔

آج ان تین اصحاب سے اوران کے کام سے نئی نسل بے خبر بھی ہے اور غافل بھی۔

کشمیر کی سماجی اور حکومتی زندگی سے فارسی بے دخل کردی گئی اور آہستہ آہستہ ایک بڑی تہذیبی روایت سے ہمارا رشتہ کمزور سے کمزور تر ہوتا گیا۔ فارسی کی جگہ دوسری زبانیں معرضِ وجود میں آتی گئیں مگر بدقسمتی سے یہ زبانیں وہ مقام پیدا نہ کرسکیں جو فارسی نے کیا تھا۔ اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کشمیر اور اہلِ کشمیر نے اپنے فارسی دَور میں جو علمی فتوحات اپنے نام کیں وہ فارسی کے بعد کے دور میں کیوں دہرائی نہیں جاسکیں۔ فارسی دَور میں کشمیر نے نہ صرف شاعری اور ادب بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں کارنامے انجام دیئے، اسی کیٹلاگ میں علمِ طب پر کئی حوالے نظر سے گزرتے ہیں۔ تاریخ ایک اہم موضوع رہا ہے۔ یہاں جن تین اصحاب کا تذکرہ کیا جارہا ہے ان میں ایک صاحب خالص مورّخ کہلائے جاسکتے ہیں۔ دو دیگر اصحاب کا تعلق فنِ شعر سے بھی ہے اور زبان سے بھی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ کشمیر اور کشمیریوں کے تعلق سے جتنا ادبی اور علمی اثاثہ دنیا بھر کی لائبریریوں میں موجود ہے، اس کی کھوج کی جائے، خود کشمیر میں ایسے سینکڑوں مخطوطات آج بھی گھروں میں گردوغبار میں اَٹے، کاغذ کے کیڑوں کی غذا بنتے جارہے ہیں۔ انہیں محفوظ کرنے کی خاطر فوری اقدامات کی ضرورت ہے۔

ا۔ سیف الدین سیف کشمیری

برٹش لائبریری میں ''مجموعۂ تصنیفاتِ آخوند سید سیف الدین کشمیری'' محفوظ ہے۔ سیف الدین کشمیری سیف تخلص کرتے تھے اور اس ''مجموعۂ تصنیفات'' کو تحریر کرنے کے دوران لدھیانہ میں بود باش کرتے تھے۔ ان کی شاعری کچھ فارسی اور کچھ اُس دور یعنی انیسویں صدی کے وسط میں مستعمل کشمیری زبان میں ہے۔ آیئے ان کے مجموعۂ تصنیفات کا ایک جائزہ لیں۔

۱۔ قطعات سلامیہ باصنائع ورموزِ حروفِ سلام:

اس کے تحت ۲۳ قطعات فارسی زبان میں لکھے گئے درج ہیں۔ لفظ "سلام" کے اندر پوشیدہ معانی اور حروف کی خاصیتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ مضامین ایک سے انیس قطعات پر پھیلے ہیں۔ قطعہ نمبر ۲۰ ور ۲۱ میں لفظ "تحیّۃ"، قطعہ ۲۲ 'دعا' اور قطعہ ۲۳ یعنی آخری قطعہ میں لفظ "الٰہی" کی وضاحت کی گئی ہے۔ حاشیے پر تفصیلی تشریح بھی درج ہے اور بین السطور بھی وضاحتیں دی گئی ہیں۔ اس حصے کے اختتام پر نثر میں کہا گیا ہے کہ شاعر نے پہلے گیارہ قطعات شدید بخار میں مبتلا ہونے کے دوران نظم کئے اور آخر کے بارہ قطعات صحت یاب ہونے کے شکرانے کے طور پر موزون کئے۔ پہلے قطعے کا پہلا شعر ہے۔

سلام تافتہ انوار بسم از سینش
خواص اللّٰھش از لام برزدہ اعلام

اس کی کتابت شاعر نے خود کی اور تاریخ شوال ۱۲۷۰ھ کی رقم کی۔ (۱۸۵۴ء)

۲۔ مجموعے میں دوسری تحریر جو شامل ہے اس کا عنوان:۔

شرحِ منظوم چیستانِ مُغلّق

اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

حمد حق را کہ بے ھمال بود — لطف او حل ہر شکال بود

یہ ایک طویل قصیدے کی صورت میں تحریر ہے اور اس کی ردیف "بُوَد" ہے "چیستان"، جو ایک 'پہیلی' کی صورت میں سُرخ روشنائی سے درج ہے اور جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

چیست آں جانور کہ ہیات اُو
گاہ بدرو گا ہے ہلال بود

قصیدے کی صورت میں جس تحریر کا ذکر اوپر آیا وہ اسی پہیلی یا چیستان کی شرحِ

منظوم ہے۔فارسی نثر میں حاشیے میں اور بین السطور روضاحتیں بھی درج کی گئی ہیں۔

۳۔مجموعے میں تیسرا اندراج زیرِ عنوان ''نظم ونثر غیر منقوط کہ برائے شاہِ جم جاہ شجاع الملک شاہ مرحوم ساختہ شدہ بود''۔

اس حصّے میں جو ایک طویل قصیدے کی صورت میں نظم کیا گیا ہے کئی لوازمات ملحوظِ خاطر رکھے گئے ہیں۔ایک حصّہ تمام کا تمام بے نقطہ حروف پر مشتمل ہے۔

''عبارات منشور ومنظوم در صنعتِ تجرید یعنی بے نقط بزبانِ عربی وفارسی مع دو بیت در صفتِ منقوط التمام یعنی مجرّد''۔

اسی طرح دوسرے حصّے میں بھی ایک اور صفت پیدا کی گئی ہے۔

''قصیدہ مشتمل بر صنائعِ نادرہ یعنی تجرید وتوسیل یعنی اولاًجملہ حروف متفرقہ بعد ازاں دودو بہم پیوستہ، پس سہ سہ تا دہ دہ تا موصّل التمام یعنی تمام بیت متّصل''

اس جز کے ساتھ بھی حاشیوں پر تشریح اور بین السطور وضاحتیں درج ہیں۔

۴۔......مجموعہ تصنیفات کا اگلا حصّہ ''قصائد وغزلہا'' پر مشتمل ہے۔

حمد خداست مطلع دیوان اختراع

نعت نبیست مقصدِ انشا وابتداع

قصائد اور غزلیات کے ساتھ بھی حاشیے تشریحات سے بھر دیئے گئے ہیں۔

۵......اگلے حصّے میں مختلف اصحاب کو لکھے خطوط، تہنیتی پیغامات وغیرہ درج کیئے گئے ہیں۔

''ابیاتیکہ بطریق رقعات وتہنیت نامہ جات بزرگانِ وعزیزانِ نوشتہ''

پہلا تہنیت نامہ عید کی خوشی کے موقع پر لکھا گیا۔

''در تہنیتِ عید برائے بزرگی''

ایں عیدِ سعید خوش مواعید
بر بخت مبارک مبارک

۶:۔ اگلا اندراج خاص طور پر دل چسپی کا باعث ہے۔

''قصہٗ وامق وعذرا بزبانِ کشمیری کہ بافارسی مختلط است''

فارسی آمیز کشمیری زبان میں قصہٗ وامق وعذرا شاعر کے اپنے بیان کے مطابق اُس نے اپنی جوانی کے ایام میں منظوم کیا جب وہ ابھی کشمیر میں ہی بود و باش کرتا تھا اور اس مسودے کی کتابت اس نے خود لدھیانہ میں ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۷۰ھ (ستمبر ۴۔ ۱۸۵۴ء) کو مکمل کر لی۔ شاعر کا دعویٰ ہے کہ اس کی یہ مثنوی کشمیری زبان میں لکھی گئی بہترین مثنوی ہے۔ اس مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا۔

خداوندا بکن شیدائے عشقم
بگرداں وامق عذرائے عشقم

مجموعہ تصنیفات آخوند سید میر سیف الدین کشمیری سیف میں آخری تصنیف بھی کافی دل چسپ ہے اور کشمیری زبان وشاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک اہم دریافت ہے۔

۷۔ قواعدِ زبانِ کشمیری:

یہ تصنیف گرامر، قواعد وضوابط اور رائج الوقت کشمیری زبان کی لغت پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

''حمدِ بے حد بر خدای سخن برزباں آفرین راکہ
السنہ مختلفہ ولغات گونا گوں آدمیاں راد لیلے۔

سیف الدین کشمیری نے اس کے کشمیری حصے کے اختتام پر تحریر کیا ہے کہ انہوں نے یہ ڈپٹی کمشنر کی درخواست پر ترتیب دیا۔

میر سید آخوند سیف الدین کشمیری سیف کون تھے۔ ان کے حالاتِ زندگی کے بارے میں کوئی جانکاری نہیں۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ (پروفیسر عبدالقادر سروری) میں اِن کا تذکرہ نہیں ملتا۔ ہاں اسی دور میں مرزا سیف الدین کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ مگر سروری صاحب نے انہیں صرف تاریخ نویس کی حیثیت سے متعارف کیا ہے۔ ان کے بارے میں سروری صاحب کی تحریر مندرجہ ذیل ہے۔

ا۔...... میرزا احد کے انتقال کے بعد اُن کے فرزند میرزا سیف الدین کے ذمے یہ خدمت ہوئی۔ اُسی زمانے میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر کی حکومت حاصل کی تھی میرزا سیف الدین ذہین اور طباع انسان تھے۔ فارسی میں انشا پردازی کی مہارت کے علاوہ اچھے خوشنویس بھی تھے۔ اُن کا اثر اور رسوخ انگریزوں کے پاس اور مہاراجہ کے دربار میں دونوں جگہ خاصا تھا اور اس اثر اور رسوخ سے کام لے کر انہوں نے مہاراجہ گلاب سنگھ اور انگریزی حکومت کے تعلقات میں استواری اور خوشگواری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انگریز عہدہ داروں اور یورپی سیاحوں سے بھی اُن کے اچھے مراسم رہتے تھے۔ بیرن ہیوگل نے اپنے سفرنامے میں ان کی صلاحیتوں کو سراہا ہے۔

میرزا سیف الدین نے بہ حیثیت اخبار نویس کے ۱۸۴۶ء سے ۱۸۴۸ء تک کی جو روداد یں لکھی تھیں وہ مرتّب صورت میں محکمۂ ریسرچ میں محفوظ ہیں۔ یہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہدِ حکومت کے سیاسی اور سماجی حالات کی اہم دستاویزات میں ہیں۔ ان کا ایک مستقل کارنامہ ان کی تاریخِ کشمیر ہے جو انہوں نے میجر جان ہیچر کی فرمائش پر ۱۸۵۹ء میں لکھی تھی۔ یہ تاریخ "خلاصۃ التواریخ" کے نام سے موسوم ہے............"

جیسا مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے یہ میرزا سیف الدین، "مجموعۂ تصانیف" کے شاعر نہیں ہو سکتے۔ اگر چہ دونوں حضرات کا زمانہ ایک ہے۔ مگر جیسا کہ "مجموعہ تصانیف" میں تحریر کیا گیا ہے سیف الدین کشمیری سیف کسی وجہ سے کشمیر سے نقلِ مکانی

کر کے لدھیانہ میں آباد ہو گئے تھے اور جیسا کہ صاحب تصانیف نے خود اقرار کیا ہے کہ ان کی جوانی تک کا زمانہ کشمیر میں گزرا جس کے دوران انہوں کے ''وامق عذرا'' کشمیری مثنوی تحریر کی اور بعد میں لدھیانہ چلے گئے۔ لدھیانہ کے قیام کے ہی دوران انہوں نے ''مجموعۂ تصانیف'' کو مکمل بھی کیا اور اس کی کتابت بھی خود کی......

اسماعیل بینش کشمیری

بینش کشمیری تھے۔ ان کا نام اسماعیل تھا اور ''ریاضۃ الشعرا'' اور ''آتش کدہ'' دونوں تذکروں میں ان کا ذکر ہے۔ ان تذکروں کے مطابق وہ کشمیر سے ہندوستان گئے اور دہلی میں قیام پذیر ہوئے۔

''کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ'' میں پروفیسر عبدالقادر سروری نے بینش کا ذکر کرتے ہوئے تاریخِ حسن اور صوفی کی ''کشمیر'' دونوں کا حوالہ دیا ہے اور کہا ہے کہ ان دونوں ذرائع سے بھی ان کا نمونۂ کلام یا حالاتِ زندگی دستیاب نہیں ہو پائے۔ سروری صاحب کی کتاب کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:۔

''مُلا بینش کے بارے میں پیر غلام حسن نے لکھا ہے''، دانشمندِ بےنظیر بلاغت تخمیر، در سخن سنجی بسیار دلپذیر بود'' اور ڈاکٹر صوفی کا بیان ہے کہ وہ صاحبِ دیوان تھے۔ اُن کا کلام کسی نے نہیں دیا ہے۔ اُن کے حالات بھی دستیاب نہیں ہوئے۔

اب ذرا ان کے بارے میں برٹش لائبریری میں محفوظ ان کی کلیات کا ایک سرسری جائزہ لیتے چلیں۔ اِن کی کئی تخلیقات صف شکن خان (محمد طاہر) کے نام منسوب ہیں۔ صف شکن خان امراء میں سے تھے اور ۱۰۶۸ھ میں 'خان' کے لقب سے سرفراز ہوئے تھے۔ وہ اورنگ زیب کی بادشاہت کے چھٹے سال میں (۱۰۷۴ھ۔۱۰۷۳ھ) میں کشمیر کے دورے میں اورنگ زیب کے ہم رکاب تھے۔ سرخوش نے لگ بھگ ۱۱۰۰ھ میں اپنے تذکرے میں صف شکن خان کا ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ ۱۱۰۰ھ تک آتے آتے بینش کا

انتقال ہو چکا تھا۔

برٹش لائبریری میں بینشؔ کی کلیات کی تفصیلات یوں ہیں:۔

ا۔بینش الابصار:۔نظامی کی مخزن ''الاسرار'' کی بحر میں لکھی گئی مثنوی ہے۔اس مثنوی میں سچے فقیر (سالک) کے خصائل کا بیان ہے۔ یہ مثنوی اورنگ زیب کے نام انتساب کردی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
گلبن برجستہ باغِ نعیم

۲۔کلیات میں شامل دوسری تخلیق ہے ''گنجِ رواں''

بنامے کہ عالم گلستان اوست
بگنجِ رواں فلک شان اوست

اس میں اورنگ زیب کی شان میں قصیدے ہیں۔اس کے علاوہ مرزا محمد قاسم کرمانی دیوانِ کشمیر اور میر جمشید کا شانی (بینشؔ کے سرپرست) کے نام بھی قصیدے میں شامل ہیں۔ چار موسموں کا تذکرہ اور ایک ساقی نامہ اس حصّے کے دیگر مشمولات ہیں۔

۳۔گلدستہ:۔اس مثنوی میں تخلیق کا تذکرہ ہے اور ساتھ ہی کشمیر اور لاہور کی تعریف وتوصیف ہے۔

گلدستۂ بوستانِ توحید
حمدست بچشمِ صاحب دید

۴۔رشتۂ گوہر:۔اورنگ زیب کے نام انتساب کی گئی اس مثنوی میں ''امیر'' اور ''گوہر'' کی عشقیہ داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ عاشق و معشوق مازندران کے ''ساری'' علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔

نتواں یافت درخزینہ ٔ شاہ

رشتہ ٔ گوہرے چو بسم اللہ

اس مثنوی کے بارے میں درج ہے کہ یہ شاعر کے خمسے کی آخری مثنوی ہے۔

۵۔غزلیات :۔ ردیف وار غزلیات نقل کی گئی ہیں۔

صبح شد ساقی بساغر کن شرابِ کہنہ را

چوں فلک درگردش آور آفتابِ کہنہ را

۶۔آخر میں چند اور قصائد شاملِ کلیات ہیں۔ان میں سے کچھ امام عالی مقام کے حضور تحریر کئے گئے ہیں اور کچھ مرزا محمد قاسم (دیوان) جن کا ذکر اوپر آچکا اور صف شکن خان کے خدمت میں لکھے گئے۔

زلفِ تو ُ زد بطالع ناساز ما گرہ

در کار آشنا فگند آشنا گرہ

کلیات کے آخری صفحے پر تحریر کیا گیا ہے۔

" Gworge Curttenden, Moorshidabad, Oct., 4th , 1785"

.................☆☆☆.................

خواجہ عبدالکریم بنِ خواجہ عاقبت محمود

خواجہ عبدالکریم بنِ خواجہ عاقبت محمود بن خواجہ محمد کشمیر سے شاہجہاں آباد منتقل ہو گئے اور یہاں انہوں نے بہ نفس نفیس نادرشاہ کی ہندوستان پر یلغار کے حالات وواقعات کا بچشمِ خود مشاہدہ کیا اور اس دور کی پوری داستان راقم کی جو برٹش لائبریری میں "بیانِ واقع" نام سے موجود ہے۔اس میں نادرشاہ کے حملے سے لے کر اس کی وفات تک کے حالات درج ہیں۔مزید نادرشاہ کے بعد محمد شاہ اور احمد شاہ کے دورِ سلطنت کا بھی تذکرہ ہے اور آخر میں مصنف نے ایران اور عرب میں اپنے سفر کی تفصیلات بھی درج کی ہیں۔

اس تاریخی لحاظ سے بے حد اہم قلمی نسخے کا ایک نامکمل ترجمہ ایف، گولڈون نے انگریزی زبان میں ۱۷۸۸ء میں کلکتہ سے شائع کروایا۔ " Memoirs of Khojeh Abdulkurreem . خواجہ صاحب نے کتاب کے آغاز میں اس چار ابواب پر مشتمل ہونے کی بات کہی ہے مگر لگتا ہے کہ آخر میں انہوں نے اس میں کل ملا کر پانچ ابواب تحریر کئے۔ ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

بابِ اوّل:۔ در ذکرِ عروج وخروجِ نادر سلطان وآمدن او بہ سمتِ ہندوستان

باب دوم:۔ در بیانِ معاودت نادر السلطان بسوی ایران ورفتن بہ توران وخوارزم دریں میان

بابِ سوم:۔ متضمن بعضے وقائع کہ از دار السلطنت قزوین تا بندر ہوگلی کہ از بنادر متعلقۂ سلطنت ہندوستان است مشاہدہ نمود

باب چہارم: در ذکرِ بعضے از وقائع کہ از ابتدائی ورود بہ بندر ہوگلی تا وقت وصل و انتقال اعلیٰ حضرت کثیر المروّت پادشاہ درویش صفت محمد شاہ فردوس آرامگاہ، بظہور پیوستہ۔

باب پنجم:۔ در ذکرِ بعضے امور کہ در ایام سلطنت احمد شاہ بہادر بہشت آمد۔

قلمی نسخے پر سال تحریر درج کیا گیا ہے۔

......سنۂ یک ہزار و یک صد و نود و نہ ہجر سیت"۔

اس طرح سے یہ نسخہ ۱۱۹۸ھ بمطابق ۱۷۸۴ء میں ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔ کتابت خطِ شکستہ میں ہے اور کاتب کا نام درج نہیں کیا گیا۔

............☆☆............

اب ایک نظر فرانسس گلاڈون کے ترجمے پر بھی ڈالتے چلیں۔ کتاب کی تشریح میں ناشر نے لکھا ہے "ایک سربرآوردہ کشمیری، جو نادر شاہ کی ہندوستان سے فارس واپسی کے دوران اس کا ہم سفر رہا اور پھر وہاں سے بغداد، دمشق، ایلوپو، اور مکہ، مدینہ کی زیارت

کرنے کے بعد جدّہ کی بندرگاہ سے ہوگلی بنگال بذریعہ سمندر روانہ ہوا۔ کتاب میں ہندوستان کی تاریخ ۱۷۳۹ء سے ۱۷۴۹ء تک درج ہے، بنگال میں یوروپی بستیوں کے بارے میں تفصیلات۔"

خواجہ عبدالکریم کشمیری نے کتاب کے دیباچے میں تحریر کیا ہے:۔

"عبدالکریم، فرزند خواجہ عاقبت محمود اور پوتا محمد بولاکی کا، سرزمینِ کشمیر میں تولد ہوا، جو کہ مثلِ بہشتِ بریں ہے جو ہمارے عظیم مورث کی جاگیر تھی اور ان ہی کی طرح اپنی سرزمیں سے ملک بدر کردیا گیا۔ مگر ایک فرق یہ تھا کہ آدم نے جلاوطنی سے قبل گناہ کا پھل چکھا تھا۔

شعر:۔(انگریزی سے ترجمہ)

میرے دوست بن جاؤ کہ میں اس دور کا آدم ہوں
بجز ملعون ابلیس کے میرا کوئی دشمن نہیں ہوگا

اب میں پوری عاجزی کے ساتھ اُن سے مخاطب ہوتا ہوں جو حقیقی طور پر اہلِ علم ہیں جو علم و دانش میں کلی مہارت رکھتے ہیں اور اس بات پر آمادہ رہتے ہیں کہ دوسروں کی خامیاں معاف کریں۔

جس وقت نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا، میں شاہجہاں آباد میں مقیم تھا۔ میں نے کافی دیر سے یہ خواہش کر رکھی تھی کہ میں مکّہ کی زیارت کروں اور دیگر متبرک مقامات پر حاضری دوں اور صاحب ایمان حضرات کی قدم بوسی کروں...... چونکہ ہر شخص جو دلجمعی سے کسی مقصد کو حاصل کرنے کی چاہ کرتا رہتا ہے اپنی منزلِ مقصود پا جاتا ہے، ایسا ہوا کہ میری ملاقات مرزا علی اکبر سے ہوئی جو کہنے کو تو ریکارڈ کے محافظ تھے، مگر کسی کے وزیرِ اعظم نہ ہونے کے سبب اس عہدے کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے "جو اللہ کی مرضی ہو، ہو جاتا ہے، اور وہی اس کے اسباب بھی پیدا کرتا ہے۔" مرزا علی اکبر نے فوراً مجھے نادر شاہ

کے حضور پیش کیا، جس نے وعدہ کیا کہ میں حج کو جاسکوں گا، میں اس کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔

میرے اسفار سے واپسی پر، جو میرے اندازے سے کہیں زیادہ طویل ثابت ہوئے، میرے کچھ عزیز دوستوں (جن کی محبت اور شفقت کے مظاہر میرے تجربے میں بدرجۂ اتم موجود تھے) نے صلاح دی کہ میں اپنے سفر کی روئیداد قلمبند کروں، جس میں فارس کے شاہی دربار کی تفصیلات ہوں اور ساتھ ہی ہندوستان کے بے حد دل چسپ واقعات کا ذکر ہو۔ جب سے کہ میں ہوگلی میں وارد ہوا، یہ سب میں نے نہایت سادہ اور سلیس انداز میں تحریر کرنے کی سعی کی ہے۔"

اس طرح یہ سفرنامہ شروع ہوتا ہے اور قاری کی پوری دل چسپی کا باعث بنا رہتا ہے۔ عبدالکریم الکشمیری کی اس یادداشت سے نہ صرف اس زمانے کے ہندوستان کی سیاسی، مجلسی زندگی کا ایک چشم دید تذکرہ سامنے آتا ہے بلکہ نادر شاہ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے بھی پردہ اٹھتا دکھائی دیتا ہے اور سفر کے دوران نادر شاہ کئی مقامات پر اپنی سنگدلی کا مظاہرہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ کئی یوروپی مورّخوں نے خواجہ عبدالکریم الکشمیری کی اس کتاب کو نادر شاہی دَور کو سمجھنے کے لئے سب سے زیادہ اہم کتاب تصوّر کیا ہے۔

خواجہ عبدالکریم الکشمیری ولد خواجہ عاقبت محمود ولد خواجہ محمد بولا کی کے نادر شاہ کے حضور پیش ہونے سے قبل کشمیر کے قیام کے دوران کے حالات زندگی کے بارے میں شاید کچھ بھی معلوم نہیں۔ اس بات کا عندیہ بھی نہیں ملتا کہ ہوگلی وارد ہونے کے بعد اور اس کتاب کی شیرازہ بندی کے بعد ان کی زندگی کہاں اور کیسے گذری۔

..................☆☆☆..................

✿...... انگریزی : سر جیمز ڈوئی

✿...... تلخیص و ترجمہ: محمد یوسف مشہورؔ

تصویرِ کشمیر

سر جیمز میک کرون ڈوئی کی کتاب ''پنجاب، شمال، مغرب صوبہ سرحد اور کشمیر'' انگریزی زبان میں تقریباً ایک سو برس پہلے مکمل ہو کر چھپ چکی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے، پروجیکٹ گوٹنبرگ ای بکس کے اہتمام سے اِس کا ای، ایڈیشن چھپ چکا ہے۔ اِس کتاب میں مصنّف سر جیمز میک کرون ڈوئی نے اپنے قیام برِ صغیر کے دوران اپنی معلومات، سیاحت، استفسارات و مطالعات کو بنیاد بنا کر اِس مخصوص نوعیت کے خطۂ ارضی کے خدّ وخال، حالات و کوائف کو دل چسپ پیرائے میں قلم بند کیا ہے۔ یہ کتاب ایک اہم تاریخی، جغرافیائی، سماجی اور سیاسی دستاویز کا حکم رکھتی ہے۔ طلباء کے لئے علی العموم اور محققّین کے لئے بالخصوص یہ کتاب خاصی کار آمد ہے۔ جموں و کشمیر (جسے اسے کتاب میں کشمیر ہی کہا گیا ہے) سے متعلق کئی واقعات، جو دورِ حاضر کے قارئین کے لئے دل چسپی کا باعث ہو سکتے ہیں، اِس کتاب کا اہم حصہ ہیں۔

کتاب ۲۲۲ صفحات پر مشتمل ہے مگر اِس میں کشمیر کے کوائف نہایت اختصار

کے ساتھ درج کیئے گئے ہیں۔ کتاب کے تیس ابواب میں سے صرف ایک باب (باب ۲۸) الگ سے 'کشمیر اور جموں' کے عنوان سے باندھا گیا ہے۔ باقی ۲۹ ابواب میں کشمیر کا ذکر مخلوط انداز میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں نقشے اور جدول سر تھامس ہالڈچ کی کتاب ''انڈیا'' سے لئے گئے ہیں۔ ارضیات وسکہ جات سے متعلق معلومات سر تھامس ہالینڈ اور مسٹر آر۔ بی۔ وائٹ ہیڈ آئی۔ سی، ایس کے تیار کردہ ہیں جو ونسٹ سمتھ کی کتاب ''قدیم تاریخ ہند'' سے نقل کئے گئے ہیں۔

اس تصنیف میں مصنف (سر جیمز میک کرون ڈوئی) نے اپنی زندگی کے اُن قیمتی پینتیس سال کو دوبارہ جینے کا اہتمام کیا ہے جو اُس نے تاج برطانیہ کے ملازم کی حیثیت سے برِ صغیر میں گزارے تھے۔ وہ صوبہ سرحد میں ملازمت کے سلسلے میں مقیم رہا۔ جغرافیائی تفصیلات میں حیوانات، نباتات، آبادی اور انتظامیہ سے متعلق یاداشتیں مصنّف کی ذاتی ہیں، جو اس نے اپنے مطالعات سے حاصل کی ہیں۔

احوالِ مصنف

کتاب کے مرتّب کے دیباچے اور ''مصنّف کے نوٹ'' میں مصنّف کے حالات زندگی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ صرف اس قدر واقفیت بہم کی گئی ہے کہ مصنّف سر جیمز میک کرون ڈوئی، ایم۔ اے، کے سی، ایس۔ آئی، صوبہ سرحد میں ضلعی آفیسر کے عہدے پر مامور تھے۔ اس کے بعد وہ کمشنر، چیف سیکریٹری، فائنانشل کمشنر اور آخر پر انچارج لیفٹننٹ گورنر کے عہدے پر فائز رہے۔

مصنّف نے اِس کتاب کو ۱۹۱۶ء میں زیور طباعت سے آراستہ کرایا تھا۔ مرتّب ٹی۔ ایچ۔ نے بہت ہی مختصر دیباچہ تحریر کیا ہے جس میں مصنّف کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔ دیباچے کے بعد خود مصنّف نے ایک عدد نوٹ شاملِ کتاب کیا ہے جس میں زیادہ تر اُن شخصیات کے تئیں اظہارِ تشکر کیا گیا ہے جن کی مساعی براہِ راست یا

بالواسطہ کتاب کی ترتیب وتزئین میں بروئے کارلائی گئی ہیں۔

کتاب میں جہاں کہیں کشمیر کا ذکر آیا ہے اور اس کے مختلف کوائف کا بیان ہوا ہے، میں نے اُس کو چُن چُن کر اردو کا جامہ زیب تن کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لفظی ترجمہ کے بجائے رواں اور بامحاورہ اخذ واکتساب کا طریقہ اپنایا ہے۔ حذف واضافہ سے بہر حال اجتناب کیا گیا ہے تاکہ اصل کا لطف برقرار رہے اور مداخلتِ بے جا کی سعیٔ نا معقول سے بچنے کی کوشش کی ہے تاہم دورانِ ترجمانی معیاری علمی مصطلحات کا استعمال ناگزیر معلوم ہوا۔

کشمیری آبادی

کشمیری دراز قد، گندمی رنگ اور گول سروالی ہند آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ میل جول اور اختلاط کی بناپر وسطی ایشیا کی منگول نسل کے خدّوخال رکھتے ہیں۔

محلِ وقوع

کشمیر کا بلند ترین علاقہ 37.4 شمالاً ہے جو سائرا کوز کے تقریباً برابر ہے اور ۸۰ شرقاً تک پھیلا ہوا ہے۔ کشمیر کا رقبہ ۸۱،۰۰۰ مربّع میل ہے۔

پہاڑی اور میدانی حصوں کا رقبہ درج نہیں کیا ہے۔ شاید اس طرح کی معلومات فراہم نہیں تھیں۔

کشمیر، چین سرحد:۔ ہونزا کے شمال میں کشمیر کا ایک ایسا مقام ہے جہاں تین بڑے پہاڑ مزتاگ......جنوب مشرق میں ہندوکش......جنوب مغرب میں اور سری کول (گون لون کی ایک شاخ)......شمال مغرب میں، آپس میں ملتے ہیں۔ یہ ہندوستانی، چینی، روسی اور افغان سلطنتوں کی سرحد بھی ہے۔ مغرب کی جانب کشمیر اور چینی ترکستان کی یہ سرحد مغرب میں ۳۵۰ میل (موڑ چھوڑ کر) لمبی ہے اور اُن بلندیوں سے گزرتی ہے جو مزتاگ قراقرم سلسلوں کے شمال میں واقع ہیں۔ کشمیر کی یہ سرحد گون لون کے عظیم وسط

ایشیائی دائرے پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ یہاں اس مقام سے یہ سرحد جنوب کی طرف جاتی ہے اور چینی تبّت کو لنگزی تھانگ کے نمکین میدانوں اور کشمیر کی وادئ سندھ اور بھشاہار کی مقامی ریاست کے مشرقی سے الگ کرتی ہے۔ یہ حصہ جو طبعی اعتبار سے تبت کا حصہ ہے، ہمالیہ......تبّت طبعی جغرافیائی نقطۂ نظر سے ریاستِ کشمیر کے بہت بڑے مگر انتہائی غیر معروف خطے پر مشتمل ہے اور کوہ قراقرم شمالی سلسلہ کی جانب ہے۔ یہ عجیب وغریب بلکہ حیران کن، الگ تھلگ، آندھی زدہ سطحِ مرتفع ہے، اس کی اوسط بلندی ۱۵۰۰۰ فٹ ہے۔ اس کا وہ حصہ جو نیپال کے شمال مغربی زاویئے کے شمال میں واقع ہے، مانسرور جھیل کے لئے مشہور ہے۔

کوہِ زانسکار یا اندرونی ہمالیہ:

ہمالیہ کی ایک شاخ مشرقی نیپال سے ہوتے ہوئے تبّت اُس مقام تک پہنچتی ہے جو زانپو (برہم پُترا) کے منبع کے قریب ہے۔ اسی دامن میں سندھ کی وادی واقع ہے۔ اسی سلسلۂ ہمالیہ کے مغربی حصہ زانسکار سلسلۂ کوہ کہتے ہیں۔ یہ دور تک پنجاب اور کشمیر کی سرحد بناتا ہے۔ یہ سرحد کانگڑہ کے لاہول اور سپتی خطہ کو لداخ سے الگ کرتی ہے۔ اِس علاقے میں ہمالیہ کی چوٹیاں ۱۹ ہزار سے ۲۱ ہزار فٹ تک بلند ہیں۔ اسی حصہ میں کانگڑہ کی کلو وادی سے لداخ کے مرکز لیہہ کے درمیان سڑک پر درۂ بارالاچا ۱۶،۵۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ زانسکار، کشمیر میں وادئ سندھ کو وادئ چناب اور وادی جہلم کو الگ کرتا ہے۔ سرینگر کے مشرق میں نُن اور کُن نامی ہمالیائی چوٹیاں ۲۳،۰۰۰ فٹ اونچائی سے تجاوز کرتی ہیں اور شمال مغرب میں نانگا پربت اس سلسلہ میں پست ترین مقام زوجیلا ہے جو ۱۱،۳۰۰ فٹ ہے اور سرینگر لداخ شاہراہ اِس سے ہو کے گزرتی ہے۔

سرینگر گلگت سڑک درۂ بُرزِل سے ۱۳،۵۰۰ فٹ کی بلندی سے گزرتی ہے۔ زوجیلا، دریائے سندھ کی خوب صورت وادی کی انتہائی اونچائی پر واقع ہے۔ دریائے

سندھ دریائے جہلم کا ایک معاون دریا ہے۔ بلند بام زانسکار پہاڑی سلسلہ مون سون کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اسی لئے زوجیلا کے اِس پار خِطہ کے خط وخال بالکل مختلف ہیں۔ گھنے جنگلوں اور سرسبز میدانوں کی زمین پیچھے رہ جاتی ہے اور عریاں چٹانی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

"وسیع برفیلا علاقہ عریاں تبت کی سرحد ہے جہاں سبزہ زاروں کی جگہ ریتلے میدان نظر آتے ہیں۔ فلک بوس چوٹیاں اوپر اٹھتی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر بے آب وگیاہ ہیں یخ اور نمی سے یہ چٹانیں ٹوٹتی پھوٹتی رہی ہیں جس سے اُن میں شگاف اور دراڑیں پڑتی رہتی ہیں۔ پہاڑ کا رنگ بالعموم سارے لداخ میں اور علی الخصوص درہ فوطول کے آس پاس انتہائی انوکھا اور حیران کُن ہے۔

جوں جوں ہم بلندی کی طرف چڑھتے ہیں، چوٹیاں شہنائی نما دکھائی دیتی ہیں۔ ہر شہنائی اپنے مخصوص رنگ میں رنگی نظر آتی ہے۔ زرد سلیٹی نیلا، سرخی مائل، پیلا، بھورا، نارنگی اور چاکلیٹی۔ ہر رنگ سلیٹی تہہ والے پتھر سے مشابہ...... (حسین کشمیر، از نیو)

اس سارے سخت وعریاں چٹانی سلسلے میں کہیں کہیں نخلستان ہیں جہاں ہموار مٹی اور دریائی آب پاش کی مدد سے قدرے زراعت اور نباتات ممکن ہوجاتے ہے۔

چندرا، بھاگا ندیوں کے منبع کانگڑہ میں واقع ہیں۔ یہ ندیاں آگے چل کر دریائے چناب میں جاملتی ہیں۔

وسطی ہمالیہ یا پانگی پہاڑ:

وسطی ہمالیہ یا پانگی پہاڑ مغرب میں درہ روتانگ اور شمال میں بارا بنگا ہال سلسلہ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ چنبا سے ہوتے ہوئے چناب وادی (پانگی) کو راوی سے جدا کرتا ہے۔ کشمیر میں یہ پہاڑ کولاہائے Cone (۱۷،۰۰۰ فٹ) کے پاس چناب اور جہلم کے منبع کو عبور کرتا ہے، پھر آگے بڑھتے ہوئے مغرب میں ہرمکھ پہاڑ (۱۶،۹۰۰ فٹ) کے

روپ میں ایستادہ ہے جو جنوب کی جانب وُلر جھیل اور کشن گنگا پر سایہ کناں ہے مزید آگے بڑھتے ہوئے یہ سلسلہ ہزارہ میں فلک پیما کاگان تک پہنچتا ہے۔

بیرونی ہمالیہ یا ڈھولدھار پیر پنچال پہاڑی سلسلہ

بیرونی ہمالیہ بھی درۂ روتانگ کے قریب ایک مقام سے شروع ہوتا ہے لیکن اندرونی ہمالیہ سے جنوب کی طرف سے اس کا محور اندرونی ہمالیہ کے متوازی چلتا ہے اور ڈھول دھار (سفید پشتہ کے نام سے) چمبا کی سرحد بناتا ہے جس کے مرکزی مقام دھرم سالہ کے عقب میں یہ ایک بڑی دیوار بن کر کھڑا ہے۔ اس کی اوسط بلندی اگرچہ ۱۵۰۰۰ فٹ ہے لیکن بعض مقام پر ۱۶۰۰۰ فٹ تک پہنچتی ہے۔ چمبا سے ہوتے ہوئے یہ کشمیر (جموں) میں بھدرواہ سے گزرتا ہے اور چناب کو پار کر کے پیر پنچال کے طور پر ریاست کے جنوب سے آگے بڑھتا ہے۔ یہاں اس کی بلندی ۱۴۰۰۰ فٹ سے ۱۵۰۰۰ فٹ کے درمیان ہے جو اس کی بڑی شاخوں اندرونی ہمالیہ اور مزتانگ قراقرم سے کم ہے۔ یہ شاخ مذکورہ دو شاخوں کو پنجاب میں رہنے والوں کو دکھائی نہیں دیتی ہے۔ اس کی برف پوش چوٹیاں راولپنڈی، جہلم اور گجرات سے دکھائی دیتی ہیں یہی شاخ کاجی ناگ میں جہلم اور کشن گنگا دریاؤں کی گھاٹیوں اور ضلع ہزارہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ ڈھولدھار کے مشرقی حصہ سے اس شاخ کی ذیلی شاخیں کلو اور منڈی تک پہنچتی ہیں۔ اسی حصہ میں درۂ ڈُلچی منڈی کے راستے سے کلو کو کانگڑہ سے جوڑتی ہے۔ ہمالیائی سلسلے کی دریائی گھاٹیوں میں سے جہلم کی وادیٔ کشمیر اور بیاس کی کلو وادی زراعت اور باغبانی کے لئے موزونیت کی وجہ سے خصوصی امتیاز کی مالک ہیں۔ ہمالیائی خطہ میں جو چیزیں سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اُن میں سے ایک چیز یہاں کے دریاؤں اور ندیوں کے پانی کا کم بہاؤ ہے۔ البتہ بارشوں اور برسات کے موسم میں اِن کا بہاؤ قدرے تیز ہوتا ہے اور پانی کے جھرنے زور زور سے چھلانگتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں کی خوبصورتی دلآویز ہے۔ جنگلات کا حسن و

جمال بھی دل کش ہے۔ کہیں کہیں پانی کی نایابی کھٹکتی ہے۔ کشمیر میں عام طور پر جہلم اور اس کی معاون ندیوں میں پانی کی بہتات ہے جس سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ ایک اور قابلِ رشک بات یہاں کے جنگلات کی پُر وقار خاموشی ہے۔ ان جنگلات میں پرندے اور وحشی جانور تو ہیں لیکن کھلے عام گھومتے پھرتے نظر نہیں آتے ہیں۔ ایک اور قابلِ غور بات شمالی اور جنوبی ترائیوں کے درمیان فرق ہے۔ اوّل الذّکر جنگلات سے مالا مال ہیں جبکہ آخر الذکر پتھریلی ہیں اور ان پر موسمی خاردار جھاڑیوں یا سبز گھاس کی تہہ اُگتی ہے۔ اسی لئے ان مقامات پر نمی کافی مقدار میں پائی جاتی ہے۔

مزتاگھ قراقرم سلسلہ:

مزتاگھ قراقرم پہاڑ سندھ کا شمالی طاس بناتے ہیں۔ اس سلسلے کی مرکزی شاخ کے علاوہ کئی شاخیں ہیں۔ قراقرم، جنوبی حصہ کے لئے مناسب نام ہے۔ یہ حصہ کشمیر کے پار سطح مرتفع تبت میں پینگونگ جھیل کے قریب ہی جنوبی طول البلد سے شروع ہوتا ہے۔ درۂ قراقرم کے عقب میں تنگ بالائی مسطح علاقہ ہے۔ اس کی سطح پر نمکین چشمے جگہ جگہ ہیں۔ اس غیر مہمان نواز خطہ درۂ قراقرم اور سسرلا (۵۰۰، ۱۷ فٹ) سے ہی یارقند سے لیہہ جانے والی تجارتی شاہراہ گزرتی ہے۔ یہ شاہراہ سال میں صرف میں تین مہینے کھلی رہتی ہے۔ آمدورفت اور سفری مشکلات بے شمار ہیں۔ ۱۸۹۸ء میں ڈاکٹر بلاک ورک مین اور اس کی بیگم اس راستے پر عازمِ سفر ہوئے۔ دریائے شیوک کو پار کر کے بلندی پر واقع نوبرا وادی کی سیر سے مستفید ہوئے، وہاں سے چل کر سسرلا اور درۂ قراقرم کی سیاحت کا لطف اُٹھایا۔ اُن کی دی ہوئی تفاصیل ڈاکٹر نیو کے اُس بیان کے مقابلے میں مبالغہ آرائی ہے جو اس نے زوجیلا سے لیہہ تک کے راستے پر پڑنے والے مناظر کے بارے میں درج کی ہے۔ ورک مین کی تصنیف ''ہمالیہ کی برفیلی دنیا میں'' (ص ۲۸، ۲۹، ۳۰) جس شاعر کو وادئ کشمیر میں جنّت بے نظیر کا تصور سوجھا تھا، اُسے یہاں ایک نیا دوزخ متصوّر ہوگا۔

اگر کوئی سیاح راولپنڈی میں ریل گاڑی سے اُتر کر تانگے پہ سوار ہو کر کشمیر کی راجدھانی کی طرف سفر شروع کرے گا تو اُسے کوہالہ اور بارہمولہ کے درمیان ایک اور عجوبہ منتظر دکھائی دے گا۔ ہموار علاقوں سے گزرنے والا دریا جو اُسے جہلم کے مقام پہ ملا تھا، وہ یہاں تیز رفتاری سے گہرائیوں میں پتھریلی سطح پر بہتا ہے۔ بل کھاتا ہوا یہ دریا پانی سے گھسی ہوئی چٹانوں کے درمیاں گہری کھائیوں سے گھرا آگے بڑھتا ہے۔ بارہمولہ سے آگے سرینگر کی طرف اس کی نوعیت مختلف ہے یہاں یہ ایک مدھم رفتار سے چپٹی وادی سے گزرتا ہے اور ایک وسیع جھیل میں گرتا ہے۔

دریائے سندھ کا طاس:

یہ طاس ۳۷۳۰۰۰ میل رقبے پر پھیلا ہوا ہے ۳ جس میں کچھ حصہ مزتاگ قراقرم کی گود میں واقع ہے۔ اس کا کچھ حصہ کشمیر میں اور کچھ حصّہ تبت میں ہے۔ کشمیر کی سرحد کو چھوتی ہوئی یہ ندی ۱۳۸۰۰ افٹ بلندی پر بہتی ہے۔ ۱۲۵ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد لداخ کا دارالخلافہ لیہہ آتا ہے جو ۱۰،۵۰۰ افٹ بلندی پر ہے۔ یہاں یہ دریا یارقند تجارتی شاہراہ پر پڑتا ہے۔ لیہہ سے تھوڑی سی پستی میں سندھ کا گزر زانسکار سے ہوتا ہے جو کشمیر کے جنوب مشرق سے بہتا ہے۔ قراقرم درہ کے عظیم یخ تودے (گلیشئر) سے نکل کر شیوک ندی جنوب مغرب میں نوبرا سے ہو کر بہتی ہے۔ چلاّس کے مغرب میں پچاس ساٹھ میل کے فاصلہ پر سندھ آخر پر جنوب کو مُڑتا ہے۔ کشمیر میں سندھ اور شیوک زرخیز میدانوں سے بھی گزرتے ہیں اور تنگ ترائی کھائیوں سے بھی۔

جہلم:

پنجاب کے پانچ دریاؤں کے انتہائی مغرب میں کشمیر کی ویتھ، جسے پنجاب کے میدانی علاقوں میں ''وِہت'' کہتے ہیں، بہتی ہے اسی کو انگریزی میں جہلم بھی کہتے ہیں۔ مسلم مورّخوں نے اِس کو ''بہت'' کہا ہے اور یونانیوں نے ہائی داس پس (

(Hydaspes) جو سنسکرت کے وِتستا کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ اس کا منبع ویری ناگ کا گہرا چشمہ ہے جو اسلام آباد (کشمیر) کے مشرق میں ہے۔ اسلام آباد قصبہ میں ہی یہ کشتی رانی کے قابل بنتا ہے اور سست رفتار سے پُر وقار انداز شمال مغرب میں سرینگر سے ہوتے ہوئے ۱۲۰ میل کی مسافت طے کرتا ہے۔ وُلر جھیل میں داخل ہوتا ہے اور بارہمولہ پہنچتا ہے۔ اس کے کنارے بالکل پست ہیں اور دریا کے قریب تک ان پر کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ ان کناروں سے دُور اونچے اونچے پہاڑ کھڑے ہیں۔ بارہمولہ پہنچ کر دریائے جہلم کی ہیئت ایک دم تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہاں سے ۷۰ میل دور کوہالہ، جہاں مُسافر پل پار کر کے پنجاب کی سرحد میں داخل ہوتا ہے، تک دونوں طرف بنی ہوئی گہری کھائیوں میں سر پٹکتی ہوئی چلتی ہے اس دوران اس کے دائیں جانب کاجی ناگ اور بائیں جانب پیر پنچال کوہستانی سلسلہ چلتا ہے۔ بارہمولہ سے کوہالہ تک اس دریا کی سطح ۵۰۰۰ فٹ سے گر کر ۲۰۰۰ فٹ رہتی ہے۔ دومیل کے مقام پر جو کوہالہ سے پہلے آتا ہے کشن گنگا جہلم میں مدغم ہوتا ہے۔ آگے چل کُنہار بھی اس میں گرتا ہے جو کاغان وادی کو ہزارہ سے جوڑتا ہے۔ کوہالہ سے آگے جہلم جنوب کی طرف مڑتا ہے اور پہاڑی دریا کی حیثیت سے دائیں طرف راولپنڈی کے پہاڑوں اور بائیں طرف پونچھ کی ریاست کو چھو کر آگے بڑھتا ہے۔ شمال مغربی ہمالیائی سلسلہ میں سب سے خوب صورت نظارہ دریائے جہلم کا علاقہ پیش کرتا ہے۔ اِس علاقہ میں وادیٔ کشمیر اور چھوٹی چھوٹی وادیاں اور لولاب، سندھ اور کنگن ایسا دل کش نظارہ پیش کرتے ہیں جو کسی دوسری جگہ دستیاب نہیں ہے۔ میدانوں میں بھی اس کی دل کشی برقرار رہتی ہے۔ اس کے کناروں پر زرخیز میدان، سرسبز و شاداب کھیتوں اور سبز پوش درختوں کو اپنے سینے پر سجائے ہوئے ہیں۔

چناب:

چمبہ سے ہوتے ہوئے جنوب مشرقی کشمیر کے کشتواڑ علاقہ سے دریائے گزرتا

ہے۔ یہ پیر پنچال کوہستانی سلسلہ کو قطع کرتا ہوا اکھنور پہنچتا ہے اور وہاں سے سیالکوٹ (پاکستان) پہنچتا ہے۔

راوی

یہ دریا بھی کشمیر کی سرحد پر بسوہلی تک پہنچتا ہے جہاں کشمیر، چمبہ اور گرداسپور کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں۔

ارضیات اور معدنی ذخائر:

کشمیر کا خصوصی ذکر واجب ہے کیوں کہ یہ ماہرِ ارضیات کے لئے خاص جنّت ہے۔ جو مسائل اُسے یہاں درپیش ہوتے ہیں اُن میں پٹرولیم سے جُڑا سوال بھی زیرِ بحث لایا جاسکتا ہے جو گرینائیٹ کے وسیع ذخیرہ کی موجودگی میں اُبھرتا ہے۔ گرینائیٹ کے ذخیرے کی موجودگی (سنگِ سیاہ) اور قلبائی چٹان کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ دورِ حاضر کے طلباء کے لئے طبعی ہیئت اور تودہ ہائے یخ کے تفاعل بھی دل چسپی میں مزید اضافہ کا باعث ہے۔ اسی طرح کریوے، جو غرقاب وادیوں میں تشکیل ہوئے معلوم ہوتے ہیں، باعث دِل لگی ہیں۔ ان ہی کریوؤں نے جھیلوں کی تشکیل میں اہم کردار نبھایا ہے۔ زانسکار میں نیلم کی موجودگی ماہرِ معدنیات اور گوہر شناس کی دل چسپی کو دوبالا کرتی ہے۔ سوالوں کی اس کہکشاں میں ایک فوری نوعیت کا سوال وسطی حیاتی دور کشمیر سے متعلق ہیں کیوں کہ یہاں وہ کڑی ہاتھ آتی ہے جس کے سبب سے نمکین خطہ میں سمندروں کی تشکیل کی توضیح ہوتی ہے اس کی باقیات سپتی اور تبت کے بالائی علاقوں میں موجود ہیں اور جنوب مشرق میں دُور تک پھیلی ہوئی چمکدار برفیلی چوٹیوں پر محیط ہیں۔

کشمیر کے اس دل فریب علاقہ میں ہندوستانی ماہرِ ارضیات کے لئے اہم ترین چیز نباتاتی باقیات کی موجودگی ہے جن کا تعلق اشجار کی اُن اقسام سے ہے جو جزیرۂ ہند کے گنڈوانا خطہ کے درختوں سے مماثلت رکھتے ہیں۔ دس سال قبل کشمیر میں ان کی دریافت

تک گنڈوانا کی نچلی تہہ کی عمر بالواسطہ شہادت کی بنیاد پر متعین کی جاتی تھی۔اس کے لئے جزوی طور سلسلۂ نمکین کے برفستانوں اور گنڈ وانا کی نچلی تہہ کی ہم زمانیت اور جزوی طور آسٹریلیا اور افریقہ کے کوئلہ ذخیروں کی وسعت میں یکسانیت سے استدلال کیا جاتا تھا۔

وادی کشمیر کی سِلوری ترائیاں خاصی اہمیت کی حامل ہیں کیوں کہ یہاں ہمیں کوہِ نمکیں اور پیستی اور دوسرے تبتی سطح مرتفعوں میں پائے جانے والی (Water Fossils) کے باہمی رِشتوں کا پتہ چلتا ہے۔ یہ سطح مرتفع جنوب مشرق میں چمکدار برف پوش چوٹیوں کے عقب تک پھیلے ہوئے ہیں۔لگتا ہے کشمیر کبھی ان عظیم دریاؤں میں سے کسی ایک دریا کے دہانے پر واقع تھا جو کبھی گنڈوانا لینڈ کے قدیم برِ اعظم میں بہتا تھا اور تتھیاں (Tethys) نامی عظیم بحراعظم یوریشیا میں ,گرتا تھا۔ چونکہ اس عظیم بحرِ اعظم میں تشکیل شدہ ذخائر ہمیں اُن معلومات کا اہم حصّہ فراہم کرتے ہیں جن سے ہم طبقات الاض کا ترتیبی پیمانہ مقرر کرتے ہیں جو پیڑ پودے سمندر میں بہائے گئے، جو اِن نباتاتی انواع کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی ہندوستان کے خاص کوئلہ دور میں فراوانی رہی ہے۔اس طرح ہمیں گنڈوانا کے صاف وشفاف پانی کے ذخیرے کا تقابل بعد کے ادوار کے سمندری پانی سے کرنے میں مدد ملتی ہے۔ کشمیر کے جموں علاقے میں کوئلے کے ذخیرے پائے جاتے ہیں۔ کشمیر میں ورقی (Schistose) چٹانیں ملتی ہیں۔زانسکار میں۔ ۱۸۸۱ء میں نیلم کے ذخیرے کی دریافت کے بعد اس پر وقفے وقفے سے کان کنی کی جاتی رہی ہے۔

جواہرات کے بازاروں میں دستیاب قیمتی پتھر اسی علاقے سے حاصل کئے جاتے ہیں۔اس ذخیرے میں کھدائی کارے دارد والا معاملہ ہے کیوں کہ ایک تو یہ بہت ہی اونچی سطح پر ہیں اور دوسرے یہ کہ میدانی علاقوں سے بھی بعید تر ہے۔

بارشیں: جنوری تا فروری = 6.1 اِنچ

مارچ تا مئی = 6.5 اِنچ

جون تا ستمبر = 11.0 اِنچ

اکتوبر تا دسمبر = 2.4 اِنچ

آب وہوا:

لداخ موسمیاتی مطالعہ سے باہر ہے۔ اونچے ہمالیائی سلسلے مون سون کو یہاں آنے سے روکتے ہیں۔ بارش بہت کم ہوتی ہے۔ آبادی والے علاقے جو ۱۰،۰۰۰ سے ۱۴،۰۰۰ افٹ کی بلندی پر ہیں، وہاں زیادہ برف نہیں گرتی ہے۔ ہوا انتہائی خشک اور صاف ہے۔ مرکزی مقام لیہہ میں برف سمیت تین انچ بارش ہوتی ہے۔ اوسط درجہ حرارت ۴۳ فارن ہائیٹ ہے جو جنوری میں منفی ۱۹ اور جولائی میں ۶۴ ہوتا ہے۔ یہ اعدادوشمار اگرچہ ناقابل برداشت آب وہوا کی طرف اشارہ نہیں کرتے ہیں تاہم روزانہ درجۂ حرارت ۲۵ سے ۳۰ تک ہوتا ہے۔ ایک وقت منفی ۳ رڈگری بھی درج کیا گیا ہے۔ منفرد خشک اور صاف کرۂ ہوا میں آفتابی شعاؤں کی تاب کاری غیر معمولی ہوتی ہے۔ دھوپ میں تپتی چٹانوں پہ جہاں ہاتھ رکھنا مشکل ہوتا ہے تو چھاؤں میں یہی چٹانیں نہایت ٹھنڈی ہوتی ہیں۔

جڑی بوٹیوں، جھاڑیوں اور درختوں کے انواع واقسام ہمالیائی خطے کی خوبی ہے۔

چنار (Platanus orientalis) جو سِسلی جیسے دور دراز خطہ میں پایا جاتا ہے، کشمیر وادی کے دریائی راستوں میں شاندار پُر وقار حجم تک اُگتا ہے۔ ہمالیہ کے مغرب کی سمت بڑھتے ہوئے اگرچہ سجلیہ Orghids میں کمی واقع ہوتی ہے تاہم کشمیر میں شملہ کی پہاڑیوں کے مقابلے میں سوسنی کی بہتات ہے۔ کشمیر میں سرمار (Fritillary) میں خوب صورت تاجِ شاہی (Crown Imperial) پھول بھی قابلِ ذکر ہے۔

جنگلات:

کشمیر کے جنگلات وسیع وعریض اور قیمتی ہیں۔ ان میں پہاڑی، کوہساری اور میدانی جنگلات شامل ہیں۔ اول الذکر میں دیودار، کائر وسبز (Blue Pine) اور پائے

جاتے ہیں۔کل جنگلاتی رقبہ ۲۶۰۰ ہزار مربّع میل ہے۔

جنگلی جانوروں میں تبّتی ہرن (Antelop) یاک، ریچھ، شیر، بندر بھیڑیا، گیدڑ، بارہ سنگھا، مارخور، پہاڑی بکری اور چیتا پائے جاتے ہیں۔

پہاڑی شکارگاہوں میں لداخ کی شکارگاہیں قابلِ ذکر ہیں۔

آبادی: (۱۸۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق)۔ معلوم نہیں

۱۸۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۔ ۲۵،۴۳۹۵۲

۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۔ ۲۹،۰۵۵۷۸

۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق۔ ۳۱۵۸۱۲۰

فی مربّع میل آبادی ۱۳۸؍نفوس ہے۔

طاعون سے اموات کی شرح میں اضافہ باعثِ تشویش ہے، خاص طور خوب صورت مگر گندے شہر میں۔ اندھاپن اور سوزاک بھی عام ہے جس کی وجہ سات سرمائی مہینوں کے دوران تنگ وتاریک مکانوں میں گذر بسر کرنا ہے۔

زمینداری اکثریتی پیشہ ہے۔

صوبۂ جموں کے ڈوگرہ راجپوت اچھے سپاہی ہیں۔

مردم شماری سے معلوم ہوا ہے کہ کشمیری مسلمان، جن کی آبادی ۶۰ فی صد کی کل تعداد ۶۵۴۴۲ ۷ نفوس ہے۔ وہ اصل میں ہندو جاتیوں کی اولاد ہیں۔ خاص طور سے پہاڑی برہمنوں کی لیکن اسلام نے ان سے خاندانی تفریق ختم کردی ہے۔ سر والٹر لارنس ان کے بارے میں رقمطراز ہے: ''کشمیری پُر وقار مغل، تیز وطراز افغان اور سادہ لوح ہونے کے باوجود بھی غیر تبدّل شُدہ ہے۔ جنگجو اور حکمران آئے اور چلے گئے لیکن (کشمیریوں میں) کبھی احتجاجی ترکِ وطن یا معمول کے حالات میں گھر چھوڑنے کی خواہش نہ تھی۔ جنتِ نظیر وادی کے مقابلے میں بیرونی دینا ہر لحاظ سے کم تر تھی۔ اس لئے

کشمیری اپنی اپنی ایک خودمرکز زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔وہ مغرور، چالاک اور قدامت پسند ہیں۔ ہندو کشمیریوں کی تعداد ۵۵۲۷۶ تھی۔ جموں صوبہ میں زراعت پیشہ بکثرت ہیں۔ٹھاکر اور میگھ بیرونی پہاڑی آبادی کا اہم جزو ہیں۔اول الذکر اصلاً راجپوت ہیں لیکن انہوں نے بیشتر راجپوت رواج تج دیئے ہیں۔میگھ جلاہے اور کسان ہیں اور اونچی جاتیاں ان کو حقیر سمجھتی ہیں۔گجر مہاراجہ کی سلطنت میں مال مویشی چرانے والے لوگ ہیں ۱۹۱۱ء میں ان کی آبادی ۱۲۸۰۰۳ تھی۔

استور اور گلگت کے درد قبیلے:

استور اور گلگت کے لوگ درد ہیں۔اُن کی زبان شینا ہے۔ان کا دین اسلام ہے سر آرل سپن نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ درد نسل کے لوک زندہ دِل نہیں۔ ہندو کش تک درمیانی وادیوں میں آباد ہیں۔وہ کشمیری آبادی سے زبان اور شکل وشمائل سے مختلف ہیں۔درد میں ایسا کچھ نہیں کہ وہ عام ملاقاتی کی ہمدردی حاصل کر سکے۔اس کے پاس کشمیری کی ذہانت، مزاح اور خوبصورت خدوخال نہیں ہے۔اگر چہ مابعد الذکر سے کہیں زیادہ جری ہے لیکن اس کے پاس آزادنہ خیالات نہیں ہیں۔یہ خاص طور چیز ہے جو باوجود اس کی ناکامیوں کے ہمیں پٹھانوں کی طرف متوجہ کرتی ہے۔لیکن میں درد کو کبھی بھی اس سختی سے الگ ہوکر نہیں دیکھتا، اُس نے ہزاروں سال کشمکش میں گزارے ہیں جو اسے پہاڑی علاقہ کے بے رحم موسم اور بنجر زمین میں زندگی گزارتے ہوئے جھیلنی پڑی۔"

کنجوتی:

ہونزا کے کنجوتیوں کی اصلیت کے بارے غیر یقینیت پائی جاتی ہے۔اسی طرح اُن کی زبان کے رِشتے بھی معلوم نہیں ہیں۔

لداخ کی منگول آبادی:

لداخ اور بلتستان کی آبادی منگول نسل پر مشتمل ہے لیکن بلتی (۷۲،۴۳۹

نے اسلام قبول کیا ہوا ہے۔ وہ کثرت ازدواج کے بھی قائل ہیں۔ جبکہ لداخی ہنوز بدھ مت پر قائم اور تعدد زوج کے قائل ہیں۔

نسلی نظریئے:

ہندوستان کے لوگ (The People of India) میں سر ہربرٹ رِزلی نے باور کیا ہے کہ راجپوتانہ، تقریباً سارا پنجاب اور کشمیر کا بیشتر حصہ، چاہے ان کی ذات یا سماجی حیثیت کچھ بھی ہو، بعض استثناء کے باوجود، ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نسل کو وہ ہندآریائی کہتا ہے۔ شمال مشرقی اور کشمیر سے متصل علاقہ کے لوگ منگول نسل سے ہیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔

زبان:

۳۶۳۔۹۹۳ لوگ کشمیری بولنے والے ہیں۔ کشمیر کے مشرقی حصّہ کے لداخ اور بلتستان صوبوں میں منگول آبادی رہتی ہے جو تبّتی چینی بولی بولتے ہیں۔ خاص کشمیر کی زبان کشمیری ہے۔ استور، گلگت، چلاس، کشمیر کے مغرب میں چترال اور کوہستاں میں سوات وادی کے فراز میں شِنا کھووار شاخ کی بولیاں بولی جاتی ہیں مجموعی طور کو ہستانی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ شِنا اور کھووار آریائی شاخ سے تعلق رکھتی ہیں تاہم ان کی بنیاد غیر سنسکرتی مانی جاتی ہے۔ یہ بات بھی شدت سے کہی جاتی ہے کہ ہندی یا مغربی پنجابی پر، جو ہزارہ اور ڈیرا نمازی خان اور کشمیر کے جموں خطے میں بھی بولی جاتی ہے، میں بھی غیر سنسکرت یا پشاچی اجزاء موجود ہیں۔

مذہب:

کشمیر میں مسلمانوں کی تعداد کثریتی نہیں ہے۔ اعداد و شمار اس طرح ہیں۔

مسلمان........... ۲۳۹۸۳۲۰

ہندو.................. ۶۹۰۳۹۰

بُدھ.................. ۳۶۵۱۲

سِکھ.................. ۳۱۵۵۳

ہندوزیادہ جموں خطے میں ہیں جہاں قریب نصف آبادی اسی دھرم پر ہے۔ کشمیر، بلتستان، استور گلگت، چلاس اور ہونزا نگر کے لوگ مسلمان ہیں۔لداخی بُدھ ہیں۔

تعلیم:

پنجاب کی مقامی ریاستیں اور کشمیر برطانوی انتظام کے تحت صوبوں کے مقابلے میں تعلیمی اعتبار سے زیادہ پسماندہ ہیں۔آبادی مسلمان زراعت پیشہ ہے۔اس لئے ایسا ہونالازمی بات ہے۔

سڑکیں:

موری سے ٹانگہ سڑک جہلم وادی میں داخل ہوتی ہوئی کوہالہ کے مقام پر کشمیر میں پہنچتی ہے۔ یہاں سے اِسے دریائی نالے کے کنارے کنارے بارہمولہ اور وہاں سے سرینگر پہنچایا گیا ہے۔راولپنڈی سے سرینگر تک موٹر کار چلائی جاسکتی ہے۔

صنعت وحرفت:

ایرانی قالین کی عمدہ نقالی امرتسر اور سری نگر میں ہوتی ہے۔قالین باقی کشمیر کے ذوقِ ہنر کی داد دِلاتی ہے۔لکڑی پر کندہ کاری کے کام میں پنجاب کی کشمیر کے مقابلے ہیں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کشمیر پیپر ماشی کا کام اعلیٰ فن کارانہ صلاحیتوں کا غماز ہے۔اسی طرح چاندی پر نقش ونگاری کا کام بھی نہایت عمدہ ہے۔

تاریخی شواہد:

ہندو دور میں کشمیر کے تعلقات فارس، افغانستان اور ترکستان سے بہت قریبی تھے۔۳۲۷ قبل مسیح سے ۳۲۵ قبل مسیح کے دوران یونانی فاتح سکندر اعظم کے حملوں کے اثرات کشمیر پر بھی مرتّب ہوئے۔چنانچہ جہلم کے دونوں کناروں پر راجہ پورس کے ساتھ

سکندر کا سامنا تاریخ کا حصّہ ہے۔ کنشک نے ماہرینِ قوانین کی ایک کونسل کشمیر میں مقرر کی روایات پر سختی سے عمل پیرا ہیں۔ اس دوران اس نے چین، کاشغر، یارقند اور ختن تک فتوحات حاصل کیں۔ چین کے سفید ہُن بھی کشمیر کی سرحدوں تک پہنچ گئے۔ اُنہوں نے کشان حکومت کا خاتمہ کیا۔ ہن حکمرانوں میں مہر کل نے پنجاب پر حکومت قائم کی۔ ہُن حکومت کو ترک اور فارس حملہ آوروں نے ختم کردیا۔ ہیون سانگ، ہندوستان کی سیاحت پہ ۶۳۰ سے ۶۴۴ء تک تھا۔ اُس دور میں کشمیر کا راجا ٹیکسلا، اُراسا، پونچھ اور راجوری پر بھی حکومت کرتا تھا۔ اس کے بعد چینی حکمرانوں نے کشمیر پر اپنا سکہ قائم کیا۔ یاسین، سوات اور چترال تک اُن کا قبضہ رہا۔ ۷۳۳ء میں للتادتیہ مکتاپیڈ کو شہنشاہ چین سے اختیارات حاصل ہوئے۔ سات سال بعد اُس نے قنوج کے راجہ کو گنگا کنارے شکست دی۔ اس راجہ نے اپنا اسلحہ اتنی دور پہنچایا تو ضرور اُس کی مضبوط گرفت شمال پنجاب پر بھی رہی ہوگی۔ مارتنڈ مندر جو اُس نے سوریہ دیوتا کے لئے بنوایا، اس کی عظمت کی یادگار ہے۔ اگلے ۴۰۰ سالہ تاریخِ کشمیر ہندو راجاؤں کے تحت ناگفتہ بہہ لوگوں کی داستان ہے۔ اونتی ورمن (۸۵۵۔۸۸۳ء) محض ایک استثناء ہے۔ اس کے وزیر سُیا نے سیلابوں کی نکاسی اور تعمیراتی کام انجام دیئے۔

سلاطینِ کشمیر:

کشمیر میں ہندو راج بارہویں صدی کے وسط تک ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد مسلمان سلاطین کا سلسلہ چل پڑا۔ چودھویں صدی کے آخر اور پندرہویں صدی کے نصفِ اوّل تک سلطان سکندر اور زین العابدین (بڈشاہ) کے نام مشہور ہو گئے تھے۔ اکبر نے ۱۵۸۷ء میں کشمیر فتح کیا۔ اس کے جانشین دہلی سے لاہور اور پیر پنچال کے راستے خوش حال وادی میں داخل ہو کر گرمیوں کی لُو سے بچتے تھے۔ برنیر (Bernier) نے اورنگ زیب کے پہاڑی سفر کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ سفر اس نے ۱۶۶۶ء میں کیا تھا۔ اس

وقت اس کے کاروان کی تعداد تین لاکھ سے چار لاکھ بتائی گئی ہے۔

دہلی سے لاہور کے سفر میں دو مہینے لگے تھے۔ ملک کو اس سفر سے جو مالی بوجھ پڑا ہوگا اس انداز ہ کرنا ناممکن ہے۔ جہانگیر اپنی محبوب وادی، کشمیر میں فوت ہوا۔ اس نے دہلی سے لاہور تک سڑک کے کنارے درخت لگوائے۔ ہر کوس پر مینار (کوس مینار) کھڑے کئے جن میں بعض اب بھی موجود ہیں۔ اسی طرح اس نے متعدد مقامات پر سرائیں تعمیر کیں۔

ایسٹ انڈیا ۹ / مارچ ۱۸۴۶ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر ۷۵ لاکھ نانک شاہی سکوں میں کمپنی سے خریدا۔ شیخ امام الدین نے راجہ لاکھ سنگھ کے کہنے پر گلاب سنگھ کے قبضۂ کشمیر کی مخالفت کی۔

یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو ملکہ وکٹوریہ نے "قیصرِ ہند" کا لقب اختیار کیا جس کا اعلان دلّی کے ایک شاندار اجلاس میں کیا گیا۔ اس وقت کشمیر کا انتظام لیفٹنٹ گورنر کے زیر انتظام تھا۔ اب یہ براہِ راست حکومتِ ہند کے زیر انتظام آیا۔ اسی سال اور اس کے اگلے سال صوبے میں قحط سالی ہوئی۔ ۱۸۷۸ء میں یہیں سے فوجیں کابل وقندھار کی طرف روانہ ہوئیں۔ یہاں کے باربردار جانور (اونٹ) مال برداری کے کام آئے۔ اسی طرح یہاں کے لوگوں کی عسکری صلاحیت بھی بہت اہم رہی کیوں کہ یہیں ہندوستان کی فوجی بھرتی کا ایک بڑا علاقہ ہے۔ جنگ کا محاذ مئی ۱۸۷۹ء میں بند کر دیا گیا جب یعقوب خان خیبر، قرم، شتر گرداں پر اپنے حقوق سے دست بردار ہوا۔

سکّے:

محمد بن سام دلی میں پٹھان خاندان کی حکومت کا بانی کار تھا۔ اس کے جانشین کئی سلاطین ہیں۔ پٹھان اور مغل دور کے سکّوں پر عربی فارسی اسطور کندہ ہیں۔ لاہور، ملتان، حافظ آباد، کالانور، ڈیرہ جاٹ، پشاور، سری نگر اور جموں میں ضرّاب خانے قائم تھے۔ سکھ دور میں یہ ضرّاب خانے امرتسر، لاہور، ملتان، ڈیرا، آنند گڑھ، جھنگ اور کشمیر میں تھے۔

ریلوے:

ہزارہ ضلع کے انتظامی معاملات اور ترقیات کے ضمن میں مصنّف سر جیمز ڈوئی نے امید جتائی ہے کہ "سرائے کالا سے سرینگر ریلوے لائن ہزارہ سے گزرے گی۔"

جدید تاریخ:

کشمیر خطۂ ارضی کی جغرافیائی خصوصیات اور قدرتی مناظر کا کچھ ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ اس کا رقبہ پنجاب ماسوائے انبالہ حصّہ کے برابر ہے جہاں مہاراجہ کشمیر کی حکومت ہے۔ سخت گیر سِکھ حکومت بھی دُرانی گونروں کی حکومت کے مقابلے میں راحت کا باعث ثابت ہوئی ہے۔ درّانیوں نے مغلوں کے بعد حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ مغلوں کے ماتحت چھوٹے چھوٹے راجواڑے جموں کی پہاڑیوں میں باقی رہ گئے تھے۔ جموال راجاؤں کا رنجیت سنگھ کے ہاتھوں وہی حال ہوا جو کانگڑہ کے راجاؤں کا ہوا۔ جموں کے شاہی محل کے تین سپاہ سالار برادران دھیان سنگھ، سچیت سنگھ اور گلاب سنگھ اُس کے دربار کے اہم آدمی تھے۔ ۱۸۲۰ء میں اس نے گلاب سنگھ کو جموں کا راجہ بنایا۔ وہ بڑے مقاصد کی حصول یابی کے اہل تھا۔ بیس برس میں اُس نے اپنے آپ کو بھدرواہ، کشتواڑ، لداخ اور بلتستان کا مالک بنایا۔ کشمیر، جس کو انگوٹھی میں نگینے کی حیثیت تھی، کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ آخر اس ہیرے کو سِکھ لڑائی کے اختتام پر برطانوی حکومت کے ساتھ معاہدے کے تحت ۷۵ لاکھ (نانک شاہی) سکّوں میں خرید کر اپنے قبضے میں لایا۔

مُزتاگھ اور قراقرم پہاڑوں کے عقب میں غیر آباد اور غیر معروف علاقہ جس کا پانی شمال کی طرف وسطِ ایشیاء کی جانب بہہ جاتا ہے، کشمیر کی ساری سلطنت چناب، جہلم اور سندھ کی وادیوں پر مشتمل ہے۔ آخر الذکر وادی تین چوتھائی رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ جموں کے مغرب میں نہایت پہاڑی علاقہ ہے جہاں چھوٹی چھوٹی ندیوں کے منبعے پائے جاتے ہیں جو راوی میں بہتی ہیں۔

خِطّوں کی تقسیم:

مندرجہ ذیل بڑے خطّے قابلِ ذکر ہیں:

ا۔وادیٔ چناب......(ا) ہموار اور کنڈی نشیبی پہاڑیاں

(ب) کشتواڑ اور بھدرواہ کے بالائی میدان

۲۔وادیٔ جہلم......(ا) وادیٔ کشمیر اور متصلہ کریوے اور پہاڑیاں

(ب) بارہمولہ سے آگے کا نالہ اور وادیٔ کشن گنگا

۳۔وادیٔ سندھ......(ا) لدّاخ بشمول زانسکار اور اُپ شو

(ب) بلتستان

وادیٔ چناب......(ا) ہموار اور کنڈی...... یہ خطہ جہلم کے کناروں پر میر پور سے ہوتے ہوئے راوی کے پاس کٹھوعہ اور مادھوپور میں بڑی دوآب نہر کے دہانے تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ خطہ پنجاب کے اضلاع جہلم، گجرات، سیالکوٹ اور گُرداس پور کی حدود سے متصل ہے۔اس میں جموں صوبہ کے ضلع میر پور، ریاسی، جمّوں، جسروٹا اور پانچویں ضلع ادھم پور کا کچھ حصہ شامل ہے۔میدانی علاقہ مرطوب اور غیر صحت مند ہے۔اس کے عقب میں ناہموار خطہ اگرچہ پہاڑی، پتھریلا اور خشک سرخ مٹی پر مشتمل ہے مگر وہاں پر یہ پریشانی نہیں ہے۔ یہاں قدرتی طور گارنا، ساناتن اور بھیکر پائے جاتے ہیں۔کنڈی زمینوں کا بالائی خطہ میں کشتواڑ اور جاگیر بھدرواہ شامل ہیں۔بارشیں خوب ہوتی ہیں۔نہروں سے بھی آب پاشی کی جاتی ہے۔سطحِ مرتفع اور نکاسی آب وہوا کو صحت افزا بناتے ہیں۔اونچائی والے علاقوں میں برف باری اور سرد ہوائیں بعض دفعہ فصلوں کو پکنے میں مانع ہوتی ہیں۔ کشتواڑ اور بھدرواہ خشخاش کی کاشت ہوتی ہے۔کشتواڑ اُدھم پور ضلع کا حصہ ہے۔

وادیٔ جہلم:

(ا) وادیٔ کشمیر اور متصلہ تنگ وادیاں اور پہاڑ: یہ خطّہ وادیٔ کشمیر میں

دریائے جہلم کے منبع ویری ناگ سے بارہمولہ تک پھیلا ہوا ہے۔اس میں نہ صرف وادئ کشمیر، جو اسی میل لمبی اور بیس سے پچیس میل تک چوڑی ہے شامل ہے بلکہ اس میں وہ چھوٹی وادیاں ہیں جن کی نِکاسی اس (جہلم) میں ہوتی ہے اور اس کو گھیرے ہوئے پہاڑ بھی شامل ہیں اس لئے اس علاقہ میں آب پاشی سہولیات والے دھان کے کھیت ہیں اور پہاڑی ڈھلوانوں پر باجرہ اور تبّتی جَو اُگتی ہے۔انتظامی اکائیاں وزارت یا ضلع جنوبی کشمیر اور شمالی کشمیر جنوبی حصہ پر مشتمل ہیں۔وسط وادی چھ ہزار فٹ کی بلندی تک ہے۔بلاشبہ یہ کبھی کسی جھیل تھاہ تھی۔پہاڑیوں کے دامن میں پنکھا نما پھیلے ہوئے کریوے ہیں۔ کشمیریوں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ زرخیز کالی مٹی میں پہاڑی ندیوں کے کناروں پر بچھائی تلچھٹ والی زمینوں میں جتنی ممکن ہو سکے اتنی دھان اُگائیں۔کھاد اور سینچائی کی سہولیات بکثرت موجود ہیں جن کا بھرپور استعمال ہردل عزیز فصل اُگانے میں ہوتا ہے۔جہلم سے بازیافتہ بھرائی کی ہوئی زمینوں میں مکّی کی کثیر پیداوار ہوتی ہے۔گیہوں اور باجرے کی پیداوار میں اُتنی ہی لاپرواہی بھرتی جاتی ہے جتنی دِل چسپی چاول کی کاشت میں بھرتی جاتی ہے۔ٹیلوں پہ زعفران کی کاشت بہت مشہور ہے۔اب یہ علاقہ محدود ہے کیوں کہ ۱۸۷۷ء کے قحط میں لوگوں نے اِس کی ڈنٹھل کو چٹ کر ڈالا اور اب اس کی بھرپائی کی رفتار سست ہے۔زعفران کا استعمال مذہبی شناخت کے طور پر ٹیکا لگانے اور مصالحے کے طور پر ہوتی ہے۔ ڈل جھیل پر ڈولتے ساگ زار ایک عجیب تماشہ ہیں۔جھیل کے کناروں پر زرخیز دلدلی زمینیں بازار کے سبزی فروشوں کے فن کی ضمانت ہیں۔وہ زرعی زمین کا پارچہ بیدوں کی فصیل میں لاتا ہے۔اس میں خودرو پودے اور کیچڑ بھر دیتا ہے۔یہ ہائز (ہانجی) ذات کا کشتی ران ہے جس کی سماجی حیثیت بہت بلند ہے۔وہ خود اپنی اگائی ہوئی سبزیاں آبی راستے سے سری نگر کے بازاروں میں پہنچاتا ہے۔کشمیر میں میوے کی پیداوار بہت زیادہ ہے۔اس لئے کشمیر تک ریلوے کی تعمیر و ترقی کی رفتار اور تجارت میں اضافے کا

باعث ہوسکتی ہے۔ اس سے ریشم کی پیداوار کے امکانات بھی روشن ہوسکتے ہیں۔

(ب) جہلم نالہ اور وادیٔ کشن گنگا:

بارہمولہ سے آگے جہلم تنگ نالے کی صورت اختیار کرجاتا ہے اس لئے کھیت سیڑھی نما ہیں۔ دریائے کشن گنگا مظفر آباد میں جہلم سے آملتا ہے۔ مظفر آباد ضلع، جہلم نالہ اور کشن گنگا وادی کے پائین حصے پر مشتمل ہے۔ بالائی حصہ شمالی کشمیر کے ضلع کی اُتر مچھلی پورہ تحصیل پر مشتمل ہے۔

وادی سندھ:

(ا) لداخ بشمول زانسکار اور رُپ شو: اس کو رُپ شو، زانسکار اور خاص لداخ جس کا مرکز لیہہ ہے، حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ رُپ شو سطح سمندر سے ۱۳۵۰۰ فٹ سے زائد بلندی پر واقع کھاری پانی کی جھیلوں کا دشت ہے۔ اس بلندی پر کاشت کاری واقعی دشوار ہوگی۔ تاہم کسی قدر کے تبتی باجرہ اُگایا جاتا ہے۔ قلیل آبادی صرف گلہ بانوں پر مشتمل ہے۔ لداخ میں لوگ گلہ بان چمپاؤں الپائن کی چراگاہوں میں خانہ بدوش پھرتے ہیں اور لداخی، جو دریائی وادیوں میں دست یاب پارچۂ ہائے اراضی میں محنت مشقت سے کاشت کرتے ہیں۔ اگرچہ دونوں طبقے بدھ مت کے پیروکار ہیں تاہم باہم شادی نہیں رچاتے ہیں۔ زانسکار رُپ شو کے شمال مغرب میں اِسی نام کے دریا سے مِلتا ہے جو لیہہ سے پہلے ہی دریائے سندھ میں گرتا ہے۔ یہ کرگل تحصیل کا حصہ ہے۔ زانسکار ایک دشوار گزار اور ناقابلِ رسائی خطۂ ارضی ہے جہاں مویشی اور انسان سال کے چھے مہینے گھروں کے اندر بند رہتے ہیں۔ یہاں کے خچروں کی نسل بہت مشہور ہے۔ لداخ میں زراعتی زمین ۹۰۰۰ فٹ سے ۱۵۰۰۰ فٹ تک ہے۔ ریتلی زمین کو کھاد دے کر سینچنا پڑتا ہے ۔ اکثر پہاڑی ڈھلوانوں کی تازہ مٹی کے اس کی اوپری سطح پر تہہ بچھا دیتا ہے۔ خریف فصلوں میں گیہوں، جو، سرسوں، ادرک، راجماش اور مٹر ہیں جبکہ ربیع فصلوں میں سخت جو، باجرہ

اور کدو ہیں۔ تعمیراتی لکڑی اور بالن کی شدید قلّت ہے۔ بالن کی کمی پورا کرنے کے لئے گوبر جلایا جاتا ہے۔ سخت کوش ہونے کے باوجود لوگ خوش مزاج اور خوش حال ہیں۔ کیونکہ کثیر زوجی رسم نے آبادی کے تناسب کو برقرار رکھا ہے۔

(ب) بلتستان:۔ بلتستان لدّاخ کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ زمین پر بہت دباؤ ہے۔ یہ بہت خوش مزاج لوگ ہیں اور پولو (گھڑسواری) کے بہت شوقین ہیں۔ عیال پالنے کے لئے مرد لیہہ اور گلگت کی سڑکوں پر بار برداری کا کام کرتے ہیں اور چراگاہوں میں گلہ بانی کرتے ہیں۔ یہ آبپاشی نہروں کی دیکھ بال کرتے ہیں، سیڑھی نما کھیتوں کی منڈیروں کی مرمت کرتے ہیں اور ہل جوتتے ہیں۔ کھیتی باڑی کا باقی کام عورتوں کے ذمہ ہے۔ موسم بہت ہی سخت ہے اور اکثر ندیاں سردیوں میں منجمد رہتی ہیں۔ اس کے برعکس سندھ کے کنارے اسکردو کا میدان (۷۲۵۰ فٹ) اور آگے مغرب میں روندو نالہ جولائی اور اگست میں سخت گرمی کا سامنا کرتے ہیں۔ ۱۳۰۰۰ فٹ کی بلندی پر کشمیر جانے والی سڑک پر دیوحال کے خوف ناک حجری میدان ہیں۔ پیداوار اور فصلیں وہی ہیں جو لدّاخ میں ہیں۔ میوہ بکثرت اُگتا ہے۔ خوبانی کی اچھی خاصی مقدار برآمد کی جاتی ہے جس سے کافی منافع کمایا جاتا ہے۔ لدّاخ اور بلتستان کو ملا کر لدّاخ وزارت بنائی گئی ہے جو تین تحصیلوں پر تقسیم کی گئی ہے۔ لدّاخ، کرگل او راسکردو۔

(پ) استوار اور گلگت:۔ جہاں کشمیر سے آنی والی سڑک درّہ برزل (۱۳۰۰۰ فٹ) سے نشیب کی طرف جاتی ہے، ہیں سے استور کا وسیع خطّہ شروع ہوتا ہے۔ اِس کی نِکاسی استور ندی کرتی ہے جو آگے چل کر بنجی کے مقام پر دریائے سندھ میں ملتی ہے۔ اس اس پر رام گھاٹ کے مقام پر بنا ہوا پل سطح سمندر سے صرف ۳۸۰۰ فٹ بلند ہے۔ خود استور قریہ ۷۸۵۳ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ پیداوار وہی ہے جو بلتستان میں ہے۔ یہ

دشت نہایت تنگ ہے جو سندھ پار کر کے بدل جاتا ہے اور وہاں بلند و بالا پہاڑی چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ زرعی زمین بہت زرخیز ہے۔ چاول، مکّی، جو، باجرہ، روئی، گیہوں، سرسوں اور ادرک کی پیداوار ہوتی ہے۔ ہندوستان سے گلگت تک ہزارہ میں کانمان وادی کی بلندی پر بابوسر درّہ کے اوپر سے دوسری سڑک ہے۔ لیکن ڈاک رسانی کشمیر کے راستے سے ہوتی ہے۔ استوری اور گلگتی سادہ بودوباش والے لوگ ہیں اور بلتیوں کی طرح گھڑسواری کے بہت شوقین ہیں۔ ایک برطانوی سیاسی ایجنٹ گلگت میں قیام پذیر ہے۔ وہ حکومتِ ہند (برطانوی سامراج) کے سامنے ہونزا نگر، یاسین اور چلاّس کے پاس پڑوس میں قائم چھوٹے راجواڑوں کے انتظام وانصرام کے بارے میں جواب دہ ہے۔ ہونزا اور ناگر مزتاگھ اور ہندوکش سلسلۂ کوہ کے شمال میں واقع ہے۔ یاسین دریائے گلگت کے بالائی کناروں پر دُور مغرب میں واقع ہے۔

استور اور گلگت میں بھی گلاب سنگھ کی ڈوگرہ فوج نے سکھ فوج کو نکال باہر کیا مگر دریائے سندھ کے اُس پار گلاب سنگھ کی حکومت کبھی مضبوط نہ ہو سکی۔ ۱۸۵۲ء کے بعد یہی دریا اس کے لئے حدّ فاصل رہی۔ وہ ۱۸۵۷ء میں انتقال کر گیا۔ اس نے اپنے آپ کو سخت کوش قابل اور کامیاب حکمران ثابت کر دیا۔ اس کا بیٹا رنبیر سنگھ نسبتاً اچھا آدمی اور اچھا حکمران تھا۔ وہ اچھا ہندو، روادار اور علم دوست تھا۔ اس کے پاس بددیانت عہدہ داروں کو قابو میں کرنے کی استطاعت تھی۔ نتیجہ کے طور پر لوگوں کو بہت بعض مشکلات جھیلنا پڑیں۔ وہ غدر (۱۸۵۷ء) میں باضابطہ شریکِ کار تھا۔ ۱۸۶۰ء میں اُس کی فوجوں نے گلگت پر دوبارہ قبضہ کیا۔ یہ فتح کئی سال تک اُس کے عوام کے لئے باعثِ پریشانی رہی۔ موجودہ راجہ مہاراجہ پرتاب سنگھ بی، سی، ایس، آئی ۱۸۸۷ء میں جانشین بن گیا۔ اس کے بھائی راجہ امر سنگھ نے کشمیر معاملات میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۵ء تک ایک مختصر کونسل نے انتظامیہ چلائی جس میں ۱۸۹۱ء کے بعد مہاراجہ صدر اور راجا امر سنگھ نائب چیف منسٹر،

داخلی معاملات کا وزیر اور وزیر مالیات ہیں۔ عدلیہ کا سربراہ ایک ہائی کورٹ جج ہے۔ سزائے موت کی منظوری مہاراجہ ہی دے سکتا ہے۔ انتظامی عاملین گورنر جموں، گورنر کشمیر اور وزیرِ وزارت لداخ وگلگت ہیں۔ جموں اور کشمیر کے آٹھویں ضلعے ایک وزیر وزارت کے ماتحت ہیں۔ مال، زمین اور جنگلات کے بندوبست کے لئے برطانوی آفیسروں کی خدمات ریاست کو فراہم کی گئی ہیں۔ سری نگر میں حکومتِ ہندوستان (برطانوی راج) کی نمائندگی ریذیڈنٹ کررہا ہے۔ ایک سیاسی اہلِ کار گلگت میں وزیر وزارت کے کام کی نگرانی کرتا ہے۔ موجودہ مہاراجہ کی حکومت میں متعدد اصلاحات نافذ کی گئی ہیں۔ گلگت سڑک کی تعمیر سے اس جانوں کی قربانی (بیگار) کا سلسلہ بند ہو چکا ہے جو اُس دور افتاد چھاونی تک سامان پہنچانے کے دوران پہلے دینی پڑتی تھی۔ زرعی و مالی اصلاحات سے جنس کے تبادلے کی جگہ نقدی کا لین دین شروع ہو چکا ہے اور انسانی حقوق کی پامالی کو ختم کیا گیا ہے۔ دفتری بے ضابطگی اور دھونس دباؤ کا خاتمہ کر دیا گیا ہے تاہم اگر نگرانی ڈھیلی پڑ گئی تو یہ دوبارہ سر اُٹھائیں گے۔ مختلف قوموں پر حکومت کرنا مہاراجہ کے لئے آسان ہے ان کے ساتھ حکمت سے پیش آیا جائے اور اگر وحشیانہ جرائم کی بیخ کنی کی جائے۔

سری نگر:

مہاراجہ کشمیر کا دارالحکومت بہت ہی خوبصورتی سے دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر آباد ہے جو سطحِ سمندر ۵۲۵۰ فٹ بلند ہے۔ اس کے شمال میں ہاری پربت یا وِشنو پربت جس پر مغل بادشاہ کا تعمیر کردہ قلعہ ہے اور خوب صورت ڈل جھیل ہے۔ ہر سیّاح کی تمنّا رہتی ہے کہ وہ کشتی میں سوار ہو کر اس کے پُرسکون پانی پر نسیم باغ تک سیر کرے جہاں قطار اندر قطار چنار ایستادہ ہیں۔ شہرِ خاص اور ڈل کے بیچ میں رام منشی باغ ہے جس کے قریب ریذیڈنسی کے سمیت دیگر یورپی لوگوں کے بنگلے ہیں۔ دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ خوبصورت درختوں کی قطاریں ہیں جن کے ساتھ ہاوس بوٹ بندھے ہوئے

ہیں اِس سے یہ رہائشی علاقہ نہایت دل کش بنا ہوا ہے۔ مغرب میں تختِ سلیمان کی بلندی پر ایک چھوٹا مندر ہے جس کی بنیادی دیواریں بہت پرانی ہیں۔ شہر کے بیچوں بیچ بہت سی متعفن نہریں بہتی ہیں۔ شہر کے مکانات قریب قریب اور لکڑی کے بنے ہوئے ہیں۔ ان پر گھاس پھوس کی چھت بنی ہوئی ہے۔ گندے بیت الخلاء بار بار آگ لگنے سے ختم ہو گئے ہیں اور کالرا بیماری پھوٹ پڑنے سے جانوں کا اتلاف ہوا ہے۔ شہر کا بڑا حصہ دریائے جہلم کے بائیں جانب آباد ہے۔ سیلانی جب کشتی میں سوار ہو کر آبی راستے سے منشی باغ ہوتے ہوئے دل کش لکڑی سے بنے پُلوں کے نیچے سے گذرے گا اور مندروں اور مسجد (خانقاہ) شاہِ ہمدان کا نظارہ کرے گا تو وہ اُس کی پوری طرح تشفی ہوگی۔ دریائے جہلم کے بائیں کنارے پہلے پُل کو پار کرنے کے بعد شیر گڈھی ہے جہاں مہاراجہ کے محلّات اور سرکاری دفاتر ہیں۔ اس کے مدِ مقابل دوسرے کنارے پر ایک خوبصورت گھاٹ یا (دریا) میں نہانے کی مخصوص جگہ ہے جہاں پتھر کی سیڑھیاں ہیں۔ تیسرے اور چوتھے پل کے درمیان دریا کی دائیں طرف شاہ ہمدان کی مسجد (خانقاہ) ہے۔ اِس تعمیراتی لکڑی پر نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ اس کا طرزِ تعمیر بدھ طرزِ تعمیر سے مِلتا جُلتا ہے جو عام ہندوستانی مساجد کے طرزِ تعمیر سے پوری طرح مختلف ہے۔ اس کے سامنے دوسری جانب پتھر مسجد ہے جو فی الوقت سرکاری اناج گودام ہے۔ یہ نور جہاں نے تعمیر کرائی تھی اِسی لئے اسے مسلمانوں نے استعمال نہیں کیا۔ جامع مسجد شمال کی جانب ہے مگر یہ دریائے (جہلم) کے کنارے نہیں ہے۔ بڈشاہ زین العابدین کا مقبرہ چوتھے پل سے آگے ہے۔ اِس پر اُس کا نام تحریر ہے۔ اسی علاقے میں قالین فروشوں کی بڑی بڑی دُکانیں، کاری گری مصنوعات کی دکانیں اور مِشن اِسکول ہے۔ اِن میں سے آخر الذکر اس اعتبار سے دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ تعلیم کس طرح غیر اہل کو اہل بنا سکتی ہے۔

اہم مقاماتِ کشمیر و جموں

۱۔ بارہمولہ: نالہ جہلم کے اُس سرے پر واقع جہاں سے وادی شروع ہوتی ہے۔ جو سیاح سے سری نگر جانا چاہتے ہیں وہ یہیں سے ڈونگے میں بیٹھتے ہیں۔ سفیدوں کے درمیان عالی شان بارہمولہ تا سری نگر ہے۔ مگر گلمرگ کی سڑک بہت خراب ہے۔

۲۔ چلاس

۳۔ گلمرگ:

یہ یورپیوں کے عمدہ گرمائی سیاحتی مقام ہے۔ یہاں مہاراجہ کا ایک محل ہے۔ جنگلات کا نظارہ دل کش ہے۔ خاص طور سے کھلن مرگ کی طرف جہاں تک درخت کھڑے ہیں۔ گالف کا خوبصورت اور عمدہ میدان ہے۔

۴۔ گریز۔ مشرق۔ یہ ایک خوبصورت وادی ہے۔ یہاں کا پانی کشن گنگا میں بہتا ہے۔ یہ بانڈی پورہ اور گلگت راستہ پر واقع درہ بُرزل کے درمیان موجود ہے۔

۵۔ ہونزا: مشرق۔ ہونزا چند دیہات پر مشتمل ہے۔ یہاں راجہ (یا تھام) کا قلعہ ۷۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔ یہ راکاپوشی سے بالکل صاف دِکھائی دیتا ہے جو یہاں سے بیس میل دُور ہے۔ یہ پُر وقار برفیلی چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے جن کے سلسلے کو مقامی زبان میں "بوا یو ہا گھر دُونا سرو" (یعنی سرپٹ دوڑتے گھوڑے کی چوٹی۔)

۶۔ اسلام آباد: مشرق۔ سری نگر سے تقریباً چالیس میل دور دریا کے کنارے اُس مقام پر جہاں سے جہلم میں کشتی رانی ممکن نہیں آباد ہے۔ اَچھ بل اور مارتنڈ کی سیر یہاں سے آسان ہے۔ اِسی علاقہ میں لدر نالہ کا منبع اور پہلگام ہیں۔ یہ ایک گندہ اور بے ترتیب جگہ ہے۔

جموں:۔ جموں صوبہ کا دارالخلافہ اور مہاراجہ کی سرمائی قیام گاہ سڑک کے ذریعے سیالکوٹ سے جُڑا ہوا۔ دریائے راوی کے نشیب سے بلندی کی طرف واقع۔ سفیدی کئے

ہوئے مندروں کے گلشن دل کش نظر آتے ہیں۔ یہ قصبہ آج کی نسبت ماضی میں کہیں زیادہ خوشحال تھا۔

لیہہ: لدّاخ کی راجدھانی۔ دریائے سندھ کے کنارے سطح سمندر سے ۱۱۵۰۰ فٹ بلندی پر ہے۔ ہندوستان اور یارقند کے قافلوں کی ملاقات کی جگہ۔ وسطِ ایشیاء کے قافلے موسمِ خزاں میں پہنچتے ہیں جب سفیدوں کی قطاروں سے گھرا ہوا تاریخی بازار لگتا ہے وزیرِ وزارت کا صدر دفتر یہیں ہے۔ گارے سے بنے قلعے میں اناج کا گودام بھی یہاں ہے۔ راجہ گیال پو کا قدیم محل قصبہ کے اوپر چٹانوں کے ایک بڑے ڈھیر کی مانند ہے۔ لیہہ میں موراوین (Moravian) اور رومن کیتھولک مشن ہیں۔

مارتنڈ: یہاں سوریہ دیوتا کے مندر کے قابلِ توجہ کھنڈرات ہیں۔ یہ مقام اسلام آباد سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔

پایر (Payer): یہ مقام سری نگر سے اُنیس میل دور ہے۔ یہاں ایک خوب صورت اور سجا سجایا سوریہ دیوتا کا مندر ہے جو پانچویں صدی سے تیرہویں صدی کے زمانے کی تعمیر ہے۔

پونچھ:۔ یہ پونچھ سمندر سے ۳۳۰۰ فٹ بلند ہے۔ اناج اور گھی کی بہت تجارت ہوتی ہے۔ عمدہ سڑکیں پونچھ کو راولپنڈی اور کشمیر میں ٹانگہ سڑک کے ساتھ ملاتی ہیں۔ کشمیری لوگ پونچھ کو پرونژھ کہتے ہیں۔ اس کا قدیم نام پارنوتزھ تھا۔

اسکردو:۔ یہ بلتستان کی قدیم راجدھانی ہے۔ یہ سطحِ سمندر سے ۷۲۵۰ فٹ بلندی پر ہے۔ دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر ۵ میل چوڑے ریتلے نشیبی طاس میں یہ علاقہ واقع ہے۔ اسکردو میں تحصیل دار کا دفتر ہے۔

نوٹ: اس کے بعد کتاب میں آبادی، پیداوار، رقبہ وغیرہ کے بارے میں شماریات کی ایک طویل تفصیل ہے جو دراصل اِسی کتاب کی مندرجات سے ماخوذ ہیں۔

اس لئے اِن شماریات کو یہاں نقل کرنا غیر ضروری ہے۔ ہم پہلے ہی اِن سے واقفیت بہم پہنچا چکے ہیں۔

کتاب میں انڈیکس (Index) پر مشتمل کئی صفحات آخر پر شامِل ہیں جن میں کتاب کی بیشتر لفظیات انگریزی حروف تہجی کی ترتیب سے درج ہیں۔ ہم اُردو میں اِس کی ترتیب کو قائم نہیں رکھ سکتے اور چونکہ ہم نے کتاب کی کشمیر سے متعلق مندرجات کو ہی منتخب کیا ہے اِس لئے یہ لفظیات ہمارے لئے ضروری بھی نہیں ہیں۔ اِن ہی وجوہ سے اِس Index سے بھی صرفِ نظر کیا گیا ہے۔

..................☆☆☆..................

محب الحسن

تلخیص وترجمہ: علی حماد عباسی

کشمیر میں دَورِ سلاطین کا نظم ونسق

کشمیر میں سلطنت کے نظم ونسق پر کوئی مستند رسالہ یا کتاب موجود نہیں ہے اور تاریخوں میں متفرق حوالوں کی مدد سے وادی میں سلاطین کے عہد میں نظم ونسق کی کوئی جامع تصویر پیش کرنا دشوار ہے، اس لئے صرف اس کا اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

جو شہادتیں ہمارے سامنے ہیں، اُن سے تو یہی ظاہر ہے کہ شاہ میر اور اس کے جانشینوں نے ہندو راجاؤں کے سرکاری نظام کو نہیں بدلا بلکہ انہوں نے نظم ونسق کو مضبوط اور مستحکم بنایا۔ اس طرح کسانوں کو حریص اہلکاروں سے بچانے، زراعت کو ترقی دینے، باغی سرداروں کو مغلوب کرنے اور امن واماں قائم کرنے کی کوشش کی۔ سلطان سکندر کے زمانہ سے ایرانیوں اور ترکوں کے اثرات پیدا ہوئے۔ اس لئے مسلم ممالک کے طرز پر یہاں کے نظم ونسق کو بھی چلانے کا رجحان پیدا ہوا۔ اس طرح بہت سے نئے دستور پرانے دستور کی جگہ پر آگئے، یوں تو چھوٹی چھوٹی نئی باتیں سلاطین کے آخری دور تک وجود میں آتی رہیں لیکن نظم ونسق کے ارتقاء کے اہم خط وخال سلطان زین العابدین ہی کے عہد میں

نمایاں ہوئے۔

سلطان

اپنے پیش رووں کی طرح کشمیر کا سلطان مطلق العنان ہوتا تھا، ...... وہ نظم و نسق، قانون سازی اور عدل وانصاف کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا، وہ قانون بنا سکتا تھا اور شرعی قوانین کی تصریح کرسکتا تھا وہ خود اپنا سپہ سالار بھی ہوتا، اور جنگ میں یا تو خود جاتا، یا اپنی جگہ کسی کو سپہ سالار بنا کر بھیجتا۔ وہ اپیل کی سب سے بڑی عدالت ہوتا اور اس کو رعایا کی موت اور زندگی پر اختیار ہوتا۔

سلطان کے ساتھ وزیروں اور اعلیٰ عہدہ داروں کی ایک مجلس بھی ہوتی تھی جس سے وہ نظم ونسق، خارجی اموراور صلح وجنگ کے مسئلوں پر مشورہ لیتا تھا۔ اگرچہ قطعی فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہوتا۔ لیکن مجلس کے سارے اراکین طاقت ور جاگیردار خاندانوں کے ہوتے تھے جس کی وجہ سے سلطان مطلق العنان نہیں بن سکتا تھا، ورنہ مجلس کی حکومت سے ملک کی بہبود وترقی ممکن نہیں ہوتی اگر سلطان کمزور ہوتا تو اصل طاقت امراء کے ہاتھ میں ہوتی۔ یہی امراء مجلس کے ارکان بھی ہوتے، وہ جس کو چاہتے تخت پر بٹھاتے اور جس کو چاہتے معزول کردیتے۔ جنگ یا صلح کا اعلان کرتے اور کبھی تو مملکت کو آپس میں تقسیم بھی کرلیتے، ان کی زبردست طاقت ملک کے لئے سودمند ثابت نہ ہوتی کیونکہ اس بات سے نہ صرف مضبوط مرکزی حکومت کے قیام میں رکاوٹ پیدا ہوجاتی بلکہ سازشوں، حکومت حاصل کرنے کے لئے مستقل ریشہ دوانیوں، خانہ جنگیوں اور بغاوتوں کا باعث ہوجاتی، جو خاندانِ لوہر کے دورِ حکومت میں ہوا کرتی تھی۔

شریعت کے معمولی امور میں سلطان شیخ الاسلام سے مشورہ لیتا تھا لیکن اگر کوئی اہم مسئلہ ہوتا، تو وہ ملک کے تمام ممتاز فقہاء کو بلاتا اور ان سے مشورہ طلب کرتا، مرزا حیدر

نے نور بخشیہ فرقہ کو ممنوع قرار دینے اور اس کے اہم سربراہوں کو سزائے موت دینے سے پہلے ایسا ہی کیا تھا اسی طرح علماء سے مشورہ کر کے حسین شاہ چک نے یوسف اور بعد میں قاضی گنائی اور قاضی الماس کی پھانسی کا حکم دیا تھا۔

اقتدارِ اعلیٰ کے امتیازات

ان اختیارات کے علاوہ سلطان کے کچھ خاص حقوق ہوتے تھے جن سے وہ امراء اور اپنی رعایا سے ممیّز ہوتا۔ یہ حقوق عوام میں اس کا وقار بڑھاتے اور دبدبہ قائم رکھنے کے لئے ضروری تھے۔

(الف) لقب، شاہ میر اور چک خاندان کے تمام حکمرانوں نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ دوسرے عام القاب شاہ، بادشاہ اور سلطان الاعظم تھے۔ اس کے علاوہ ہر ایک حکمران نے کچھ خاص القاب بھی اختیار کئے۔ سلطان زین العابدین اپنے آپ کو نائب امیر المومنین اور غازی چک اپنے کو ہمایوں کہتا تھا۔ سلطان حسین شاہ چک نے نصیر الدین پادشاہ غازی کا لقب اختیار کیا اور یہی لقب یوسف شاہ نے بھی برقرار رکھا لیکن علی شاہ اپنے آپ کو ظہیر الدین محمد علی پادشاہ کہتا تھا یعقوب شاہ نے اسماعیل شاہ کا لقب اختیار کیا، ظاہر ہے کہ چک حکمرانوں نے یہ القاب ہندوستان کے مغل شہنشاہوں اور ایران کے صفوی شاہوں کی نقل میں اختیار کئے تھے۔

(ب) خطبہ اور سکّہ: پہلے تو یہ صرف خلیفہ کا حق تھا کہ اس کا نام نماز جمعہ کے خطبہ میں لیا جائے اور اس کے ساتھ کسی اور نام کو شامل کرنے کی کوشش کو فقہاء نے بدعت قرار دیا لیکن تیسری صدی ہجری کے آخر سے مقامی حکمران خلیفہ کے نام کے ساتھ عام طور سے اپنا بھی نام خطبہ میں شامل کرنے لگے[1]، بغداد میں خلافت کے خاتمہ کے بعد

---

[1]:۔ ایران کے عہدِ وسطیٰ میں خلافت اور بادشاہت، از صدیقی

طور سے اپنا بھی نام خطبہ میں شامل کرنے لگے[۱]۔ بغداد میں خلافت کے خاتمہ کے بعد اگرچہ مسلمان حکمرانوں نے خطبہ میں اپنا نام لازمی طور پر شامل کرنا شروع کر دیا تھا انہوں نے قاہرہ کے نام نہاد عباسی خلفاء کے نام لئے جانے کی رسم ختم کر دی[۱]، ہمیں یہ نہیں معلوم کہ مصر کے خلفاء کے کشمیر کے سلطان سے کیا تعلقات تھے، چونکہ تاریخوں میں سلطان زین العابدین اور مصر کے حکمران کے درمیان سفارت خانوں کے تبادلہ کے علاوہ کچھ اور نہیں لکھا ہے لیکن اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ دوسرے مسلم ممالک کی طرح کشمیر میں بھی سلطان کا نام خطبہ میں لیا جانا اور کشمیر کا سلطان اس کو امتیازی خصوصیت سمجھتا تھا سلاطینِ کشمیر کے پورے دور میں صرف تین بار اس خصوصیت سے اُن کو دست بردار ہونا پڑا، سلطان کا دوسرا خاص حق اپنے نام اور لقب کے ساتھ سکہ رائج کرنا تھا، اگرچہ سلاطین اپنے پیش رووں اور بڑے بڑے اولیاء کے نام سکوں پر نقش کرنے کی اجازت دے دیتے تھے، لیکن سکہ ڈھالنے کے حق سے وہ کبھی دست بردار نہیں ہوئے، اس حق کو اُسی وقت خیرباد کہتے تھے، جب انہیں تخت چھوڑنا پڑتا تھا، اس زمانہ کے کسی بھی سکہ پر کسی خلیفہ کا نام نہیں۔

(ج) تاج و تخت: تخت پر بیٹھنے[۲] اور تاج پہننے کا حق صرف سلطان کو تھا، اور تخت و تاج سے دست بردار ہوتے وقت وہ تاج کو اپنے جانشین کے حوالہ کر دیتا[۳]، جب یوسف شاہ کو مجبوراً تخت چھوڑنا پڑا، تو اس نے تاج کو سید مبارک کے پاس بھیج دیا، جس کو امراء نے سلطان بنا دیا تھا[۴]۔ اسی طرح جب غازی چک نے شاہی اختیارات

۱:۔ "خلافت، از آزملڈ باب ۷

۲:۔ The word of Lalla از ٹمپل ص ۲۱۱، شری ور ص ۲۰۷

۳:۔ بہارستانِ شاہی ورق ۱۳۲ اب، ۱۴۰ الف

۴: حیدر ملک ورق ۱۶۴، الف، بہارستان شاہی ورق ۱۴۸ اب

لینے چاہے، تو حبیب شاہ کے سر سے تاج اتار کر غازی چک کے سر پر رکھا گیا اور غازی چک نے تخت پر اس کی جگہ لی[۱]۔

(د) چھتر اور چوری:۔ چھتر اور چوری (مور چھل) سلطان کے علاوہ کوئی دوسرا استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ہندو راجاؤں کے عہد میں شاہی اختیار کے نشان تھے اور سلاطین نے انہیں برقرار رکھا[۲]۔

(ہ) خلعت:۔ امراء سرکاری افسروں اور باج گزار لوگوں کو خلعت عطا کرنے کا حق صرف سلطان کو تھا۔ یہ پرانا ایرانی دستور تھا جو عباسی خلفاء سے مستعار لیا گیا تھا[۳] بعد میں یہ دستور دوسرے ممالک میں بھی پھیل گیا۔ خزانہ شاہی اصطبل اور جھنڈا[۵] کشمیر میں شاہی اقتدار کی دوسری علامتیں تھیں، ہندو حکمرانوں کے زمانہ[۴] میں رتھ بھی شاہی اقتدار کی علامت تھا۔[۶] لیکن سلاطینِ کشمیر کے عہد میں اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

• وزیر: شاہ میر خاندان کے شروع کے حکمرانوں کے عہد میں وزیر اعلیٰ کا پرانا

۱:۔ نوادر الاخبار ورق ۶۷ ب، تاریخ کشمیر از نرائن کول ورق ۳۶

۲:۔ The word of Lallia از ٹمپل ص ۱۱۔ ۲۱۰، یون راج ص ۶۷ اور شری ور ص ۲۶۷ چھتر کے لئے مزید دیکھو بہارستان شاہی ورق ۱۴۸ ب۔

۳: ہارون الرشید پہلا مسلمان حکمران تھا، جس نے خلعت عطا کرنے کی ابتدا کی۔

(Doyy, Nonodao vetenentcheyleo arablC)

۴: شری ص ۱۷۳، میونخ قلمی نسخہ ورق ۷۷ الف، حیدر ملک ورق ۱۵۲ ب

۵: جون راج ص ۵۷ شری ور ص ۱۰۷،

۶: The Word of Lalla از ٹمپل ص ۲۱۱

نام سردار ھیکار تھا[1]۔ شاید زین العابدین کے عہد میں یہ نام بدل کر وزیر کہلایا اور حسن شاہ اور محمد شاہ کے زمانہ تک یہ نیا لقب عام طور پر رائج ہو چکا تھا۔[2] وزیر غیر فوجی نظم و نسق کا سربراہ اور حکومت کا سب سے اعلیٰ عہدہ دار ہوتا۔ سلطان کے مشیر کی حیثیت سے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد تھا۔ اس کے اختیارات بہت وسیع تھے۔ اس لئے اس کی اہلیت اور دانش مندی پر عوام کی خوش حالی اور مملکت کے استحکام کا دارومدار ہوتا۔ اس عہدہ کی اہمیت اور عزت کو دیکھتے ہوئے امراء میں اس پر مامور ہونے کے لئے کافی مقابلہ رہتا، لیکن اس سے رشک و حسد اور آپس کی رقابت پیدا ہوتی، جس کے لئے اکثر تلواریں نیام سے باہر آجاتیں۔ چونکہ اختیارات الگ الگ نہیں تھے، اس لئے وزیروں کو لڑائیوں کی سربراہی بھی کرنی پڑتی۔ مثال کے طور پر سلطان سکندر کے عہد میں سوہ بھٹ نہ صرف غیر فوجی نظم و نسق کا سربراہ تھا بلکہ فوج کا بھی سردار تھا لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اسی طرح شہاب الدین کے دور میں وزارت اور شعبۂ مالیات اُدے شری کے ہاتھ میں تھا اور فوج کی کمان چندر ڈامر اور لولا کے سپرد تھی۔[3] شاہ میر کے خاندان کے زوال کے زمانہ میں وزیر فوجی سپہ سالار بھی ہوتا۔ حقیقت میں ان کے اقتدار کا سرچشمہ ان کی فوجی جوان مردی تھی۔ وہ اتنے طاقت ور ہوتے کہ وہ سلطان کو کٹھ پتلی بنا دیتے اور خود اصل حکمران بن جاتے۔ قاضی کے ساتھ اپیل کی سب سے اونچی عدالت کی صدارت بھی کرتے۔ امراء کو جاگیر دیتے، افسروں کو مقرر

۱: اسٹین ج ۵ نمبر ۲۱۴ ج نمبر ۱۹۹ اور حاشیہ

۲: سید علی ص ۴۰، لیکن شری در وزیر کو سچیو کہتا ہے، (شری، در ج ۳ نمبر ۲۳)

۳: بہارستانِ شاہی ورق ۱۱۹ الف، حسن شاہ کے عہد میں غیر فوجی نظم و نسق ملک احمد کے ہاتھ میں تھا، اور نازی بٹ سپہ سالار تھا (شری در ص ۲۳۸)

اور برخاست کرنے کا بھی اختیار ان کو ہوتا جنگ یا صلح کا اعلان کرتے۔ آخر میں چک جو شاہ میر خاندان کے وزیر تھے، اتنے طاقت ور ہو گئے کہ انہوں نے شاہ میر سلطان کو معزول کر کے خود عنانِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ وزیروں کو ان کی خدمات کے صلہ میں بڑی جاگیریں عطا ہوتی تھیں[1] لیکن یہ نہیں معلوم کہ جاگیر کے علاوہ ان کو تنخواہ بھی ملتی تھی، یا نہیں۔

دیوانِ کُل

وزیر کے بعد مملکت میں سب سے اہم عہدہ دیوانِ کُل کا تھا، لیکن یہ عہدہ شاہ میر خاندان کے ابتدائی دور میں نہیں تھا۔ اس کی ابتداء فتح شاہ نے کی تھی جو وزیر کے اختیارات کم کرنا چاہتا تھا۔ وزیر کے پاس فوج، نظم ونسق اور عدل وانصاف کے محکمے تھے۔ لیکن شعبۂ مالیات کا اختیار وزیر کے ہاتھ سے لے کر دیوانِ کل کے سپرد کر دیا گیا تھا۔[2] اختیارات کے اس طرح تقسیم کئے جانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا، اور وزیروں کی طاقت میں کوئی کمی نہیں آئی خاندان چک۔ کے دورِ حکومت میں دیوانِ کل کی تاریخ سے متعلق کچھ معلومات حاصل نہیں ہو سکے۔

مذہبی امور کی وزارت

شیخ الاسلام امورِ مذہبی کا صدر ہوتا۔ کشمیر میں یہ عہدہ سلطان سکندر کے عہد میں پہلی بار شروع ہوا تھا[3]، شیخ الاسلام، علماء کا نمائندہ ہوتا اور وہ شریعت کے قوانین کو

---

[1]: حیدر ملک ورق ۱۳۱ اب، بہارستان شاہی ورق ۸۱ ب ۸۲ الف،

[2]: میونخ قلمی نسخہ ورق ۸۲ ب ۸۳ الف، طبقاتِ اکبری ج ۳ ص ۵۸۔ ۴۵

[3]: تاریخ کبیر از معین الدین مسکین ص ۲۸۹ میں لکھا ہے کہ ملا احمد علامہ کشمیر میں شمس الدین اول کے عہد میں پہلے شیخ الاسلام ہوئے۔ وہ بلبل شاہ کے ساتھ ترکستان سے کشمیر آئے تھے، لیکن اس کی کوئی سند نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ اتنے پہلے اس قسم کے دستور کا ہونا قرین قیاس نہیں ہے۔

نافذ کراتا۔ ان حالات میں اس عہد پر صرف اس شخص کا تقرر ہوتا جو علم اور تقویٰ کے لئے مشہور ہوتا۔ شیخ الاسلام تاج پوشی کی رسم اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیتا اور سلطان کو قانونی اور مذہبی مسائل سے متعلق مشورے دیتا۔ کبھی کبھی وہ سیاسی مسائل پر فتویٰ جاری کرتا جس میں کافی وزن ہوتا۔ چنانچہ ۱۵۳۲ء میں جب مرزا حیدر نے کشمیر پر حملہ کیا تو شیخ الاسلام نے ایک فتویٰ جاری کیا۔ اس فتویٰ کا اثر یہ ہوا کہ کشمیری امراء خوابِ غفلت سے بیدار ہو گئے اور مغلوں کے مقابلہ کے لئے کمربستہ ہونے لگے۔

سلطان کے مشیر کار ہونے کے علاوہ شیخ الاسلام کارِ خیر اور تعلیمی اوقاف کا نگران ہوتا ان اوقات کی آمدنی سے مدرسے چلائے جاتے، غیر مستطیع طلبہ کو وظائف دیئے جاتے اور ملک میں مسافروں کے لئے اس وقت تک کھانا اور رہائش کا انتظام کیا جاتا جب تک کہ انہیں مناسب ملازمت نہ مل جاتی[1] خاندان چک کے زمانہ میں شیخ الاسلام کے عہدہ کے فرائض قاضی سری نگر انجام دیتا، جس کا دوسرا نام قاضی القضاۃ بھی تھا۔[2]

نظامِ عدل

نظامِ عدل قاضی کا عہدہ سب سے اعلیٰ تھا۔ اس عہدہ کی ابتداء سلطان سکندر نے غالباً شیخ الاسلام کے عہدہ کے ساتھ کی تھی۔ پہلا قاضی جس کا نام تاریخوں میں ملتا ہے، سید حسن شیرازی تھا، اس کو سکندر[3] نے سری نگر کا قاضی بنایا تھا۔ خاندانِ چک

۱: بہارستان شاہی ورق ۳۴ب، حیدر الملک ورق ۱۱۹ب

۲: واقعات کشمیر ورق ۵۲ الف، ۶۰ الف

۳: بہارستان شاہی ورق ۳۱ب B

کے عہد میں قاضی کے دبدبے اور اختیارات بہت زیادہ بڑھ گئے، کیونکہ وہ انصاف اور مذہبی امور کے شعبوں کا صدر بھی ہوتا۔ وہ نماز کی امامت کرتا، کارِ خیر اور تعلیمی اوقاف کی نگہداشت کرتا اور مذہبی معاملوں میں سلطان کو مشورہ دیتا۔ اس کا معاون ایک مفتی ہوتا جو حنفی قوانین کے مطابق استفتا تیار کرتا[1] قاضی کے تحت ایک اور عہدہ دار ہوتا، جو میر عدل کہلاتا تھا جو نظم و نسق کے تھوڑے فرائض بھی ادا کرتا، قاضی کے سامنے پیش ہونے سے پہلے فریقین میرِ عدل کے پاس جاتے، وہ مقدمہ کی تنقیح کرتا اور اگر مقدمہ پیچیدہ نہ ہوتا اور فریقین راضی ہوتے تو معاملہ کو خود ہی طے کرا دیتا۔[2]

عدل گستری کا کام سلطان اور وزیر بھی کرتے۔ سلطان کی ذات ابتدائی اور آخری عدالت دونوں تھی وہ فوجداری اور دیوانی دونوں قسم کے مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا، لیکن اپیل کا کوئی باضابطہ طریقہ نہیں تھا۔ دیوان خانہ میں کھلے دربار میں بیٹھ کر سلطان مقدموں کا فیصلہ کرتا، حسن شاہ چک نے اس کام کے لئے دوشنبہ کا دن مقرر کر دیا تھا اور اس روز وہ عدالت میں قاضی اور میرِ عدل کے ساتھ رونق افروز ہوتا لیکن دوسرے سلاطین کسی مقررہ دن عدالت میں نہیں بیٹھتے۔ عوام ہفتہ میں کسی روز بھی ان سے دادرسی کر سکتے تھے۔ وہ فیصلہ غیر جانبداری کے ساتھ کرتے تھے۔ لیکن مجرموں کو دی جانے والی سزائیں ہمیشہ شریعت کے مطابق نہیں ہوتیں۔ مثال کے

۱: طبقات اکبری ج ۳ ص ۴۹۵، ایک بار حسین شاہ کے عہد میں شافعی قانون بھی استعمال کیا گیا تھا۔ حسین شاہ کے عہد میں مفتیوں کو غلط فتویٰ دینے کی بنا پر قتل کر دیا گیا تھا،

۲: برائے میر عدل دیکھو حیدر ملک، ۱۵۹ اب اور اس کا مقابلہ شاہد سے کرو۔

(227-29 Metg Renaissance of Islam)

طور پر زین العابدین چوروں اور ڈاکوں کو پھانسی دینے یا ان کے اعضا کاٹنے کے خلاف تھا، اس کے بجائے وہ ان سے سرکاری عمارتوں کی تعمیر کا کام لیتا بعد میں اس کے جانشینوں نے سزائے موت کو پھر سے جاری کر دیا۔ بغاوت کے مجرموں کو قید، موت یا اعضاء کاٹنے کی سزا دی جاتی، اعضاء کاٹنے کی سزا کی ابتداء غازی شاہ چک نے کی تھی لیکن بعد میں علی شاہ نے اس کو ختم کر دیا۔

......☆......

شاہی اصطبل:

یہ ایک اہم شعبہ تھا۔ تخت کے دعوے دار ہمیشہ سب سے پہلے گھوڑوں ہی پر قبضہ کرتے۔ کیونکہ سوار فوج کے بہت اہم جزو تھے اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شاہی گھوڑوں پر ایک بار قبضہ کر لینے کے بعد فتح آسان ہو جائے گی۔ اسی لئے حاجی خاں نے اپنے باپ کی موت کے فوراً بعد تخت حاصل کرنے کی غرض سے سب سے پہلے شاہی اصطبل پر قبضہ کیا تھا[1] اس سے ادہم خان کو کامیابی کی امید نہ رہی اور وہ ہندوستان بھاگ گیا۔ اسی طرح دولت چک کو مغلوب کرنے کے لئے غازی چک کو شاہی اصطبل پر قبضہ کرنا پڑا تھا[2] ہندوؤں کے عہد میں شاہی اصطبل کو مہاشوا شالہ[3] (Office of the Chief Master of Home) کہا جاتا تھا۔ تاریخوں میں اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے کہ دلی کے سلاطین کی طرح اس کو اخور بیگ کہا جاتا تھا۔

۱: شری ور ص ۱۷۳، میوہ نخ قلمی نسخہ ورق ۱۷۷الف،

۲: حیدر ملک ورق ۱۵۲ب

۳: حیدر ملک ورق ۱۵۲ب

میر بخشی:

میر بخشی فوج کے محکمہ کا نگرانِ اعلیٰ ہوتا اور اس وجہ سے اس کی اہمیت زیادہ تھی۔ وہ سپاہیوں کا رجسٹر رکھتا، ان کی تنخواہ تقسیم کرتا اور ان کو بھرتی کرنے کی ذمہ داری اس کے سر تھی۔[۱] مغلوں کے عہد میں اس کے بڑے اختیارات اور اثرات تھے[۲] لیکن سلاطین کشمیر کے عہد میں اس کا بظاہر وہ مقام اور وقار نہیں تھا۔ تاریخوں میں اس کا سب سے پہلا حوالہ علی شاہ کے عہد میں ملتا ہے۔[۳]

امیر دار[۴]

امیر دار جس کو یون راج ودار پال[۵] کہتا ہے، اہم افسر ہوتا تھا۔ اس عہدہ کا وقار بہت زیادہ تھا، جو سلطان کے مخصوص اور معتمد علیہ امراء کے لئے محفوظ رہتا۔ اس کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئی تھی کہ وہ ہر وقت سلطان کی معیت میں رہتا تھا۔ سلطان کے پاس ساری عرضیاں اس کے ذریعہ سے پیش کی جاتی تھی اور سلطان کے حضور میں اس سے ملے بغیر کسی کو بھی جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ وہ دربار میں اہم تقریبوں کا انتظام کرتا تھا۔[۶]

نایک:

نایک[۷] کشمیر کے دروں کے نگہبان تھے۔ ہندو راجاؤں کے عہد میں دروں کا

۱: حیدر ملک ورق ۱۸۹ اب ۲: Central Structure of the mughal Empire از ابن حسن ص ۲۱۵ ۳: میونخ قلمی نسخہ ورق ۱۲۶ الف

۴: طبقات اکبری ج ۳ ص ۴۴۸ پر حاجب دار لکھا ہے ۵: شری ور ص ۲۰۸، کلہن اس کو مہا پرتی ہار پیڈا کہتا ہے (اسٹین ج ۴ نمبر ۴۳۔۱۴۲) ۶: اس کا مقابلہ دلی دربار کے امیر حاجب یا بار یک سے ہو سکتا ہے دیکھو Administration of Delhi Sultnate از قریشی ص ۲۔۶۱ ۷: شری ور ص ۳۱۰، ۳۱۳، شک ص ۴۰۵، اکبر نامہ ج ۳ ص ۶۴۴ اسٹین کا یہ قول کہ ان کو ملک کہتے تھے غلط، ملک تو اصل میں سرکاری عہدہ داروں کو سلاطین کا عطا کیا ہوا خطاب تھا

انتظام صرف ایک افسر کے ہاتھ میں ہوتا تھا، اس کو ودار پتی کہتے تھے[۱] سلاطین کے عہد میں دروں کا انتظام متعدد افسروں کے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا۔ ان کو نایک کہتے تھے۔ ان کا تقرر سلطان خود کرتا اور وہ براہِ راست مرکزی حکومت کے ماتحت ہوتے، ان کا تقرر کبھی خاندانی ہوتا اور انکی خدمات کے صلہ میں ان کو جاگیریں عطا کی جاتیں، ان کے پاس ایک فوجی دستہ بھی ہوتا جو محفوظ چوکیوں میں رہتا اور وہ وادی میں کسی کو خطِ راہ[۲] کے بغیر داخل نہ ہوتے دیتے تھے، انہیں وادی کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانا اور شورش پسند پہاڑی قبیلوں مثلاً جنوب میں دروں اور جنوب مغرب میں کھسّوں[۳] کو روکنا بھی پڑتا تھا، اس کے علاوہ انہیں خفیہ درآمد کو روکنا پڑتا اور درآمد بر آمد کے مال پر محصول بھی وصول کرنا پڑتا تھا[۴] جب دروں کا دفاع قابلِ اعتماد فوجی سرداروں کے ہاتھ میں ہوتا، تو کشمیر بیرونی حملوں سے محفوظ رہتا، لیکن دروں کے دفاع کی طرف سے آنکھیں پھیر لی جاتیں، نایک غداری کرنے لگتے، تو وادی پر آسانی سے حملہ ہو جاتا۔

جاسوسی کا نظام

سلاطین اپنے آپ کو رعایا اور عمال کی سرگرمیوں سے مخبروں کے ذریعہ باخبر رکھتے تھے۔ چنانچہ مخبروں ہی کے ذریعہ حیدر شاہ کو اپنے خزانچی حسن کی چالوں کا پتہ لگا، اور وہ سازش کا شروع ہی میں سدباب کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ زین العابدین کے عہد

۱: اس کے مرادف الفاظ دوارادھپ، دواریش وغیرہ تھے، (اسٹین ج ۵ نمبر ۲۱۴)

۲: تحفۃ الاحباب ص ۶۴، یون راج ص ۶۶ شری ور ص ۱۷۱،

۳: اسٹائن ج ۲ ص ۳۹۲

۴: جون راج ص ۹۷

میں جاسوسی کا نظام بہت ہی اچھا تھا اور اس کے ذریعہ اس کو مملکت کے کونے کونے کی خبر ملتی رہتی [۱] کبھی کبھی تو خلیفہ ہارون الرشید کی طرح وہ خود بھی بھیس بدل کر راج دھانی کی سڑکوں پر اپنی رعایا کی حالت معلوم کرنے کے لئے گھوما کرتا [۲]۔ مخبری اور اطلاع فراہم کرنے کے لئے عام طور پر طوائفوں کو رکھا جاتا ملکہ اور شہزادے خود اپنے ایجنٹ رکھتے [۴]۔ سلاطین وادی کی سرحدوں پر بھی اپنے مخبر رکھتے جن کا کام نایکوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا اور سرحدوں کے آگے دشمن کی نقل و حرکت کی اطلاع دینا تھا [۵]۔

خزانچی یا خزانہ دار [۶]

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، خزانچی، خزانہ کا نگراں ہوتا تھا، ہندوؤں کے عہد میں اس کو فارسی لفظ گنجِ در کے تتبع میں گنج دارا کہا جاتا ہے، اور خاندان شاہ میر کے ابتدائی دور میں وہ اسی نام سے پکارا جاتا رہا لیکن بعد میں اس کا نام خزانچی رکھ دیا گیا۔ چنانچہ زین العابدین کے خزانچی نے تخت کا وارث بنانے میں بہت اہم حصہ لیا تھا اور جب حاجی خان تخت پر بیٹھا، تو حسن نے اس کے سر پر تاج رکھا تھا کسی اور خزانچی کے امورِ مملکت میں اتنا اہم حصہ لینے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

۱: شری، ور ص ۱۰۱

۲: حیدر ملک ورق ۱۲۱ اب حسن ورق ۱۲۲ الف

۳: نصیب ورق ۲۰۵ ب وغیرہ

۴: جون راج ص ۴۳

۵: شک ص ۵۰

۶: حید ملک ورق ۱۵۹ اب

۷: اسٹائن ج ۵ نمبر ۱۷۷ اور حاشیہ، للتادتیہ کے زمانے میں اس کو مہا بھنڈاگار کہتے تھے، (اسٹین ج ۵ نمبر ۱۴۳۳) شری ور (بمبئی اڈیشن ج ۲ نمبر ۴۲) میں کوشش لکھا ہے)

پولیس کوتوال اور محتسب

راجاؤں کے عہد میں سری نگر میں ایک پولیس افسر ہوتا تھا جس کو نگر آدھپ یا نگر ادھکرتا کہتے تھے[۱]۔ وہ لوگوں سے سرکاری جرمانے وصول کرتا اور ان کے اخلاق کی دیکھ بھال کا کام اس کے سپرد ہوتا، وہ ناپ تول کے باٹوں اور صنعتوں اور شہر کے دوسرے معاملوں کی جانچ بھی کرتا۔ سلاطین کے عہد میں یہ کام کوتوال اور محتسب کے سپرد تھا۔ کوتوال کا کام شہر میں امن وامان قائم رکھنا اور شہریوں کو چوروں اور ڈاکوؤں سے بچاتا تھا، اس کے اختیارات بہت وسیع تھے اور وہ چوروں کو سزائے موت دے سکتا تھا[۲]۔ فرائض کی بہتر انجام دہی کے لئے اُس کے پاس ایک پولیس کا دستہ بھی ہوتا۔ محتسب بازاروں کی نگرانی، ناپ تول کے باتوں کی جانچ اور لوگوں کے اخلاق کی دیکھ بھال کرتا۔ اس کے علاوہ اس کو یہ بھی دیکھنا پڑتا کہ نماز باجماعت باقاعدہ ہو، نشہ آور چیزیں اور دوائیں عام طور سے نہ بنائی جائیں نہ بیچی جائیں، عام جگہوں میں کوئی نشہ کی حالت میں نہ جائے اور قمار بازی اور غیر اخلاقی زندگی رواج نہ ہونے پائے۔ سکندر اور ایسے حکمرانوں کے عہد میں سری نگر کے ہر حصہ اور مملکت کے ہر گاؤں اور پرگنہ میں ایک محتسب رہتا تھا جس کا کام یہ دیکھنا تھا کہ لوگ پنجگانہ نماز ادا کریں اور اسلام کی تعلیمات سے انحراف نہ کریں[۳]۔ محتسب کو مقدمہ چلانے کا اختیار نہیں تھا، یہ کام صرف قاضی کا تھا، لیکن وہ مقدمات عدالت میں دائر کرسکتا تھا اور سرسری تحقیقات کے بعد معمولی بدچلنیوں کے لئے ہلکی سزائیں بھی دے سکتا تھا۔ سنگین جرائم جن کی باقاعدہ تفتیش اور قانونی توضیح کی ضرورت ہوتی۔ قاضی اور مفتی کے حوالہ کردیئے جاتے، محتسب اصل میں انتظامی افسر ہوتا تھا[۴]

۱: جون راج (کلکتہ اڈیشن) نمبر ۸۸۶ نمبر ۹۴۵ میں اس کو ادھیکار کہا گیا۔ ۲: شری ور ص ۲۷۹، ایک بار اس نے ایک پل کی تعمیر کی نگرانی کی، (یون راج ص ۸۹) ۳: نصیب ورق ۵۱۲ الف ۴: محتسب کے فرائض کے لئے دیکھو: Administration of the Sultanate of Delhi از قریشی ص ۱۶۴۲۷ میں پھر دیکھو اور Orient under the Caliph از دان کریم ص ۲۹۲ (مترجم خدا بخش)

مرکزی محافظ خانہ

تمام سرکاری دستاویزات کو سری نگر میں علاحدہ محافظ خانہ میں رکھا جاتا تھا۔ سلطان زین العابدین کے عہد سے پہلے کاغذ کی کمی کی وجہ سے دستاویز خانہ ایک ایسی روشنائی سے لکھی جاتی جو بادام کے کوئلہ کے سفوف کو گوند(Bouis Urine) میں ابال کر بنائی جاتی تھی۔ یہ روشنائی نمی یا پانی پڑنے سے خراب نہیں ہوتی تھی[1] زین العابدین کے زمانہ سے کشمیر میں کاغذ سازی کا کام شروع ہوا، تو دستاویز بھرجا اور کاغذ دونوں ہی پر لکھی جانے لگی[2] سری نگر کے علاوہ کمراج کی راج دھانی سوپور میں بھی ایک محافظ خانہ تھا لیکن زین العابدین کے عہد میں ساری گذشتہ دستاویز تلف ہوگئیں[3]

اس کے علاوہ حکومت کے بہت چھوٹے چھوٹے شعبے اوران کے عمال تھے۔ ہر شعبہ کا ایک معتمد ہوتا جو دبیر کہلاتا تھا۔ سلطان کی عدالت میں جس کو جون راج دھرم ادھیکار کہتا ہے ایک ناظم ہوتا تھا جو بہت ہی ذمہ دار افسر ہوتا تھا[4] وہ سلطان کا معتمدِ خاص ہوتا تھا لیکن اس کے فرائض کیا تھے، نہیں معلوم ہوسکے۔ شہزادوں کی اتالیقی کے عہدہ کے لئے آپس میں بڑا مقابلہ ہوتا، سب لوگ اس عہدہ کے متمنی ہوتے جو اس عہدہ پر مامور ہوتا وہ وزیر کے برابر سمجھا جاتا اور سلطان کی مجلس مشاورت کا رکن بھی ہوتا۔ اس کے علاوہ راج جوتشی اور راج وید بھی ہوتے تھے جن پر سلطان کو کافی اعتماد ہوتا[5] موسیقی کا ایک علاحدہ شعبہ تھا جو ایک افسر کے تحت ہوتا[6] برہمنوں کی اہمیت خاندانِ شاہ میر کے

---

[1]: Buhler/ Report of Town (جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ج ۱۲ ۱۸۷۲ ص ۳۰-۲۹

[2]: دستاویز ۱۷ویں صدی تک بھرجا پر لکھی جاتی تھی (اسٹائن ج ۷ نمبر ۵۰۸)

[3]: شری ور ص ۶-۱۵۵ [4]: اسٹائن ج ۵ نمبر ۱۷۷

[5]: جون راج (بمبئی اڈیشن) نمبر ۱۱ ص ۱۳۰۶

[6]: حسن شاہ کے عہد میں شری ور شعبۂ موسیقی کا صدر تھا۔

ابتدائی دور میں بہت زیادہ تھی، لیکن بعد میں اس کی اہمیت کم ہوگئی کیونکہ اس کی ذمہ داریاں شیخ الاسلام نے سنبھال لی تھیں۔[1]

صوبائی اور مقامی نظام

پوری سلطنت میں صرف وادیٔ کشمیر اور لوہر سلطان یا اس کے نمائندوں کی براہ راست حکمرانی میں تھے، بقیہ حصہ پر سرداروں کی حکومت تھی جو اندرونی معاملوں میں خود مختار تھے۔ وادی کشمیر میں دو صوبے تھے، مراج مشرق میں اور کمراج مغرب میں تھا[2] مراج میں جہلم کے دونوں طرف کے اضلاع شامل تھے اور کمراج میں اس کے نیچے کے اضلاع تھے[3]، کمراج کا صدر مقام سوپور تھا اور مراج کا خاص شہر سری نگر تھا[4]

سری نگر کی حکومت براہِ راست سلطان کے ماتحت تھی اور دونوں صوبے گورنروں کے انتظام میں تھے جن کو حاکم کہا جاتا تھا، اور عام طور سے ان کا تعلق شاہی خاندان سے ہوتا[5] زین العابدین نے اپنے لڑکے اور ہم کو کمراج کا حاکم مقرر کیا تھا اور بعد میں حسین شاہ نے بھی اس صوبہ کو اپنے لڑکے حسن کو بطور جاگیر دی دیا تھا، خاندان شاہ میر کے آخری دور میں وادی تین یا چار سرداروں میں تقسیم کردی گئی تھی، اور وہی اپنے اپنے علاقوں کے نظم وانصرام کے ذمہ دار تھے، لیکن مملکت کی عام نگرانی وزیر کے ہاتھ میں تھی جو کٹھ پتلی سلطان کے نام پر حکومت کرتا تھا۔

صوبہ کی سرکار، مرکزی سرکار کی نقل ہوتی، حاکم کا کام امن وامان قائم رکھنا، لگان وصول کرنا اور انصاف کرنا تھا۔ صوبہ کے ملکی اور فوجی نظام کا صدر ہونے کی وجہ سے اُس کے

۱: یہ تبدیلی سکندر کے عہد میں ہوئی تھی۔ ۲: آئین اکبری ج ۲ ص ۳۶۷ ہندوؤں کے عہد میں ان حصوں کو مدوراجیہ اور کرم راجیہ کہا جاتا تھا (اسٹین ج ۲ ص ۴۳۶)

۳: اسٹائن ج ۲ ص ۴۳۶ ۴: ایضاً شری، ورص ۱۹۶ ۵: ہندوؤں کے عہد میں گورنر کو مندیش کہا جاتا تھا (اسٹین ج ۸ نمبر ۱۱۱۷)

اختیارات وسیع تھے اور چونکہ اس پر کوئی امنی پابندی نہیں تھی۔ وہ کبھی کبھی مرکز کے احکام کی خلاف ورزی بھی کرلیا تھا تھا، اس کو روکنے کے لئے سلاطین صرف قابل اعتماد اشخاص کو گورنر بناتے تھے، لیکن ان کا انتخاب ہمیشہ صحیح نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ آئے دن بغاوتیں ہوا کرتی تھیں۔

قاضی صوبہ کی عدالت کا صدر ہوتا اور اس کا تقرر مرکز کرتا تھا، اس کے ماتحت شہروں اور پرگنوں میں قاضی اور مفتی ہوتے لیکن کوئی میر عدل نہیں ہوتا جس کا تقرر صرف سری نگر میں ہوتا، قصبہ کے باشندوں کے تحفظ اور ان کے اخلاق کی درستی کی ذمہ داری کوتوال اور محتسب کے سر ہوتی، جاسوسی کا شعبہ سلطان کو صوبوں کے حالات اور مقامی عمال کی سرگرمیوں سے باخبر رکھتا، حکومت کے کاغذات محافظ خانہ میں ایک خاص افسر کے تحت رکھے جاتے تھے۔

نظم ونسق کے خیال سے صوبوں کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کردیا جاتا تھا۔ جن کو پرگنہ[1] کہتے تھے، اور ہر ایک پرگنہ شقدار کے ماتحت[2] ہوتا، ان پرگنوں کی تعداد مستقل نہیں ہوتی تھی، وقتاً فوقتاً انتظامی اسباب کو مدنظر رکھ کر ان کو کبھی توڑ کر الگ اور کبھی ایک دوسرے میں ملادیا جاتا تھا یہ نہیں معلوم کہ زین العابدین کے عہد یا اس سے پہلے پرگنوں کی کیا تعداد تھی، لوک پرکاش کے مطابق وادی میں ۲۷ سیاسی (Viayas) تھے، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ بات اس نے کس زمانہ کے بارے میں کہی ہے، اس کے علاوہ اُس نے صرف ۱۹ پرگنوں کے نام گنوائے ہیں، جن میں سے صرف تھوڑے ہی پرگنوں کو معلوم کیا جاسکا ہے[3] محمد شاہ کے عہد میں پرگنوں کی تعداد ۲۷ تھی، لیکن ان کے نام کا کوئی ذکر نہیں ملتا[4]، مرزا

۱: پرگنہ کو ہندوؤں کے عہد میں Inyar کہتے تھے، (اسٹائن ج ۲، ص ۴۳۷) شری ور (بمبئی اڈیشن ج ۴ نمبر ۵۷۰

۲: فرشتہ ص ۶۵۷، تاریخ حسن ج ۲ ورق ۱۹۷ الف ۳: Indische Studies ج ۱۸ ص ۳۷۰، اسٹین ج ۲ ص ۴۳۷ اور حاشیہ ۶ ۴: شری ور (بمبئی اڈیشن) ج ۴ نمبر ۵۷۰

حیدر دوغلت کے عہد میں ان پرگنوں کی تعداد بڑھا کر ۳۰ کردی گئی تھی[۱]، ابوالفضل کے قول کے مطابق اکبر کے عہد میں آصف خان کی آمدنی میں ۳۸ پرگنے دکھائے گئے ہیں، جب کہ اس سے پہلے قاضی علی کی آمدنی کے سلسلہ میں ۴۱ پرگنے درج ہیں[۲]، خاندان چک کے عہد میں پرگنوں کی تعداد بھی شاید ۴۱ تھی۔

ہر پرگنہ میں کئی گاؤں ہوتے، وادی میں ان کی کل تعداد ۶۰ ہزار تھی[۳]، ہر گاؤں میں ایک پٹواری ہوتا تھا، جس کو ہندو عہد میں گرام کایستھ کہتے تھے[۴]۔ سلاطین کے عہد میں اس کو کیا کہا جاتا تھا، معلوم نہیں۔ امن وامان کے قیام کے لئے ایک پولیس افسر ہوتا جس کو سرہنگ زاد کہا جاتا تھا، اس کے ماتحت کئی گاؤں کا گروپ ہوتا تھا[۵]۔ اس کے ماتحت چنڈال ہوتے تھے، جو دن کے وقت گھروں میں جھاڑو لگاتے اور رات کو گاؤں کی چوکیداری کرتے اور اس خدمت کے لئے گاؤں والے انہیں کھانے کو دیتے[۶] مرزا حیدر کے عہد میں ہر گاؤں میں ایک محتسب بھی ہوتا تھا، جو یہ دیکھتا کہ گاؤں والے اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گذار رہے ہیں، تاریخوں میں یہ نہیں لکھا ہے کہ پنچایت کا ادارہ تھا، یا نہیں، اور نہ کوئی ذکر سرپنچ ہی کا ملتا ہے۔

جاگیردار

جاگیرداروں کا تعلق ماگرے، ماریۃ، چک، بٹ اور ڈار خاندانوں سے تھا جو بڑی بڑی زمینوں کے مالک تھے، ان کو بڑی جاگیریں عطا کی گئی تھیں، جو باپ سے بیٹے کی

۱: نصیب ورق ۵۱۳ ب ۲: آئین اکبری ج ۲ ص ج ۲ ص ۳۶۷ ہفت اقلیم ورق ۱۵۶ الف میں پرگنوں کی تعداد ۳۲ اور ان کی آمدنی ۳ کروڑ ٹنکا درج ہے۔ ۳: جون راج (بمبئی اڈیشن) نمبر ۱۵۳۔ ۴: اسٹائن ج ۵ نمبر ۱۷۵ ۵:۔ نور نامہ ورق ۱۹۲ ب ۶: حسن ورق ۱۹۰ الف، حیدر ملک Biblop thque National ورق ۳۱ الف ان چنڈالوں کا مقابلہ Valley ۱۳ ز لارنس ص ۲۲۸ کے ڈوموں سے کرو، راجاؤں کے عہد میں بھی چنڈال چوکیداری کرتے تھے (اسٹائن ۸ نمبر ۳۰۹)

طرف منتقل ہو سکتی تھیں، ان کے بجائے سلطان کو خراج دینا پڑتا، سرکاری ملازمت اور جنگ کے زمانہ میں فوجی امداد کرنی ہوتی، یہ سردار بہت طاقت ور ہوتے، ان کے ارد گرد کافی مصاحب رہتے، اس لئے سلطنت کو ان سے کافی خطرہ رہتا، وہ بار بار بغاوت کرتے، اور مرکزی حکومت کو طاقت ور بننے میں مزاحم ہوتے، کمزور سلاطین کے زمانہ میں تو وہ ملک کا بڑا حصہ آپس میں تقسیم کر لیتے[1] چونکہ وہ زمین کی لگان اور دوسرے محاصل نہیں ادا کرتے ہے[2] اس لئے ملک کے بقیہ حصّہ سے جو آمدنی ہوتی وہ اچھے نظم ونسق کے چلانے کے لئے ناکافی ہوتی تھی۔

اراضی خالصہ

یہ زمینیں سلطان کی ذاتی ملکیت ہوتیں اور سلطان خود ان کا انتظام کرتا تھا۔ یہاں تک کہ جب کبھی سلطان سے اختیارات چھین لئے جاتے تھے، اور وادی کے امراء وادی کو اپنی ذاتی ملکیت بنا کر تقسیم کر لیتے تب بھی سلطان ان زمینوں پر قابض رہتا۔

لوہر

لوہر کا علاقہ زمانۂ قدیم سے کشمیر کے ہندو راجاؤں کے قبضہ میں تھا، لیکن ان کے انحطاط کے زمانہ میں وہ آزاد ہو گیا تھا، سلطان شہاب الدین نے اپنی حکومت کے آخری عہد میں اس کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے پھر سے فتح کیا، قطب الدین نے اس کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا، بالآخر زین العابدین کے زمانہ میں اس کو فتح کر لیا گیا، زین العابدین نے یہاں کے برسرِ اقتدار خاندان کو ہٹایا، اور سلطنت کے خاتمہ تک لوہر پر الگ حاکم کے ذریعہ سری نگر کی حکومت رہی، سلطان کا دوسرا لڑکا حاجی خان اس کا پہلا حاکم ۱۴۵۲ء میں ہو۔

---

[1] شری ورص ۳۰۳

[2] شری ورص ۳۰۴

باج گذار ریاستیں

باج گذار ریاستیں پکھلی ، وادی کشن گنگا، لداخ، بلتستان کشتواڑ کے علاوہ ان بیرونی پہاڑیوں کے علاقہ تک پھیلی ہوئی تھیں، جو مشرق میں راوی سے لے کر مغرب میں جہلم تک واقع تھا، ان ریاستوں کے حکمران کشمیر کے سلطان کو اپنا فرماں روا سمجھتے، ان کو باج ادا کرتے، اپنی لڑکیوں کا رشتہ سلطان یا اس کے ولی عہد سے کرتے، اور سلطان سے اپنے تخت کی جانشینی کی منظوری لیتے[1] جنگ میں یہ حکمران سلطان کو فوجی امداد دیتے اور نئے سلطان کی تخت نشینی کے وقت دربار میں حاضر ہوتے، اور تاج پوشی کی رسم میں شرکت کرتے، جس کے صلہ میں انہیں خلعت اور تحائف ملتے[2] اپنی ریاستوں کے اندرونی انتظام میں ان کو پوری آزادی تھی، مداخلت صرف بغاوت کی حالت میں ہوتی، اور فوج بھیج کر ان کو پھر مطیع اور فرمان بردار کر لیا جاتا، کمزور سلاطین کے زمانہ میں یہ سردار اکثر آزادی کا اعلان کر دیتے اور باج دینا بند کر دیتے۔

فوج

سلاطین کے عہد میں فوج چار حصوں پر مشتمل تھی (۱) مستقل فوج (۲) صوبہ کی فوج (۳) جاگیردار کی فوج اور (۴) رضا کار

اول الذکر کی فوج سلطان کے براہ راست اختیار میں ہوتی تھی، اس میں قبیلہ کھس کے لوگ، راجپوت، سادات، ماگرے، چک، رینا اور ایسے دوسرے لوگ بھرتی کئے جاتے جو اچھے سپاہی کی حیثیت سے مشہور ہوتے، ڈوم بھی بھرتی کئے جاتے تھے، وہ بڑے اچھے سپاہی بھی ہوتے تھے، لیکن ان کے اندر ایک عیب تھا، وہ ناقابلِ اعتماد تھے، اور ذرا سا موقع پا کر میدانِ جنگ سے ہٹ کر لوٹ مار شروع کر دیتے، مستقل فوج راج دھانی میں رہتی، اور جنگ کے زمانہ میں دشمن کی سرکوبی کے لئے سلطان اس کے آگے چلتا، اور اس

۱: شری درص ۱۲۳ ۲: شری درص ۲۸۴

کے ایک ٹکڑے کو دوسرے سپہ سالار کے ماتحت رکھ دیتا، فوج میں پیدل اور سوار دونوں تھے، سوار ٹٹوؤں پر چلتے، لیکن فوجی سردار ترکستانی اور عراقی گھوڑوں پر سوار رہتے، کیونکہ کشمیر میں اچھی ذات کے گھوڑے نہیں ہوتے تھے[1] ملک کے پہاڑی ہونے کی وجہ سے سوار، فوج کا اہم جزو تھے، اور اسی وجہ سے تخت پر قبضہ کرنے سے پہلے ہمیشہ شاہی اصطبل پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جاتی، ہاتھیوں سے بھی کام لیا جاتا[2]، لیکن چونکہ انہیں ہندوستان سے تنگ دروں سے لانا پڑتا تھا، ان کی تعداد اور بھی کم ہوتی، اس لئے ان کا کام فوج میں اہم نہیں ہوتا۔

صوبہ کی فوج صوبہ کے مختلف شہروں میں رہتی تھی، ان کی تعداد مقامات کی فوجی اہمیت پر منحصر ہوتی، اس کے علاوہ حفاظتی دستے سرحدی قلعوں میں دروں کے ناکوں[3] پر رہتے، ان کے فوجی سردار نایک ہوتے تھے، وادی کے اندر بھی فوجی اہمیت کے مقامات پر مثلاً ناگام، لار، اندرکوٹ، چراوور، منار اور بیرو پر بھی فوجی دستے رہتے تھے، جاگیرداروں کی فوج وہ فوج تھی جو امراء جنگ کے زمانے میں سلطان کو مہیا کرتے تھے، ہر دستہ کا سپہ سالار اُس کا اپنا سردار ہوتا، راجوری، جموں اور کشتواڑ اور دوسری باج گذار ریاستوں کے حکمراں بھی فوج مہیا کرتے تھے۔ ہنگامی حالات میں جب کہ وادی پر بیرونی حملہ کا خطرہ ہوتا، رضاکار بھرتی کر لئے جاتے، عام طور سے جب سلطان اپیل کرتا، تو لوگ اپنے ملک کے دفاع کے لئے خاطر خواہ طریقہ پر جمع ہو جاتے۔

ہتھیار

عام استعمال کے ہتھیار تلوار، تیر، کمان، نیزہ، کٹارہ، اور تبر تھے، سپاہی زرہ بکتر پہنتے تھے اور گھوڑے آہنی ساز و سامان سے لیس ہوتے، شری ور زین العابدین کے عہد میں ایک ایسے ہتھیار کے متعلق جو کشمیر میں پہلی بار بنا تھا، لکھتا ہے، یہ ''ہتھیار قلعوں کو مسمار

۱: تزک جہانگیری ج ۲ ص ۱۴۸ ۲: حیدر ملک ورق ۱۵۲ الف، ب، کشمیر کے راجہ ہرش کے عہد میں ہاتھیوں کے استعمال کے لئے دیکھو اسٹین ج، نمبر ۵۵-۱۵۵۳ ۳: اسٹین جلد ۷ نمبر ۲۰۱۰ اور حاشیہ

کرسکتا ہے، آدمی کے دل میں چبھ سکتا ہے اور گھوڑوں کو خوف زدہ کرسکتا ہے اور فاصلہ سے پتھر کے گولے برسا سکتا ہے، اور پھر سپاہیوں کو نظر نہیں آتا[1] ایک دوسرے مقام پر وہ لکھتا ہے کہ "سلطان کی فوج ایسے ہتھیاروں سے مسلح تھی، جو بجلی کی سی سرعت سے تیز اور طویل گرج کے ساتھ تیر برسا سکتے تھے[2] اس بیان سے بعد میں یہ اندازہ لگایا گیا کہ یہ ہتھیار، توپ تھی، جس میں بارود کا استعمال ہوتا تھا[3] لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ شری ور شاعر تھا، اور شاعرانہ تخیل سے کام لیتا تھا، اس لئے اس کے بیانات کو لفظ بہ لفظ صحیح نہیں ماننا چاہیئے، اس کے علاوہ وہ کہیں بھی ایوگندا (بارود) کا ذکر نہیں کرتا، وہ صرف کشارہ[4] کے استعمال کا ذکر کرتا ہے، اس بات کا کوئی مستند ثبوت نہیں ملتا کہ زین العابدین کے عہد میں بارود کی دریافت ہوئی تھی، حقیقت میں جس چیز کا استعمال ہوا ہوگا، وہ یونانی آگ یا Napptha ہوگی جو بارود کی طرح آواز پیدا کرتی تھی[5]، اور جو ہتھیار ایجاد ہو تھا، وہ توپ نہیں بلکہ ایک مشین تھی، جس سے پتھر پھینکے جاسکتے تھے[6]، ان ہتھیاروں کا بنانا بہت مشکل تھا، اس لئے ان کا استعمال کم ہی ہوتا تھا، اس وجہ سے محمد شاہ اور فتح شاہ کی خانہ جنگی یا مرزا حیدر سے جنگ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے[7]، خاندان شہ میر کے آخری دور میں یا خاندانِ چک کے عہد میں بارود کا استعمال شروع ہوا، لیکن یہ محدود طریقہ سے استعمال ہوتا

1: شری ور ص ۱۰۵ 2: ایضاً ص ۱۱۲

3: جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ج ۱۴ ص ۳۶، شری ور نے دجر کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا مطلب ہتھیار ہے، نہ کہ توپ (شری ورج، باب الامر ۲، ۷ وغیرہ)

4: شری ور (بمبئی ایڈیشن) جلد ا باب ۴ نمبر ۱۹ وغیرہ کشار کا مطلب شورا ہے یہ لفظ نمبر ۲۸ میں بھی ملتا ہے۔

5: جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ج ۱۴ ص ۳۶

6: جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ج ۱۴ ص ۴۲۔۴۰" واقعات کشمیر ورق ۴۹ ب، اس پتھر کے متعلق جو خانقاہ معلیٰ پر پھینکا گیا تھا، جس سے اسکی چھت کو نقصان پہنچا تھا، حیدر ملک ورق ۱۵۱ الف نے یہ غلط لکھا ہے کہ وہ پتھر توپ کا گولہ تھا 7: بہارستان شاہی کے مطابق (ورق ۸۳ ب) کشمیر میں محمد شاہ اور فتح شاہ کی خانہ جنگی میں ۲۰ بندوقیں استعمال ہوئی تھیں۔

،ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غازی شاہ پہلا سلطان تھا جس کے پاس توپ تھی، اور اس نے توپ کو قرابہادر کے خلاف استعمال کیا تھا...... بعد میں یوسف شاہ اور ابدال چک کے میان جانشینی کی جنگ میں بندوقیں استعمال ہوئی تھیں، کیونکہ ابدال چک گولی لگنے سے ی ہوا تھا۔ یوسف شاہ کی فوج میں سات ہزار بندوقچی تھے، جو راجہ بھگوان داس کی براہی میں مغل حملہ کو روکنے کے لئے تیار کئے گئے تھے، لیکن یہ تعداد کافی مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے......

جنگ کا طریقہ

سلاطین کے فوجی نظام کے متعلق جو تھوڑی بہت معلومات حاصل ہیں، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فوج پانچ حصوں میں تقسیم تھی، بیچ میں دو حصے ہوتے، ایک ہراوّل دستہ اور دوسرا عقبی دستہ۔ آگے کبھی کبھی ہاتھی ہوتے۔ آجکل کے طریقہ جنگ کے خلاف اس زمانہ میں سپہ سالار خود حملہ کی سربراہی کرتا، اس کے مارے جانے پر اس کا نائب اس کی جگہ پر ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی صرف ایک ایک آدمی لڑتے، اس کے بعد پھر عام معرکہ آرائی ہوتی، سپاہیوں کا جوش ڈھول بجا کر بڑھایا جاتا۔ فوج کی کوئی خاص وردی نہیں ہوتی، صرف کچھ علامتیں ہوتیں جن سے وہ دشمن سے امتیاز کئے جا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ خون کے رنگ کے سرخ جھنڈے بھی ہوتا۔

کشمیریوں کا خاص طریقہ جنگ جس کے وہ ماہر تھے، اچانک حملہ تھا، جو دن نکلنے سے پہلے کیا جاتا تھا، یہ خانہ جنگی اور بیرونی حملہ آوروں کے خلاف بھی ہوتا رہا۔ ان ہی اچانک حملوں سے مرزا حیدر کو تنگ کیا گیا تھا، اور اکبر کے سپہ سالار قاسم خاں کو سخت نقصانات اٹھانے پڑے، اچانک حملہ اُس وقت کیا جاتا، جب تعداد کی کمی کی وجہ سے جم کر لڑائی میں کامیابی حاصل کرنے کی امید نہ ہوتی۔

کشمیریوں میں گوریلا طریقہ جنگ بھی بہت پسند کیا جاتا تھا، یہ طریقہ اُس

وقت اپنایا جاتا، جب ملک پر بیرونی حملہ ہوتا، اس وقت کشمیری سردار بھاگ کر پہاڑیوں میں چھپ جاتے، اور وہاں سے جنگ جاری رکھتے، وہ دشمن کی رسد کا سلسلہ کاٹ دیتے، اپنی پہاڑی کمین گاہوں سے ان پر چھاپہ مارتے اور غنیم کو صلح کرنے یا واپس ہونے پر مجبور کر دیتے۔

قلعے جو مختلف جنگی مقامات پر واقع تھے، خانہ جنگیوں یا بیرونی حملہ کے وقت زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوتے، جنگ یا تو پہاڑ کے تنگ راستوں، دروں یا میدانوں میں ہوتی تھی، قلعے صرف اس حیثیت سے مفید ہوتے کہ وہاں سے فوجی دستے دشمن پر حملہ کرنے کے لئے نکلتے تھے، ان قلعوں سے دشمن سے غنیم کی پیش قدمی روکنے کا کام نہیں لیا جاتا تھا، اور غنیم بھی ان کا محاصرہ کرنے کے لئے کبھی رکتا نہیں تھا، یہ بات قابلِ غور ہے کہ خود سری نگر میں کوئی قلعہ نہیں تھا، نوشہر (سری نگر) میں ایک قلعہ ضرور تھا، لیکن یہ مضبوط نہیں تھا، اس پر قبضہ کرنے کیلئے جنگ یا تو آس پاس یا خود شہر میں ہوتی، خانہ جنگی کے زمانہ میں شہر کے دفاع کے خیال سے دریائے جہلم کے پل عام طور سے تباہ و برباد کر دیئے جاتے تھے، لیکن یہ طریقہ زیادہ کارگر نہ تھا، کیونکہ بہادر سپہ سالار اپنی فوج کو دریا پار کرنے پر آمادہ کر لیتا تھا۔

مال

سلاطین کے عہد میں مالی امور سے متعلق تاریخوں میں بہت کم معلومات ہیں، لیکن اتنا واضح ہے کہ ٹیکس وصول کرنے کا طریقہ ہمیشہ شریعت کے مطابق نہیں ہوتا تھا، لگان کے خاص ذرائع یہ تھے۔

۱۔خراج ۲۔ جزیہ ۳۔ زکوٰۃ، محصول اور چنگی ۴۔ دوسرے ٹیکس، ۵۔ جاگیر اور باج

خراج مسلمانوں اور غیر مسلمانوں دونوں ہی سے لیا جاتا تھا کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ مسلمان خراج دینے سے بری تھے، اور ان کو صرف دسواں حصہ دینا پڑتا

تھا[۱]۔ شاہ میر نے تخت نشیں ہونے پر اراضی کی پیداوار کا ۱/۶ حصہ لگان لگایا[۲] اس نے شرح لگان دو وجہوں سے اتنی کم کی، ایک تو وہ لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا، دوسرے یہ کہ اس نے یہ محسوس کیا کہ دو سو برس سے وادی کی مالی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی، اور کسانوں کی قوت ادائیگی بہت گھٹ گئی تھی، لیکن اس کے جانشینوں نے شرحِ لگان ۱/۶ سے ۱/۳ کر دی اور یہی شرحِ لگان سلاطین کے عہد میں جاری رہی[۳]۔ قحط یا سیلاب میں لگان کی شرح میں حکومت بڑی کمی کر دیتی، چنانچہ زین العابدین کے عہد میں قحط پڑا، تو سلطان نے لگان کی شرح گھٹا کر ۱/۴ کر دی، اور کچھ مقامات پر تو یہ شرح ۱/۷ تک کر دی گئی[۴]۔

مرزا حیدر دوغلت کے عہد میں کشمیر میں چار قسم کی زمینیں تھیں، آبی، لکمی، باغی اور چراگاہ[۵]۔ پہلی قسم کی زمین پر آب پاشی کی مدد سے فصل اگائی جاتی تھی، اس زمین پر لگان کی شرح نسبتاً زیادہ ہوتی تھی، دوسری قسم پر بارش سے کھیتی ہوتی تھی، چونکہ بارش پر کوئی اختیار نہیں تھا، اس لئے اس پر شرح کم ہوتی تھی، تیسری قسم کی زمین پر پھل کے درخت لگائے جاتے تھے، خاندان شاہ میر کے عہد میں اس پر لگان معاف تھی[۶]۔ اگرچہ خاندان چک کے اوّلین حکمرانوں نے باغوں پر ٹیکس لگا دیا تھا، یوسف شاہ نے منسوخ کر دیا[۷]۔ چوتھی قسم کی زمین یعنی چراگاہ پر جو دریاؤں کے کنارے واقع تھی، ناقابلِ کاشت ہونے کی وجہ سے اس پر ٹیکس نہیں تھا[۸]۔

۱: کشمیر میں عشری زمین نہیں تھی، ہندو مسلمان دونوں ہی پر ایک ہی شرح سے ٹیکس لگتا تھا، تاریخوں میں خراج کا لفظ بار بار استعمال ہوا ہے۔ ۲: میونخ قلمی نسخہ ورق ۵۳ ب

۳: آئین اکبری ج ۲ ص ۳۶۶ ۴: شری ور ص ۱۵۲ ۵: تاریخ رشیدی (قلمی نسخہ) ورق ۱۱۵ الف مزید آئین اکبری ج ۲ ص ۳۵۲ اور حاشیہ، دیکھئے۔

۶: تاریخ رشیدی ص ۴۲۵ ۷: حیدر ملک ورق ۱۸۲ اب

۸: تاریخ رشیدی ۴۲۵

ہر گاؤں میں حکومت کے تخمینہ کے مطابق کچھ خروار چاول ہوتا تھا اور پیداوار کو کھلیان سے گاؤں کے لوگ حکومت کا حصہ ادا کئے بغیر اٹھا نہیں سکتے تھے، یہ چاول سرکاری گوداموں میں بھر لئے جاتے اور حکومت کے مقررہ نرخ پر ایسی آبادی میں فروخت کر دیا جاتا جہاں زراعت نہ ہوتی، اس طرح قیمتوں کو بڑھنے نہیں دیا جاتا اور قلت کے زمانہ میں ذخیرہ اندوزی نہیں ہو پاتی تھی، اور لوگ سستے داموں چاول خرید سکتے تھے[1]

تاریخوں میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ سلطان سکندر سے پہلے خاندانِ شاہ میر کے حکمراں غیر مسلموں سے جزیہ وصول کرتے تھے، جزیہ سب سے پہلے سلطان سکندر نے اپنی حکومت کے نظم و نسق کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی غرض سے عاید کیا تھا[2] جب زین العابدین تخت نشین ہوا، اس نے اپنے باپ کے عہد میں مقررہ شرح کو چاندی کے دو پل سے گھٹا کر صرف برائے نام چاندی کا ایک ماشہ کر دیا، لیکن یہ بھی وصول نہیں کیا جاتا تھا، اور ایسا ہی اس کے جانشینوں نے بھی کیا لیکن جب فتح شاہ دوبارہ برسرِ اقتدار ہوا، تو اس کے وزیر اعظم موسیٰ رینا نے شمس الدین کے اثر میں آکر جزیہ دوبارہ وصول کرنا شروع کر دیا، اور سلطان اسماعیل شاہ ثانی کے وزیر اعظم دولت چک کے زمانہ تک وصول کیا جاتا رہا، اور خاندان چک کے عہد تک یہ سلسلہ جاری تھا[3] لیکن یوسف شاہ نے جزیہ منسوخ کر دیا[4] ممکن ہے کہ یعقوب شاہ نے جزیہ دوبارہ لگا دیا ہو، کیونکہ جب اکبر نے کشمیر پر قبضہ کیا، تو ہندوؤں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا، اور آخر کار اس نے منسوخ کر دیا[5]

---

[1]: شری ور ص ۱۱۹ میونخ قلمی ورق ۷۵ ب چھو اسٹین ج ۶۱۸، راجاؤں کے عہد کے حالات کے لئے مزید دیکھو ج ۱۲۴۵ اور حاشیہ نمبر ۷ [2]: حیدر ملک ورق ۱۱۳ ب، جون راج کے مطابق ص ۱۶۰ برہمنوں کو اپنی ذات برقرار رکھنے پر جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا، یہ ایک طرح کا جزیہ ہی تھا [3]: شر ور ص ۳۸۸، ۴۳۰ [4]: حیدر ملک ورق ۱۸۲ اب مزید دیکھو حیدر ملک (Bibotheque Nolionale) ورق ۱۵۹ الف [5]: شک ص ۲۱ ۔ ۴۲۰

مسلمانوں نے زکوٰۃ شریعت کے مطابق وصول کی جاتی تھی، صوفیاء اور علماء زکوٰۃ کی دائیگی کی برابر تلقین کرتے تھے[1]، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لازمی نہیں بالکل رضا کارانہ تھا، بہر حال کچھ سلاطین کے عہد میں زکوٰۃ بھی دوسرے ٹیکسوں کی طرح وصول کی جاتی تھی، چنانچہ سلطان سکندر کے عہد میں ہر ایک آدمی زکوٰۃ دیتا تھا[2]، اسی طرح یوسف شاہ صرف ملاحوں کو چھوڑ کر جو زکوٰۃ ادا کرنے کے قابل نہیں تھے، ہر ایک سے زکوٰۃ وصول کرتا تھا[3]، یہ نہیں معلوم کہ زکوٰۃ کی رقم الگ خزانہ میں رکھی جاتی یا دوسرے غیر مذہبی ٹیکسوں میں شامل کردی جاتی تھی، اور نہ کہیں اس کا ثبوت ملتا ہے کہ زکوٰۃ کا صرف کس طور پر کیا جاتا تھا، غالباً وہ ساری رقم جو سلاطین غریبوں کو دیتے تھے، یا مسافروں، طلبہ، حاجت مندوں اور طالب علموں کو کھانا اور رہنے کی جگہ فراہم کرنے میں صرف کرتے تھے، وہ زکوٰۃ ہی سے لی جاتی تھی، شریعت کے اصول کے مطابق محصول کا لینا ممنوع ہے، کیونکہ قانونی ٹیکس زکوٰۃ، خراج اور جزیہ ہیں[4]، لیکن چونکہ کسٹم سرحدوں پر وصول کیا جاتا تھا، فقیہوں نے محصول کو زکوٰۃ کے تحت لاکر نظری اور عملی تضاد کو ختم کردیا، چنانچہ مسلمان تاجروں کو زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد سرحد پار کرنے کی اجازت دے دی جاتی تھی[5] لیکن کشمیر میں اس کے علاوہ ان تاجروں کو برآمدی اور درآمدی اشیاپر بھی چوکیوں پر محصول ادا کرنا ہوتا، ان چوکیوں کو راہ داری کہتے تھے[6]، ہندو تاجروں کو بھی اپنی اشیاء پر چنگی دینی ہوتی تھی، جیسا کہ اوپر بیان آچکا ہے، کہ دروں کے محافظ خفیہ درآمد کو روکنے کے لئے موجود تھے، وہ ہر ایک تاجر سے محصول وصول کرتے تھے[7]

۱: ذخیرۃ الملوک از سید علی ورق ۲ب، ۲۴اب، نصیب ورق ۲۲۲الف ۲: میونخ قلمی نسخہ ورق ۲۴ب پر لکھا ہے کہ سکندر نے تاجروں کو زکوٰۃ ادا کرنے سے معاف کردیا تھا، لیکن یہ غلط ہے۔ ۳: حیدر ملک ورق ۱۸۲ ب ۴: Mohammaden Theories of Finance از Afhnides ص ۲۰۰ ۵: ایضاً ص ۲۶۱ وغیرہ ۶: جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ج ۱۷x۱ ص ۱۳۸۵/۱۸۶ ۷: جون راج ص ۹۷ ہندو مسلمان تاجروں کو یکساں طور پر کسٹم ادا کرنا ہوتا تھا۔

دوسرے محصول

راجاؤں کے زمانہ میں لوگوں سے طرح کے ٹیکس وصول کئے جاتے تھے، گاؤں کے لوگ اگر ان بوجھوں کو اٹھانے نہیں آتے جو ان کو اٹھانے کو کہا جاتا، تو ان کو اس بوجھ کی قیمت بطور جرمانہ ادا کرنی پڑتی تھی، مندروں کے پجاری بیگار سے محفوظ تھے[1]، شادی، دعوت اور تہوار پر[2] کوئی رقم وصول کی جاتی تھی، اور ملاحوں کاریگروں، گایوں اور سنڈ اس پر بھی ٹیکس تھے[3]، شاہ میر نے برسر اقتداء ہوتے ہی ان میں سے بہت سے ٹیکسوں کو منسوخ کردیا، اسی طرح سلطان سکندر نے باج اور تمغہ، منسوخ کردیا، سلطان زین العابدین نے دوسرے زائد ٹیکس ختم کردیئے اور اپنے حکام کو لوگوں پر من مانے جرمانے لگانے سے روک دیا، بعد میں یوسف شاہ نے کاریگروں، گایوں اور باغوں پر ٹیکس اور ملاحوں سے زکوٰۃ یعنی بند کردی[4]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام ٹیکس یک قلم منسوخ نہیں کئے گئے اور نہ بعد میں لگائے گئے، بلکہ حکمران ان کو آہستہ آہستہ منسوخ کرتے رہے جب مغلوں نے وادی کو مسخر کیا تو انھوں نے بہت سے ظالمانہ ٹیکس لینا بند کردیئے، جن میں باج، تمغہ، ایندھن پردودام ملاحوں سے محصول وغیرہ تھے۔ گانوں والوں سے بھیڑیں بھی لی جاتی تھیں[5]، یہ بھی لینا بند کردیا گیا۔

کان سے بھی آمدنی ہوتی تھی، لیکن تاریخوں میں اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، صرف اتنا معلوم ہے کہ دریاؤں کے کناروں سے سونے کے ذرات اکٹھا کئے جاتے تھے، زین العابدین کے عہد میں اس میں حکومت کا حصہ ۱/۶ تھا، اور غالباً بعد کے حکمرانوں نے بھی یہی شرح قائم رکھی۔

۱: اسٹین ج ۵ نمبر ۴ ۱۱۷ اور حاشیہ ۲: ایضاً ج، نمبر ۴۲ نمبر ۱۴۲۸ ۳: ایضاً ج، نمبر ۱۱۰۷ ۴: حیدر ملک ورق ۱۸۲ اب ۵: آئین اکبری ج ۲ ص ۱۳۶۷ Trunels از مور کرافٹ ص ۱۲۷/ ۲۶ پر لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں نانبائی، قصاب الماح، مہتر اور طوائفوں تک پر ٹیکس تھا

جاگیریں اور باج

ہندوؤں کے عہد میں امراء اور عمال کو جاگیر عطا کرنے کا عام رواج تھا، جب شاہ میر نے اپنی حکومت مستحکم کی، تو اس نے بغیر سوچے سمجھے جاگیریں دینے سے احتراز کیا، کیونکہ اس کی رائے میں اس سے امراء کی طاقت بڑھتی اور بغاوت کی ہمت افزائی ہوتی تھی، لیکن اس کے جانشینوں نے اس روش کو اختیار نہیں کیا، اور وہ دل کھول کر جاگیر عطا کرتے رہے، خاندانِ شاہ میر کے آخری دور میں امرء ملک کے اصل حکمران بن بیٹھے تھے، انھوں نے سلاطین کو شاہی زمینوں کو چھوڑ کر، ساری وادی ان کو دینے پر مجبور کیا، اور اس کو آپس میں تقسیم کر لیا، جب خاندانِ چک برسر اقتدار ہوا تو اس نے یہ جاگیریں واپس لے لیں، اور اپنے درباریوں اور عمال کو نئی جاگیریں دیں، یہ جاگیریں موروثی ہوتی تھیں، اور ان کا انتظام ان کے مالکوں کے ہاتھ میں ہوتا، لیکن جاگیرداروں کی غداری کی صورت میں یہ جاگیریں ضبط بھی ہو سکتی تھیں[1]

قرب وجوار کی ریاستوں سے جو کشمیر کے زیر نگیں تھیں، باج کی وصولی کا کوئی اطمینان بخش طریقہ نہ تھا، کیونکہ اس کا انحصار مرکزی حکومت کی طاقت پر تھا، باج عام طور سے جنس کی صورت میں وصول ہوتا، چنانچہ لداخ اور بلتستان سے سلاطین کو اون اور چمڑا، اور کشتواڑ سے زعفران ملتا[2]

معاشرتی اور معاشی حالات

چودھویں صدی کے آخری نصف حصہ اور اس کے بعد کشمیر میں اسلام کے فروغ سے عوام کی زندگی میں ایک بڑا انقلاب رونما ہوا، ایران اور ترکستان سے ثقافتی تعلقات قائم ہوئے، اور ان ملکوں سے مسلمان بہت بڑی تعداد میں آئے تو معاشرت میں گہری

۱: شری ور ص ۲۴۴ ۲: Travels in the Mughal Empire از بر ص ۴۲۰ ابراہیم شاہ کے عہد میں لداخی بطور لگان پانچ سو گھوڑے، ایک ہزار پٹو کے ٹکڑے پچاس پاک اور دو سو تولہ سونا دیتے تھے۔ (طبقات اکبری ج ۳ ص ۴۸۱)

تبدیلیاں نمایاں ہونے لگیں، لیکن اِن بیرونی اثرات کے باوجود ماضی سے رشتہ نہیں ٹوٹا کیونکہ کشمیری اپنے اعتقادات اور رسم و رواج کو ایک دم چھوڑنے پر تیار نہ تھے، چنانچہ چودھویں اور پندرہویں صدی میں ان لوگوں میں مستقل آویزش ہوتی رہی، جو روایتی رسم و رواج سے چمٹے رہنا اور جو اسلامی طرز زندگی اختیار کرنا چاہتے تھے، آخری کار یہ آویزش اس طرح ختم ہوئی کہ دونوں طرزِ زندگی ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے جس سے ایک نیا سماج وجود میں آیا، اور قدیم و جدید طرز ایک دوسرے سے مل گئے۔

معاشرہ

کشمیر میں ہندوؤں کے عہد میں معاشرہ چار ذاتوں میں تقسیم تھا، لیکن یہ تقسیم ہندوستان میں بے لوچ تھی، یہاں نہ تھی کیونکہ ہندو راجہ ڈومینوں یا طوائفوں کو اپنی زوجیت میں لے کر ان کو خاص رانیوں کا مرتبہ عطا کرتے تھے[1] اس عہد میں اس کی میں کی مثال بھی ملتی ہے، کہ نیچی ذات کے لوگ ترقی کر کے حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر پہنچ گئے، تاہم برہمنوں کو کافی مراعات حاصل تھیں، جو برہمن مندروں کی دیکھ بھال کرتے تھے، ان سے بے گار اور ٹیکس نہیں لیا جاتا[2]، برہمن پروہت سلطنت کے معاملات میں اکثر مداخلت کرتے تھے، اور اگر ان کو کوئی بات ناپسند ہوتی، تو وہ برت رکھتے تھے، اور حکومت کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتے[3]

اسلام کے فروغ کے بعد برہمنوں کا اثر کم ہوتا گیا، کیونکہ ان کی جگہ اب سادات، علماء پیروں اور مسلمانوں کے دوسرے فرقوں نے لے لی تھی، ایک دوسری بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ برہمنوں کو چھوڑ کر جو تبدیلی مذہب کے مخالف تھے دوسری ذاتوں کے لوگ مشرف بہ اسلام ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ صرف برہمن بچے رہے، اور ساری ذاتیں ختم ہو گئیں، لیکن

۱: اسٹین ج ۵ نمبر ۱۶۱ ۳ وغیرہ ۷ نمبر ۲۔ ۱۴۶۰　۲: ایضاً ج ۵ نمبر ۴ ۱۷ اور حاشیہ ۴ ۱۷

۳: ایضاً ج، ص نمبر ۴۔ ۱۳ اج نمبر ۶ ۲۰۷۔

ہت سے نومسلموں نے اپنے خاندانی نام نہیں چھوڑے، چنانچہ کول، بٹ، ایتو، منٹو، گنائی
ور رینا (رازداں) برہمنوں کی نسل سے ہیں، اور مارگرے، ڈار، (ہندوؤں میں دریادھر)
رینا (راجپوت) راٹھور، ٹھاکر، نانک، اور چک چھتری نژاد ہیں[1] لیکن کچھ ایسے بھی
خاندان بھی تھے، جنہوں نے تبدیلی مذہب کے بعد پرانے نام چھوڑ دیئے، اور پیشہ کے
نام سے پکارے جانے لگے[2] اور برہمن جو اپنی ذات اور دھرم سے منسلک رہی امتداد
زمانہ کے ساتھ دو فرقوں میں بٹ گئے، ایک فرقہ کارکن کہلایا، جو فارسی پڑھ کر سرکاری
ملازمت میں داخل ہو گیا، اور دوسرا فرقہ بھاشا بھٹ کہلایا جو سنسکرت کے مطالعہ سے قوم
کے مذہبی امور کی دیکھ بھال کرتا تھا[3]

اگرچہ کشمیر میں ذات پات کے امتیازات بڑی حد تک ختم ہو گئے، لیکن ان کی
جگہ طبقاتی امتیازات نے لے لی جن کی وجہ سے پرانے اصولوں میں سختی باقی رہی، اسلام
بلاشبہ ایک اتحاد پیدا کرنے اور دوسروں کو خود میں سمونے والی طاقت تھی، اور صوفیہ نے
مختلف طبقات کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی، لیکن معاشی ناہمواری اور
پیشہ ورانہ امتیازات کی بنا پر حقیقی معاشرتی مساوات پیدا نہ ہو سکی۔

امراء

سلطان اور اس کے خاندان کا مرتبہ سب سے بلند ہوتا تھا، اس کے بعد وہ امراء
ہوتے جو اپنے خانداں مثلاً چک، ماگرے، رینا، ڈار اور بٹ خاندانوں کے سربراہ ہوتے

۱: Valley از لارنس ص ۳۰۲، رینا دو فرقوں پر مشتمل ہیں (۱) برہمن جو اپنے کو رازداں کہلاتے ہیں (۲)
راجپوت جو اپنے کو چندر بنسی راجاؤں کی نسل سے بتاتے ہیں، وہ کشمیر میں راجہ جے سنگھ کے عہد میں نگرکوٹ
سے آئے تھے (تاریخ حسن ورق ۱۶۶ الف ب) ۲: کشمیر میں کبھی کسی شخص کو بھی اس کے خاص پیشہ یا کچھ
خاص حالات کی بنا پر جن میں وہ رہا کوئی، کرام، یا عرف عام کا نام دینے کا قدیم رواج رہا ہے۔ ۳: A
History of Kashmiri Pandits از ص ۵۲

ان کے پاس بڑی بڑی جاگیریں ہوتیں اور وہ حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہوتے ،ان کے خطابات، حقوق اور جاگیریں مغل امراء کے برخلاف نسل در نسل چلتی رہتیں، اور سوائے بغاوت کے الزام کے وہ کبھی ضبط نہ ہوتیں، اپنی دولت اور حیثیت کی بنا پر یہ امراء اپنے ساتھ بہت سے مصاحب رکھتے ،امراء عام طور سے علم و ادب کے دل دادہ ہوتے اور اہل علم کی سرپرستی کرتے وہ مذہبی عمارتیں بنواتے ، اور تعلیم کے لئے جائیدادیں وقف کرتے ، اس کے علاوہ ان ہی میں سے فوجی اور غیر فوجی افسر بھی لے جاتے جو بیرونی حملوں سے ملک کو بچاتے ، لیکن وہ اپنی زیادہ تر قوت سلاطین کے لطف و کرم کے حاصل کرنے میں ایک دوسرے کے خلاف سازش کر کے ضائع کرتے یا اگر سلطان کمزور ہوتا تو اس کے سارے کام خود سنبھال لیتے ، یا اس کی جگہ لے لیتے ، اسی طرح چکوں نے خاندان شاہ میر کی جگہ لے لی، اور اپنے خاندان کی داغ بیل ڈالدی ، لیکن اس تبدیلی سے بھی جاگیرداروں کی باہمی رقابت اور ریشہ دوانیوں میں کمی نہیں آئی ، چنانچہ خانہ جنگیوں نے ایسی خراب صورت حال پیدا کردی ، جس سے بیرونی حملوں کو شہ ملی اور آخر کار کشمیر کی آزادی ختم ہوگئی۔

مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں جو خاندان ممتاز رہے، وہ یا تو بیرونِ ملک سے آئے تھے ، یا انھوں نے سلاطین کے عہد میں اہمیت حاصل کر لی تھی ، چک کشمیر میں سہدیو کے عہد میں اور بیہقی سادات سکندر کے دور حکومت میں آئے تھے ، رینا ، ماگرے ، ڈار ، اور دوسرے خاندان کشمیر ہی کے تھے ، لیکن رینا خاندان کو چھوڑ کر بقیہ کی اہمیت مسلمانوں کے دور میں بڑھی شہزادوں کا لقب ہمیشہ خان ہوتا ، لیکن کبھی کبھی امراء بھی اپنے نام کے ساتھ خان استعمال کرتے ، اس کے علاوہ سلاطین کی طرف سے امراء کو ملک امیر لامراء ، خان زمان ، مرزا[1] اور شوکت جنگ کے لقب بھی عطا ہوتے تھے ،

[1] : یہ خطاب خاندان چک کے عہد میں شہزادوں کو ملا تھا دیکھو حیدر ملک ورق ۱۸۴ ب اور بہارستان شاہی ورق ۱۶۹ (ب)

سلاطین، چک، ماگرے اور بیہقی سادات کے خاندانوں میں شادی بیاہ کرتے، اس کے علاوہ انھوں نے جموں، کشتواڑ اور راجوری کے راجاؤں اور پکھلی اور سندھ کے حکمرانوں کے خاندانوں سے بھی رشتے کیئے، امراء عام طور پر اپنے ہی خاندان میں شادیاں کرتے تھے، لیکن مختلف خاندانوں میں بھی شادیاں ہوجاتی تھیں[1] اگر چہ معاشرتی حیثیت کو بلند رکھنے کے سلسلہ میں خاندانی، امتیاز کو بڑا دخل تھا، لیکن معاشرہ کوئی محدود دائرہ نہیں تھا، کیونکہ ہمارے سامنے معمولی اور غریب گھرانوں کے گمنام افراد کی مثالیں موجود ہیں جو اپنی صلاحیت اور محنت کے بل بوتے پر اونچے مراتب پر پہنچتے۔

مذہبی طبقہ

امراء کے بعد مذہبی تھا جو علماء سادات، صوفیہ اور ان کی نسل کے لوگوں پر مشتمل ہوتا۔

(الف) علماء:۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے رو سے اسلام میں مذہبی پیشواؤں کا کوئی خاص طبقہ نہیں ہوتا، لیکن جو قرآن حدیث کی تعلیم پاتے رفتہ رفتہ فقیہوں کے حیثیت سے وہی حیثیت اختیار کر لیتے تھے، جو عیسائیوں میں پادریوں کی تھی، اور اپنے علم و تقدس کی بناء پر عوام اور پبلک میں ان کی بڑی عزت تھی، اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ علماء قابلِ تعظیم ہیں، کیونکہ وہ رسول کے جانشین ہیں، جو علماء کی تعظیم کرتا ہے وہ رسول اور اللہ کی تعظیم کرتا ہے چنانچہ تمام اسلامی ملکوں کی طرح کشمیر میں بھی علماء کی بڑی تعظیم و تکریم ہے ان میں سے قاضی، مفتی، اور شیخ الاسلام مقرر کیئے جاتے، اصولی طور پر تو علماء کا طبقہ جمہوری اصولوں کا پابند تھا، لیکن عملی طور پر ان میں موروثی رجحانات پائے جاتے تھے، بہت سے علماء بیرونی نسل کے تھے، اور دینیات، منطق، اور حدیث پر عبور رکھتے تھے، کشمیری علماء سری نگر میں اہل علم سے تعلیم پا کر سمرقند، ہرات اور مکہ سفر کرتے اور مزید تعلیم پا کر واپس ہوتے، اس کے بعد ان کو سند یافتہ فقیہہ سمجھا جاتا، اصولی طور پر علماء

---

[1]: شری درص ۳۲۴۔۳۰۳، شک ص ۳۵۹

سادہ اور زاہدانہ زندگی بسر کرتے اور شریعت کو ہر حال میں برقرار رکھتے، اور بدعات کی مخالفت کرتے رہتے، ان کی دلچسپیاں صرف معاشرتی اور مذہبی مسائل تک محدود نہیں تھیں، کبھی کبھی تو وہ اپنے زمانہ کی سیاست میں بھی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔

(ب) سادات

چودہویں صدی میں سادات کی ایک کثیر تعداد پہلے تو منگولوں اور بعد میں تیمور کے عتاب سے محفوظ رہنے کیلئے کشمیر میں پناہ گزین ہوئی تھی، کشمیر ان کو اس وجہ سے پسند آگیا، کہ وسط ایشیا اور ایران کے آئے دن کے معاشرتی اور سیاسی انقلابات کے مقابلہ میں وادی میں نسبتاً زیادہ امن وسکون تھا اس کے علاوہ سلاطین کی سرپرستی بھی انہیں کھینچ لائی تھی، ہجرت کا یہ سلسلہ سلطنت کے زوال تک چلتا رہا۔

سادات حضرت فاطمہؓ کی اولاد ہونے کی وجہ سے حضرت محمد ﷺ کی نسل سے ہیں، اس لئے مسلمانوں میں وہ وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، ان کی خاص تعظیم و تکریم ہوتی، اور سلطان اور امراء ان کو ہر طرح کے لطف وکرم سے نوازتے، کشمیر میں آنے والے مہاجروں میں کچھ سادات فقیہہ بھی تھے، سلاطین نے ان کو قاضی اور مفتی کے عہدوں پر مامور کیا، کچھ سادات نے درس وتدریس کا کام شروع کیا اور جو متقی پرہیز گار تھے، وہ رشد وہدایت میں لگ گئے، اور عوام کے مرشد اور ہادی بن گئے، کچھ دیہات جا کر کاشتکاری کرنے لگے، بعض سادات سیاست میں حصہ لینے لگے، انھوں نے سلاطین کے خاندان میں شادی بیاہ کئے، اور اس طرح کشمیری امراء کی صف میں شامل ہو گئے، لیکن اپنے تکبر اور اولوالعزمی کی بنا پر کشمیری سردار اُن سے جلنے لگے، اور ان کو نیچا دکھانے کی سازش میں مصروف ہو گئے، آہستہ آہستہ بعض سادات نے اعتدال اور حب الوطنی کی پالیسی پر چل کر اپنے اوپر غیر ملکی ہونے کا الزام دور کر دیا اور لوگوں کا اعتماد حاصل کر لیا، اس کے بعد انھوں نے وادی کی معاشرتی اور سیاسی تاریخ میں بہت سے اہم کارنامے انجام دیئے۔

(س) صوفیہ

عہدِ وسطیٰ کے کشمیر میں پیروں اور ان کے مریدوں کو کافی اہمیت حاصل تھی، معاشرتی، مذہبی اور ثقافتی زندگی پر علماء سے زیادہ ان کا اثر تھا، ایک تو ان کے علم وتقویٰ کا اثر تھا، دوسرے ان کی کرامات کی وجہ سے عوام میں ان کی بڑی عزت تھی، وہ سادہ زندگی بسر کرتے لیکن نہ تو وہ تارک الدنیا ہوتے اور نہ اپنے آپ کو عوام اور ان کے مسائل سے الگ کرتے، بلکہ ان میں سے زیادہ تر عام آدمیوں کی طرح رہتے سہتے، شادی کرتے، بال بچے پیدا کرتے، اور لوگوں کے معاملات میں سرگرمی سے حصہ لیتے[1]

میر سید علی ہمدانی کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی ساری خواہشات مذہبی احکام کے مطابق تو ہوں لیکن ہندو سادھوؤں اور مسلمان فقیروں کی طرح ان خواہشات کو بالکل ختم نہ کر دینا چاہیے[2] انھوں نے ہاتھ پاؤں کو بے کار کر دینے یا بلا وجہ اپنے جسم کو ایذا پہنچانے کی سخت مذمت کی، ان کا ایمان متوازن زندگی[3] پر تھا، جو زندگی کے زرین اصول ہیں۔

پیر، شہزادوں اور امراء کی تعمیر کی ہوئی خانقاہوں[4] میں اپنے خاندان اور مریدوں کے ساتھ رہتے تھے، وہ ان کے ساتھ عبادت کرتے[5] اور علم معرفت کی ساری باتیں سیکھتے، پہلے بیعت کی ایک چھوٹی سی رسم ہوتی، اور مرید سچے دل سے زہد واطاعت کا عہد کرتا، اس کے بعد وہ پیر کی معیت میں رہتا اور آہستہ آہستہ وہ سلوک کے اعلیٰ مدارج طے کرتا، اور

۱: باباحسن حمزہ مخدوم اور دوسرے صوفیوں نے اپنے عہد کی سیاست میں جو حصہ لیا، اس کا پہلے ذکر آچکا ہے

۲: ذخیرۃ الملوک از سید علی ہمدانی ورق ۱۴۲ الف

۳: ایضاً ورق ۴۸ ب

۴: خانقاہوں کا نظام ہندوستان ایران اور ترکستان میں یکساں تھا۔ ۵: جڈی بل کی خانقاہ میں پیشہ ور مرید اپنے کنبوں کے ساتھ رہتے تھے اور ان کا خرچ وقف کی آمدنی سے چلتا تھا، (دیکھو تحفۃ الاحباب ص ۲۴۴ وغیرہ)

پھر باہر جا کر اپنے مرشد کے طریقوں کو پھیلاتا اور نئے، مرید بناتا[1]، جب پیر کی وفات ہو جاتی، تو مریدوں میں اخلاقی، ذہنی اور روحانی اوصاف کے لحاظ سے جو سب سے افضل ہوتا، وہی خلیفہ ہوتا، کبھی کبھی اس تقرر میں وراثت کا بھی دخل ہوتا، خانقاہ میں نماز باجماعت کے لئے ایک امام بھی ہوتا[2]۔

ازمنہ وسطیٰ کے کشمیر میں صوفیہ کے چھ خاص سلسلے تھے، ان کے نام یہ ہیں، قادریہ، سہروردیہ، کبرویہ، نقشبندیہ، نوربخشیہ اور رشی، ان میں سے پہلے پانچ ایران اور ترکستان سے آئے، البتہ رشی سلسلہ خالص کشمیری تھا[3]، اس سلسلہ کے بانی نورالدین تھے[4]، ان کی پیدائش ۷۷۹ھ مطابق ۱۳۷۷ میں بیج بہادر کے دو میل مغرب میں کیموہ گانوں میں ہوئی تھی، ان کے والد بزرگوار کا نام شیخ سالارالدین تھا، جو خود بھی بڑے متقی اور پرہیزگار تھے، اور کشتواڑ کے شاہی خاندان سے تھے، اگرچہ نورالدین راسخ العقیدہ مسلمان تھے، لیکن ان پر تارک الدنیا سادھوؤں کا اثر تھا، سید علی ہمدانی اور شمس الدین کے برخلاف انھوں نے گوشہ نشینی کی زندگی کو پسند کیا، اور اکثر غاروں میں ذکر و فکر اور عبادت کے لئے چلے جاتے، انھوں نے دنیا اور اس کی مسرتوں سے کنارہ کشی اختیار کی، بیوی بچوں کو خیرباد کہا اور گوشت کھانا ترک کر دیا، زندگی کے آخری ایام میں وہ روزانہ صرف ایک پیالہ دودھ پیا کرتے اور مرنے سے کچھ دن قبل صرف پانی پیتے، ان کا انتقال ۶۳ سال کی

۱: دیکھیے Mohammadanism از گب ص ۵۲۔۵۱ جہاں پیروں اور مریدوں کے تعلقات کا ذکر ہے کشمیر میں بھی کم و بیش وہی حالات تھے، مرید پیر کو خدا اور رسول کا نائب اور ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا انتہائی ضروری سمجھتے تھے، (دیکھو حلیۃ العارفین از خواجہ اسحاق قاری ص ۱۲ب اور تحفۃ الاحباب ص ۹۹، ۱۲۹ وغیرہ

۲: چلچلتہ العارفین از اسحاق ورق ۱۹لف ب

۳: رشی سنسکرت کا لفظ ہے جس کا مطلب سادھو، عالم یا سنیاسی ہوتا ہے

۴: اسرارالابرار از داؤد مشکوٰتی رق ۱۶۳ الف

عمر میں ۸۴۲ مطابق ۱۴۳۸ء میں ہوا، ان کے مرید کثیر تعداد میں تھے، جن میں بابا نصیر الدین، بابا ایام الدین، بابا زین العابدین اور بابا لطف الدین کافی ممتاز تھے، ان کے مقبرہ جو سرینگر سے جنوب مغرب میں چرار میں واقع ہے، ہر سال ہزاروں ہندو مسلمان زیارت کے لئے جاتے ہیں۔

نورالدین کی وفات کے بعد رشیوں میں ترک دنیا کے رجحانات بڑھتے گئے اور انھوں نے سولہویں صدی کے شروع ہی سے حکمراں طبقہ کی حرص، طمع، خود غرضی اور مستقل خانہ جنگیوں سے تنگ آکر دنیا سے مکمل کنارہ کشی اختیار کرلی، وہ شادی نہیں کرتے، اور نہ گوشت کھاتے اور سوکھی روٹی اور پہاڑ کے جنگلی پھل کھا کر گذر بسر کر لیتے، وہ آبادی سے دور رہتے، اور ایک مقام سے دوسرے مقام میں منتقل ہوتے رہتے، اور لوگوں کی بھلائی کے لئے سایہ دار اور پھل دار درخت لگاتے[۲] نورالدین اور ان کے مریدوں کے برخلاف آخری دور کے رشی زیادہ تر کم معرفت تھے، اور اپنے مذہب کا انہیں کوئی علم نہیں تھا، تاہم وہ پرہیزگاری، نفس کشی، سادگی اور نیکوکاری کی زندگی بسر کرتے، اکبر اور جہانگیر کے عہد میں وادی میں تقریباً ۲ ہزار رشی تھے[۳]

صوفیوں نے کشمیر میں اسلام کے فروغ میں کافی اہم حصہ لیا، اس کے علاوہ تصوف میں معاشرتی مساوات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اس لئے صوفیہ امراء اور غرباء کے درمیاں رابطہ بن گئے تھے، ذکر کی مجالس نہ صرف عبادت و ریاضت کے لئے تھیں،

۱: نورالدین کی زندگی کے لئے دیکھو تذکرہ مشائخ کشمیر از بابا نصیب ورق ۱۹۰ اب وغیرہ فتوحات کبرویہ ورق ۲۱۵ ب وغیرہ ا تاریخ کبیر از مسکین ص ۹۲ وغیرہ، اسرار الابرار ورق ۶۲ ب وغیرہ ۲: ہفت اقلیم ورق ۱۵۲ الف نصیب ورق ۴۱۵ الف ۱۴۱۷ الف تزک جہانگیری ص ۵۰-۴۹ ۳: تزک جہانگیری ج ۲ ص ۵۰-۱۴۹ ہفت اقلیم از رازی ورق ۱۵۶ الف رشی مسلمان تھے، لیکن جادو ناتھ سرکار نے جاریٹ Jerret (آئین اکبری ج ص ۳۵۳) کی غلطی درست نہیں کی جس نے ان کو برہمن کہا ہے۔ (دیکھو تزک جہانگیری ج ۲ ص ۱۴۹)

بلکہ ان کا ایک معاشرتی مقصد بھی تھا، کہ ان مجلسوں میں مختلف طبقوں کے لوگ امارت و غربت کا خیال کئے بغیر ایک جگہ مل بیٹھتے۔

صوفیہ ظلم اور ناانصافی کے خلاف ہمیشہ آواز اٹھاتے رہے، مثال کے طور پر نورالدین ریشی نے ایک گاؤں کے کسانوں پر ظلم کرنے کی وجہ سے وہاں کے حاکم کی سخت سرزنش کی[1]۔اسی طرح سید علی ہمدانی حکمرانوں کو ہمیشہ انصاف اور نرمی سے حکومت کرنے کی نصیحت کرتے تھے، ان کی رائے میں ایک انصاف پسند حکمراں قیامت کے دن خدا کے قریب تر ہوگا، اور ظالم حکمران کو سخت سے سخت سزائیں ملیں[2]

صوفیہ معاشرتی مصلح بھی تھے، چنانچہ سید محمد ہمدانی کے زیرِ اثر سلطان سکندر نے ہر قسم کی منشیات، ستی، اور دوسری رسموں کو ممنوع قرار دیا، حضرت مخدوم حمزہ لوگوں کی نیکو کاری کی زندگی بسر کرنے، مذہبی ٹیکس ادا کرنے اور علم حاصل کرنے کی تلقین کرتے تھے[3]

تصوف کے فوائد سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس کا ایک رجعت پسندانہ پہلو بھی تھا، اس میں عالم بالا پر زیادہ زور دیا جاتا تھا، اس کی وجہ سے تسلیم و رضا اور فرار پسندی کے فلسفہ کو فروغ ہوا، جس کے خاص نمائندے کشمیر کے رشی تھے

تاجر دکاندار چھوٹے سرکاری ملازمین اور صنّاع

کشمیر کی اندرونی اور بیرونی تجارت سے امیروں کا ایک ایسا طبقہ معرضِ وجود میں آیا، جس کا معاشرتی مرتبہ یوں تو دکان داروں اور چھوٹے سرکاری ملازموں کے برابر تھا، لیکن اپنی دولت کی وجہ سے وہ سلاطین اور امراء کے مقرب ہو گئے تھے اور کبھی کبھی ملک

---

۱ : نورنامہ از نصیب الدین ورق ۱۹۲ الف

۲ : ذخیرۃ الملوک از علی ہمدانی ورق ۶۵ ب ۶۷ ب

۳ : چلچلتہ العارفین از اسحاق۔ورق ۱۱۲ الف

کے امور میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے، چنانچہ شری بھٹ تاجر تھے، لیکن سلطان سکندر ان کی بہت عزت کرتا تھا[1]، مرزا حیدر دوغلت کا سفیر خواجہ حاجی بھی ایک تاجر تھا، اس نے اپنے زمانہ کی سیاست میں بہت اہم کام کئے، حسین شاہ چک کے عہد میں فتح خواجہ بقال وزیر اعظم بنا، اور اس کو خان زمان کا خطاب ملا، اس کے لڑکے کو بھی کچھ عرصہ تک سلطان کا اعتماد حاصل رہا، دولت مند تجار سری نگر میں جہلم کے کنارے اور بارہ مولہ میں اپنے خوبصورت مکانوں میں رہتے تھے[2]، دکاندار چھوٹے سرکاری ملازمین اور صناع شہر کے گنجان علاقوں میں رہتے تھے۔

عوام

عوام میں کسان، دستکار، ملاح، قصاب، باغبان اور چھوٹے کام کرنے والے لوگ شامل تھے، یہ سب کے سب ہندو نژاد تھے، جو زین العابدین کے عہد تک آتے آتے مسلمان ہو گئے تھے، اس لئے تبدیلی مذہب کے باوجود، ان کے ساتھ ذات پات کی کچھ خصوصیات چمٹی رہ گئی تھیں، ان کے اندر ذات پات کے رسوم اور کام باقی رہے، اور مختلف طبقوں میں شادی بیاہ بہت کم ہوا کرتا، سب سے نچلے درجہ پر چنڈال، ڈوم اور چمار تھے، چنڈال چوکیداری کے علاوہ چھوٹے موٹے کام مثلاً پھانسی پائے اور جنگ میں کام آئے ہوئے آدمیوں کی لاشوں کو اٹھانے کا کام بھی کرتے تھے[3]، وہ کاشتکاری بھی کرتے، لیکن غربت کی وجہ سے کبھی کبھی چوری بھی کرتے تھے[4]، ڈوم بہت غریب تھے، چوری کرتے اور اخلاقی طور پر گرے ہوئے تھے، بہر حال وہ اچھے سپاہی ہوتے تھے، اور ان کو فوج میں بھرتی کیا جاتا تھا[5]، جو کشمیر میں سلاطین کے عہد میں آئے تھے، مردہ جانوروں کی کھال اتارتے

۱: جون راج (بمبئی ایڈیشن) نمبر ۷۷۶ ۲: تزک جہانگیری ج ۲ ص ۱۳۴

۳: شری ور ص ۱۹۲، ۲۷۴ ۴: ایضاً ص ۱۰۱ ۵: جون راج ۹۵، شری ور ص ۲۸۴، ۳۱۳

تھے[1]، وادی کے چرواہے چوپان کہلاتے، اور ان کا الگ گروہ تھا[2]، لیکن وہ گلوانوں (Galowens) میں شادی بیاہ کرتے تھے[3]، عہدِ وسطیٰ کے اسلام میں معاشرتی اور سیاسی زندگی میں غلامی کو خاص اہمیت حاصل تھی، لیکن یہ رسم کشمیر میں بڑے پیمانہ پر نہیں پائی جاتی تھی، یہ حقیقت ہے کہ کچھ سلاطین کے پاس غلام تھے، جن میں سے بعض نے حکومت کے بڑے اونچے مراتب حاصل کئے لیکن تاریخوں میں اس کا ثبوت نہیں کہ تاجر اور امراء بھی غلام رکھتے تھے، کشمیری رسم غلامی سے واقعتہً نفرت کرتے تھے[4]

عورتوں کی حیثیت

کشمیر میں عورتوں کی حیثیت ایران، ترکستان اور ہندوستان کی عورتوں کی سی تھی، اونچے طبقہ کی عورتیں پردہ نشین تھیں، لیکن گاؤں اور شہر دونوں میں نچلے طبقہ کی عورتیں اپنے گھر کی چاردیواری میں رہنے کی عشرت سے محروم تھیں، اور نقاب کے بغیر آزادی سے گھومتی پھرتیں، گھر کے باہر کام کرتیں، کھیتوں، باغوں اور دریاؤں میں اپنے شوہروں کے ہاتھ بٹاتیں۔

متمول گھرانوں کی عورتوں میں تعلیم عام تھی، وہ بہت مہذب ہوتیں، وہ اسکول کھولتیں، خانقاہ اور مساجد بنواتیں اور امورِ مملکت میں حصہ لیتیں جیسا کہ سورہ حیات خاتون، گل خاتون جاہل تھیں، کیونکہ ان کے پاس نہ تو اسکول جانے کا وقت تھا اور نہ ذاتی معلموں سے پڑھنے کے ذرائع تھے، لیکن یوسف شاہ کی ملکہ حبہ خاتون کی زندگی ظاہر کرتی ہے کہ کسانوں کی لڑکیوں کو بھی جو حصولِ علم کا شوق رکھتیں، مواقع کی کمی نہیں تھی، اور وہ ان سے فائدہ اٹھاتی تھیں۔

۱: Wardofilalla از ٹمپل ص ۷۔۲۰۷ ۲: حیدر ملک ورق ۱۵۳اب

۳: Valley: از لارنس ص ۳۱۲ ۴: حیدر ملک ورق ۱۱۰الف راجاؤں کے عہد میں لباس کے لئے دیکھو

Early History and Culture of Kashmir از ص ۱۰۔۲۰۸

جیسا کہ آج بھی رواج ہے، شادیاں والدین کی پسند سے ہوتی تھیں، کثرتِ ازدواج کا عام رواج تھا لیکن عام طور پر گھروں میں داشتہ عورتوں کے رکھنے کا دستور نہ تھا، اگرچہ زنانِ بازاری سے تعلق رکھنے کا عام رواج تھا، لیکن حیدر شاہ اور حسن شاہ کو چھوڑ کر، جو عورتوں کی صحبت کے گرویدہ تھے، بقیہ تمام سلاطین زیادہ تر اچھے اخلاق کی زندگی بسر کرتے، اور شرعی حدود کے اندر چار بیویوں سے زیادہ نہیں رکھتے، سلاطین کے دربار جنسی آلودگیوں اور عیاشی سے پاک تھے، یہ باتیں آخری ہندو راجاؤں کی عہد کی خاص خصوصیات میں شامل تھیں۔

لباس

لباس اونچے طبقہ کا لباس وہی تھا، جو عرب، ایران اور ترکستان کے دولت مند لوگوں کا تھا، شاید سلطان قطب الدین کے دورِ حکومت میں سید علی ہمدانی نے اس لباس کو رائج کیا، اور سلطان سکندر کے زمانہ تک تو برہمنوں نے بھی اس کا استعمال شروع کر دیا تھا[۱] جسم کا نچلا حصہ ایرانی طرز کے چوڑے پائجامے (سراول) سے ڈھاپنا جاتا، اوپر کے حصہ پر پوری آستین کی قمیص ہوتی[۲] اور قمیض کے اوپر چھوٹی سی صدری ہوتی، اوپر کے کپڑے کو چغہ کہتے جو کہ ٹخنوں تک لٹکتا رہتا[۳] چغہ میں لمبی اور ڈھیلی آستین ہوتی اور کمر کے گرد کمر بند (ٹپکا) ہوتا[۴] سر پر جسیت ٹوپی ہوتی جس پر کپڑا لگا ہوتا، جو عمامہ کا کام کرتا[۳] قاضی اور علماء سیاہ رنگ کا عمامہ پہنتے[۵] تقریبوں میں ریشمی لباس پہنے جاتے[۶] اور سلاطین اپنے

۱: جون راج ص ۶۷

۲: نصیب ورق ۴۲۳ الف، اسی ورق پر چمڑے کے کرتے کا بھی ذکر ہے

۳: بہارستان شاہی ورق ۱۳۲ ب، ۱۳۹ ب پر "قبا" درج ہے　۴: شری ور ص ۲۶۵،

۵: ایضاً ۲۱۴، ۲۴۵، ۲۶۵　۶: تحفۃ الاحباب ص ۹۰

۶: شری ور ص ۲۰۷

درباریوں کو ریشمی کپڑوں کے خلعت دیتے تھے[1] سلاطین اور امراء زیور بھی پہنتے تھے[2]

بیرونی اثرات کے باوجود نچلے طبقہ کا جو لباس ہے، اس میں ازمنہ وسطیٰ سے تبدیلی نہیں پیدا ہوئی ہے، مرد منڈے ہوئے سر پر چست ٹوپی پہنتے، وہ جانگھیا نہیں پہنتے، بلکہ ایک لمبا ڈھیلا ڈھالا اونی کرتا پہنتے جس کو پھیرن کہتے، یہ فارسی لفظ پیراہن کا بگڑا ہوا تلفظ ہے، یہ گردن سے کمر تک کھلا اور ٹخنوں تک لٹکتا رہتا، اور کمر کے گرد پٹی کسی ہوتی[3] جوتے گھاس کے بنائے جاتے[4] عورتوں کا لباس بھی وہی تھا، اس کے علاوہ سر بند بھی استعمال کرتیں، اور اس کے اوپر ایک سیاہ دوپٹہ ہوتا جو سر سے کندھے اور پیروں تک چلا جاتا، مسلمان عورتوں کے سر کے لباس کو ''کسابا'' اور ہندو عورتوں کے سر کے لباس کو ''ترنگا'' کہتے، جو ایک ٹوپی سے بندھا اور پیچھے سے ایڑی تک آتا ہے[5] آب وہوا سرد ہونے کی وجہ سے وادی میں کشمیری لوگ بہت طویل وقفوں پر غسل کرتے، اور مفلسی کی وجہ سے ان کے پاس ایک سے زیادہ چغہ نہیں ہوتا تھا، اس لئے اس کو پھٹنے تک پہنے رہتے، اور تار تار ہوجانے کے بعد بدلتے[6]

غذا (کھانے اور مشروبات)

آج کل کی طرح اس وقت بھی چاول کشمیریوں کی خاص غذا تھی، جب دھان کی فصل خراب ہوتی، تو ملک میں قحط پڑ جاتا، چاول پکانے کے کئی طریقے تھے، عام طور سے چاول ابال کر کھایا جاتا تھا، اور کچھ لوگ صبح کو باسی چاول کھانا پسند کرتے تھے[7] ایرانی

---

[1]: شری ور ص ۲۳۴ [2]: ایضاً ۱۷۰۱۲، ۲۱۴، ۳۳۰ [3]: تزک جہانگیری ج ۲ ص ۱۴۸ پھیرن خراسان سے آیا ہوگا جبہ سے نکلا ہوگا، دیکھو Diction trade Noms desvetementchey Learabics از Dozy جلد دوئم یا یہ ایرانی قمیص کی نقل ہو جو گردن سے ناف تک کھلا ہوتا، [4]: نصیب ورق ۴۳۳ الف، [5] دیکھو Remonstritive از Pelsuert ص ۳۵، کشمیری عورتوں کے لباس کے لئے [6]: تزک جہانگیری ج ۲ ص ۱۱۸ ہفت اقلیم از رازی ورق ۱۵۲ الف

[7]: ایضاً آئین اکبری ج ۲ ص ۳۵۳

اثرات کے تحت مختلف قسم کے پلاؤ مثلاً زرد پلاؤ، ترش پلاؤ اور شلا پلاؤ پکتا تھا[1] اور مسلمانوں کے عہد میں، ان کی اہمیت قائم رہی[2]۔ اسلام سے پہلے سور کا گوشت ہندوؤں میں عام طور سے کھایا جاتا تھا[3] لیکن یہ نہیں معلوم کہ سلاطین کے عہد میں بھی کھایا جاتا تھا کہ نہیں، مرغ، بھیڑ، بکری اور مختلف چڑیوں کے گوشت عام طور سے کھائے جاتے تھے[4]۔ گھوڑے کا گوشت بھی رغبت سے کھایا جاتا[5]۔ گائے کا گوشت کھانے کا رواج مسلمانوں کی حکومت کے بعد شروع ہوا[6]۔ پھر بھی سلطان حسن شاہ کے زمانہ تک بہت سے مسلمان گائے کا گوشت نہیں کھاتے تھے، لیکن آہستہ آہستہ گائے کا گوشت مقبول ہوتا گیا، یہاں تک کہ کچھ ہندو بھی کھانے لگے تھے[7] سری نگر میں گائے کے گوشت کا ایک خاص بازار تھا[8]۔ سبزیاں سکھا کر محفوظ کر لی جاتی تھیں، کشمیریوں کا ایک خاص کھانا مرغ کا گوشت اور بینگن ملا کر پکتا تھا[9]۔ گوشت کو مختلف دالوں میں ملا کر پکایا جاتا، اور کشمش اور منقی کا شوربہ بھی تیار کیا جاتا، زعفران اور دوسرے مسالے کشمیری کھانے کا خاص جزو ہوتے تھے[10]۔ پھل اس کثرت

۱: تحفۃ الاحباب ص ۱۰۹، ۱۳۰، اسرار الابرار از داؤد مشکوتی ورق ۳۸ ب

۲: شری ور ص ۲۷۶، مزید دیکھو اسٹین ج ۷ نمبر ۱۸۶۴ اور حاشیہ

۳: ارکو پولو از یول (Yule) ج ص ۱۶۶، اسٹین ج ۸ نمبر ۷، ۱۸۶۶ آئین اکبری ج ۲ ص ۳۵۳ ابودلاف مسار جو کہ نجارا کے خاندان سامانی کے دربار سے منسلک تھا، اور دسویں صدی کے آخری میں کشمیر آیا تھا، رقم طراز ہے، کہ کشمیری گیہوں اور مچھلی کھاتے تھے لیکن انڈا نہیں کھاتے تھے، اور وہ جانوروں کی گردن نہیں کاٹتے تھے Relations de Voyages از G.Eerand ص ۵۸۹: اسٹین ج، نمبر ۱۱۴۹

۴: یہ کھانے کشمیر میں اسلام سے پہلے بھی مقبول تے (دیکھو Proeeding of Indian Historical Congress) س ص ۱۳۴ ۱۹۴۹ء

۵: تذکرہ ملا علی رینا ورق ۳ ۱۵۴۳ء الف، حلیۃ العارفین از اسحق ورق ۶۵-۶۶ الف ۶: تحفۃ الاحباب، ص ۲۴۱، ۲۳۶ ۷: شری ور ص ۳۵ ۸: شری ورق ۱۲۳۵ ۹: طبقات اکبری ج ۳ ص ۴۷۷ ۱۰: شری ور ص ۱۴۰

سے ہوتے تھے کہ انہیں خرید نے یا فروخت کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی، باغ کے مالک یا وہ لوگ جن کے پاس باغ نہ ہوتے، دونوں کی حیثیت برابر تھی، کیونکہ باغوں کے گرد دیواریں نہیں ہوتی تھیں، ہر شخص کو پھل توڑنے کی اجازت تھی[۱] پھلوں میں ناشپاتی، شاہ دانہ، آلوچہ، خوبانی، انگور، سیب اور شفتالو خاص طور سے کھائے جاتے تھے، شہتوت ریشم کیلئے لگایا جاتا تھا، اس لئے اس کا پھل کھایا نہیں جاتا[۲] کچھ پھل جو دوا کے کام آتے مثلاً منقی وغیرہ وہ سکھا کر رکھ لئے جاتے۔[۳]

شراب نوشی عام طور پر مقبول تھی، لیکن جو مذہبی ہوتے اُس کو برا مانتے تھے چونکہ ہندو دھرم میں تقریبات میں شراب نوشی کی اجازت ہے[۴] اس لئے ہندو تہواروں کے موقع پر عام آدمی اور برہمن دونوں شراب پی لیتے تھے[۵]، ان تہواروں میں جو بھی شریک ہوتے وہ بھی شراب پیتے، زیادہ تر سلاطین اور ان کے امراء بھی شراب پیتے تھے[۶] لیکن حیدر شاہ بلا نوش تھا، اور یہی وجہ تھی کہ امور مملکت سے غافل رہتا، حسن شاہ اپنے محل یا دریائے جہلم پر کشتیوں پر شراب کی دعوت دیا کرتا تھا، اور ان موقعوں پر خوب پیتا تھا[۷] شراب کے علاوہ دوسری نشہ آور چیزیں مثلاً بھانگ اور افیون بھی عام طور پر استعمال ہوتی تھیں[۸] اس کے علاوہ چھاچھ اور دوسرے شربت بھی پیئے جاتے تھے، راجاؤں کے عہد میں ان کا عام طور سے استعمال ہوتا تھا، لیکن مسلمانوں کے عہد کی تاریخوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

۱: تاریخ رشیدی ص ۴۲۵، فرشتہ ج ۲ ص ۶۴ ۲: ایضاً

۳: آئین اکبری ج ۲ ص ۳۵۲ ۴: نیلمت نمبر ۵۳-۴۵ جس کا اقتباس رائے نے Early History and culture of Kashmir ص ۲۰۸ پر دیا ہے۔

۵: شری ور ص ۱۳۴، ۱۳۶ ۶: ایک بار زین العابدین کے ایک درباری میر شاہ نے شراب پی اور اپنی بیوی کو مار ڈالا (جون راج ص ۸۰) ۷: شری ور ص ۲۳۲-۲۴۵ ۸: چلچلتہ العارفین از اسحاق۔ ورق ۲ ب

تفریحات

گھر کے اندر کھیلوں میں چوسر اور شطرنج خاص طور سے پسند کئے جاتے تھے[۱] میدان کے کھیلوں میں چوگان جو شاید لداخ سے کشمیر میں لایا گیا تھا سلاطین اور امراء کا مرغوب کھیل تھا، سلطان علی شاہ اس کو بہت پسند کرتا تھا، اور چوگان کھیلنے ہی میں اس کی جان گئی تھی، اونچے طبقہ میں شکار بھی کافی محبوب مشغلہ تھا[۲]، سلطان شہاب الدین کو شیر کا شکار پسند تھا، اور ایک بار تو شیر کو تلوار سے مارنے کی کوشش میں اس کی جان بال بال بچی،[۳] بارہ سنگھا، تیتر، ہرن اور چیتے کا بھی شکار ہوتا تھا،[۴] شکرہ (باز) سے شکار کھیلنے کا فن ایران سے آیا تھا[۵] کشمیریوں کو اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں ایسے مناظر دیکھنے میں بڑا لطف آتا، جبکہ باز جنگلی مرغ کا شکار کرتے یا دوسرے پرندوں پر جھپٹتے، اور شکار کے ساتھ واپس آتے[۶] ان کے علاوہ دوسرے کھیل مثلاً تیر اندازی، شمشیر زنی اور نیزہ بازی بھی مقبول تھے۔ عام لوگ ہاکی کھیلتے تھے[۶] ایک تفریحی مشغلہ یہ بھی تھا، کہ جمعہ کے دن سری نگر کے ایک علاقہ کے کچھ نوجوان جمع ہوتے، اور دوسرے علاقہ کے جوانوں کو چیلنج کرتے،

۱: شک ص ۳۲۸

۲: جون راج ص ۴۵، شری ور ص ۳۶۰

۳: جون راج (بمبئی اڈیشن) نمبر ۵۱۶ وغیرہ، یون راج نے سنگھا کا لفظ استعمال کیا جس کے معنی شیر ہوتے ہیں، لیکن وہ مقام کھرگ معلوم نہ کرسکا، جہاں شہاب الدین شکار کھیلتا تھا، یہ مقام یقیناً کشمیر کی بیرونی پہاڑیوں کے دامن میں جنگلوں میں ہوگا

۴: اس کا مقابلہ Life and Condition of the People of Hindustan از اشرف ۹۱-۲۸۹، سلاطین دہلی کے شکار کے احوال سے ہوسکتا ہے

۵: آئین اکبری ج ۲ ص ۳۵۴، شری ور ص ۲۶۳

۶: Ward of Dolly از میل ص ۲۰۸

اس کے بعد وقت اور مقام کا تعین ہوتا، دونوں جماعتیں ڈنڈے اور فلاخن لے کر آجاتیں، پھر کھل کر لڑائی ہوتی، جس میں نوجوانوں کے سر پھوٹتے اعضاء زخمی ہوتے اور موت بھی ہوجاتی[۱]۔

کشمیری نٹ اور شعبدہ باز اپنے کرتب میں بڑے ماہر ہوتے تھے اور لوگوں کو اپنے مظاہروں سے خوش کرتے[۲]، زین العابدین کے عہد سے آتش بازی لوگوں کی تفریح کا سامان بن گئی تھی، اگر چہ شرعاً موسیقی ممنوع تھی، لیکن نشاط اور تفریح کا سامان فراہم کرنے کی وجہ سے کشمیریوں میں بہت مقبول تھی، سلطان زین العابدین جہلم میں کشتیوں پر موسیقی پر محفلیں منعقد کراتا، ایسی ہی محفلوں میں اس کے کچھ جانشین اپنے دوستوں کے ساتھ ضیافتیں بھی کرتے، جن میں خم کے خم شراب لنڈھائی جاتی، اور بابِ نشاط کے رقص و سرور بھی ہوتے۔

مکانات

مکانات اسی نمونہ کے بنتے تھے، جس نمونہ کے آج کل شہروں اور گانوں میں بنتے ہیں، لکڑی کی کثرت اور مستقل زلزلوں کی وجہ سے پتھر اور اینٹوں کے مکانات نہیں بنائے جاتے تھے[۳]، مکانوں کی دو یا چار اور کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ منزلیں ہوتیں[۴]، مکان لکڑی کے تختوں کو ایک دوسرے پر رکھ کر مربع صورت میں بنائے جاتے اور ان کے اندر کے شگافوں میں مٹی بھر دی جاتی[۵]، جنگلوں کے قریب دیواریں پورے پورے لٹھوں

۱: Knowles از A Dictionary of Kashmiri Proverbs and Sayings ص ۳، شری ور ص ۱۵۲ امریہ Maro Polo از Yule ج ا ص ۱۷۷ حاشیہ ۲

۲: آئین اکبری ج ۲ ص ۳۵۳ ۳: ایضاً

۴: Remonstrantie از ص ۳۴ Pelsurt کے علاوہ Trovels of Desideri از DeFillippi ص ۳۵،

۵: ایضاً

سپنائی جاتی[1]، مکانوں کی چھتیں نوک دار ہوتیں، تا کہ برف ان پر رک نہ سکے، ان میں لکڑی کے تختوں کو رسی سے باندھ دیا جاتا، اور ان پر مٹی کی ایک تہہ جمادی جاتی، جس پر سفید بنفشی رنگ کے سوسن اور لالہ کے پودے بوئے جاتے[2] ان سے موسم بہار میں نہایت ہی خوشنما منظر پیدا ہو جاتا، جھیل کے کنارے آباد گاؤں میں گھروں کے چھپر دھان کے پیال یا نرکل سے بنائے جاتے تھے[3] مکانوں میں کھڑکی کے بجائے چھوٹے چھوٹے خوبصورت روشن دان ہوتے تھے،[4] نچلی منزل میں مویشی باندھے جاتے اور دوسری منزل میں خاندان کے افراد رہتے تھے، دوسری منزلوں میں گھر کے سامان رکھے جاتے۔

چھتوں کے نیچے خالی جگہوں میں لکڑی اور گھاس رکھی جاتی،[5] کچھ مکانوں میں تہ خانے بھی ہوتے،[6] دولت مندوں کے مکانات جہلم کے کنارے واقع تھے، اور ان کے ساتھ خوبصورت باغ بھی ہوتے۔[7]

ہندوؤں اور مسلمانوں کے سماجی تعلقات

کشمیر کی سرزمین پر صوفیوں اور سپاہیوں نے جب قدم رکھا تو ان کا دوستانہ خیر مقدم ہوا، سپاہیوں کو تو راجاؤں نے اپنی فوج میں ملازم رکھ لیا، اور صوفیہ کو اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی پوری آزادی دے دی گئی، اسلام جب بہت تیزی سے فروغ پانے لگا، تو برہمنوں نے معاندانہ رویہ اختیار کیا، کیونکہ اسلام کے فروغ سے انہوں نے اپنے روایتی اقدار کو منتشر ہوتے دیکھا، اور ہندو سماج کے بنیادی اصولوں کے لئے خطرہ محسوس کیا

۱: لارنس ص ۵۰-۲۴۹ ۲: Travels of Desideri از De Fillippi ص ۳۵، اس کا مقابلہ لارنس ص ۵۰-۲۴۹ سے بھی ہوسکتا ہے ۳: ایضاً ۴: از Remonstrantie از Palsoert ۵: آئین اکبری ج ۲ ص ۳۵۲ ۶: بہارستان شاہی ورق ۱۶۴ الف، ۷: Travel از برنیئر ص ۸-۳۹۷ تزک جہانگیری ج ۲ ص ۱۳۴

بہر حال آہستہ آہستہ مخالفت کی ناکامی دیکھ کرانہوں نے مجبوراً خیر سگالی اور رواداری کا رویہ اختیار کرلیا، ان احساسات کا مسلمانوں نے بھی ان ہی جذبات سے جواب دیا، چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف حسن شاہ کے دورِ حکومت میں ایک فرقہ وارانہ فساد کے علاوہ سلطنت کی پوری تاریخ میں ہندو مسلمان امن وسکوں اور دوستانہ طریقہ پر رہتے تھے، ہندو مسلمان میں شادی عام طور پر ہوتی تھی ، مسلمان ہندو عورت سے شادی کرتے ، تو نہ صرف ان عورتوں کے نام باقی رہتے ، بلکہ وہ اپنے دھرم پر بھی قائم رہتیں[1]، ہندو مسلمان ایک دوسرے کی عبادت گاہوں میں جاتے اور تہواروں میں شریک ہوتے ، ہندو صوفیہ کی عزت وتکریم کرتے ، اور مسلمان سادھوؤں کو عزت کی نظر سے دیکھتے، صوفیہ ہندو جوگیوں سے مل کر مذاکرہ بھی کرتے[2] لل دید اور نورالدین رشی کے عارفانہ گیت ہندو اور مسلمان دونوں کے قلوب کو یکساں طور پر گرماتے تھے۔

..................☆☆☆..................

---

[1]: سلاطین کی ہندو ملکہ اپنے نام تبدیل نہیں کرتی تھیں، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے دھرم پر برقرار رہتی تھیں، ہندو اور مسلمانوں میں راجوری ،لداخ اور بلتستان میں بھی شادی بیاہ ہوتے تھے، (دیکھو تزک جہانگیری ج ۲ ص ۱۸۱ اور انڈین اینٹی کواری ج ۷ ۳ ص ۱۸۸

[2]: صوفیہ کی سوانح ایسے مذاکروں کے حوالوں سے بھری پڑی ہیں

غلام نبی خیالؔ

چودھری خوشی محمد ناظرؔ "جوگی کا شاعر"

چودھری خوشی محمد ناظرؔ کا پیدائشی تعلق اگرچہ لائل پور (پاکستان) کے ساتھ ہے لیکن اُن کی زندگی کا ایک حصہ کشمیر میں گزرا جہاں وہ گورنر اور وزیر کے اعلیٰ عہدوں تک پہنچے اور وادیٔ کشمیر کے ساتھ ساتھ کوہستانی سرحدی صوبہ لداخ بھی ان کی حدِ اختیار میں آ گیا۔

اپنی تعلیمی اور ادبی زندگی کے مختلف ادوار کے بارے میں ناظرؔ خود کہتے ہیں کہ "میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے زمانے میں اوقاتِ مدرسہ کے بعد اپنے گاؤں کے مکتب میں بھی تعلیم پاتا رہا اور اس ابتدائی دور میں چند فارسی غزلیں بھی کہیں۔ مڈل کے درجے میں شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزادؔ کی زندہ جاوید "آبِ حیات" اور بعض اردو کے دیوان میری نظر سے گزرے جس سے اُردو غزل گوئی کی تحریک ہوئی۔

دوسرا دور یعنی قومی شاعری علی گڑھ کالج میں شروع ہوئی۔ اس وقت یونین کلب اور علی گڑھ کالج کی مجلسوں میں غزل کا داخلہ ممنوع تھا۔ کیونکہ سر سیّد مرحوم عاشقانہ غزل

سرائی طلباء کے لئے تضیع اوقات کا ذریعہ سمجھتے تھے مگر بورڈنگ کی فضا میں غزل گونجتی رہتی تھی بلکہ باورچی خانے سے بھی ہر صبح یہ آواز سنائی دیتی تھی:

یار کی کوئی خبر لاتا نہیں
دم لبوں پر ہے نکل جاتا نہیں

اُدھر مولانا حسرت موہانی کے کمرے میں اساتذہ سلف کی روحیں مخفی مشاعرہ کرتی رہتی تھیں۔ سر سید نیچرل شاعری کے حامی تھے اور مسٹر آرنلڈ آنجہانی نیچرل شاعری میں ترغیب و تربیت میں خاصی دلچسپی لیتے تھے اور دو سال متواتر انعامی نظام کا اعلان فرماتے۔ یہ دونوں انعام میں نے حاصل کیئے اور یہ دونوں نظمیں ''اخوت'' اور ''چہار موسم'' انہی دنوں علی گڑھ میگزین میں شائع ہوئیں۔ یہ انعام حاصل کرنے کے بعد میں کالج یونین کلب اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کے لئے بہت سی نظمیں لکھتا رہا۔

تیسرا دور کشمیر جنت نظر کے قیام سے شروع ہوا اور میری بعض شگفتہ اور مقبول نظمیں اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اس زمانے میں ہم نے چند ادب دوست احباب کی ایک لمیٹڈ کمپنی یا انجمن بنا رکھی تھی جس کا نام انجمنِ مفرح القلوب تھا۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۶ء تک یہ انجمن کشمیر کے باغوں میں مفرحات کی نکہت بکھیرتی رہی۔ اس کے بعد میں لداخ چلا گیا اور بندوبست اور مال کے انتظامی کام کی وجہ سے شعر گوئی کی فرصت نہ ملی۔

انجمن مفرح القلوب میں بیرون کشمیر کے جو احباب شامل تھے ان میں سر شیخ عبدالقادر، جسٹس شاہ دین ہمایوں، خوشی محمد ناظر اور علامہ اقبال شامل تھے۔ ۱۹۲۱ء میں جب اقبال کشمیر آئے تو جسٹس ہمایوں نے اپنی ایک نظم ''شالامار باغ کشمیر'' میں اپنے ان قریبی دوستوں کا بھی ذکر کیا:

اے باغ لوگ کہتے ہیں تم شالامار ہو
اور عظمتِ گزشتہ کی اک یادگار ہو

کہتے ہیں تم سے کھلتے ہیں رازِ دروں کے پیچ
تم اک کلیدِ قفلِ درِ روزگار ہو
خاموش کیوں ہو کچھ تو کہو اپنی داستاں
کس سر بمہر کے تم راز دار ہو
فوّارے کی زباں سے کہو کچھ تو اپنا حال
کیوں روتے زار زار تم اے آبشار ہو
اور تم بتاؤ پانی کی لہرو کہ کس لئے
مضطر ہو پیچ و تاب میں ہو، بے قرار ہو
کب سے جلا رہا ہے یہ سوزِ دروں تمہیں
دلدادہ کس کی یاد میں تم اے چنار ہو
ہاں اے مسافر ایسے سوالوں سے فائدہ
زخموں پہ کیوں چھڑکتے نمک بار بار ہو
ناظرؔ بڑا مزا ہو جو اقبالؔ ساتھ دے
ہر سال ہم ہوں شیخؔ ہو اور شالامار ہو

آخری شعر میں خوشی محمد ناظرؔ، علامہ اقبالؔ اور شیخ عبدالقادر کا ذکر کیا گیا ہے۔اس مختصر سی مجلس یاراں میں ناظرؔ کو اقبالؔ کے فلسفہ۔نے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا:

فلسفے کی وادیوں میں کر تلاش اقبالؔ کو
ناظرِ گم گشتہ کو قدرت کے نظاروں میں دیکھ

۱۹۳۸ء میں جب اقبالؔ انتقال کر گئے تو ناظرؔ نے بیالیس اشعار کا مرثیہ لکھا جس کا آخری شعر اس طرح ہے:

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

ناظرؔ اگر چہ مولانا الطاف حسین حالیؔ کے تلامذہ میں شمار ہوتے تھے لیکن اس سے زیادہ قربت انہیں علامہ اقبالؔ کے ساتھ حاصل تھی۔

علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ناظرؔ رام پور میں کچھ عرصہ تک ملازمت کرتے رہے اور اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں کشمیر میں وزارت کے عہدہ جلیلہ سے سبکدوش ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں کشمیر میں ہی ۷۲ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا جہاں وہ ڈل جھیل کے کنارے خود تعمیر کردہ اس کوٹھی کے صحن میں مدفون ہوئے جو انہوں نے ڈل کا خوبصورت نظارہ شب و روز اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنے کی غرض سے تعمیر کروائی تھی۔ اس مکان میں بعد میں ریاست کے ایک سابق وزیرِ اعلیٰ غلام محمد صادق آخر دم تک قیام پذیر رہے۔ ایک اور بیان کے مطابق ناظرؔ کو سری نگر میں کوہِ سلیمان کے دامن میں دفن کیا گیا۔ یہ بیان زیادہ معتبر معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کوہ کے ایک زیریں حصے میں کئی فارسی شعراء دفن کئے گئے تھے اور اسی بناء پر اسے ''مزارِ شہداء'' کا نام دیا گیا تھا۔

کشمیر کے ایک بزرگ شاعر مرحوم امین داراب نے ناظر کی تاریخِ وفات رقم کرنے کی غرض سے یہ مرثیہ لکھا:

دریغا کہ شد روزِ بزمِ ادب
ہمہ تیرہ از مرگِ ناظرؔ چو شب
بہ باغِ ادب بلبلِ نغمہ سنج
کہ بودش بدل از سخن گنج گنج
گہہ حکمرانی ہمہ عدل و داد
دم نغمہ سنجی بہ فن اوستاد

بر عہدش ز رشوت نشانی نماند
زبیدادِ جز داستانی نماند
بہ دل خواستے دائم از حق پرست
رسیدن بہ فریاد ہر زیر دست
وفاتش بدل داد رنجیدگی
کہ با اوشدہ دفن سنجیدگی
کشادم پئے عہدِ تاریخِ شب
گزیدہ دو تاریخ آمد بدست
یکے ہجری آں خوش تمیز عزیز
گر عیسوی شاعر خوش تمیز

سیّد سلیمان ندوی نے ناظرؔ کے انتقال کی خبر سن کر اپنے غم واندوہ کا اظہار "معارف" کی دسمبر ۱۹۴۴ء کی اشاعت میں یوں کیا: "کشمیر جنت نظیر کا ایک پھول یکم اکتوبر ۱۹۴۴ء کی رات کو مرجھا کر گر گیا یعنی چودھری خوشی محمد ناظر نے اس تاریخ کو بعارضۂ فالج وفات پائی"۔

خوشی محمد ناظرؔ کو مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے چند درباریوں کی سازش کے نتیجے میں گورنری کے عہدے سے برخاست کیا گیا۔ مہاراجہ نے اس کی نظم "جوگی" کے بارے میں جب سنا تو یہ نظم سننے کی فرمائش کی۔ مہاراجہ کو یہ نظم اس قدر پسند آئی کہ اس نے ناظرؔ کو اپنے منصب پر بحال کرنے کا حکم جاری کیا۔ ناظر کے اپنے الفاظ میں "مہاراجہ پرتاپ سنگھ بہادر سرگباشی درویش منش رئیس تھے۔ انہوں نے بعض اعیانِ دربار سے میری نظم "جوگی" کی تعریف سن کر اس نظم کے پڑھنے کے لئے اصرار فرمایا اور جوگی جی کے بچن کر اس قدر مسرور ہوئے کہ ایک خاص صوفی منش مغنّی یہ نظم سنانے کے لئے ملازم رکھا گیا"۔ اس

کے بعد ساری ریاست جموں و کشمیر میں ناظرؔ کو "جوگی کا شاعر" کہا جانے لگا۔

۱۹۱۲ء میں گورنر ناظر کو خان صاحب اور اس کے بعد خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ ۱۹۱۷ء میں خان بہادر کا خطاب ملنے پر اُس وقت سری نگر کے مشہور نیڈوز ہوٹل میں ناظر کے بہی خواہوں اور احباب کی طرف سے ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں کشمیر کی انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیدار، شاعر اور دانشور شریک ہوئے۔ اس موقعہ پر چند سخن وروں نے ناظرؔ مدح میں قصیدے بھی پڑھے جن میں پنڈت گوپی کشن مدن کا یہ قطعہ بھی شامل تھا:

خوشی سے لبریز کیوں نہ ہوں ہم
نہ شادمانی سے دل ہو کیوں پُر
ملا گورنر کو ہے ہمارے
خطاب و اعزازِ خان بہادر
ہمارے منصف مزاج حاکم
ہیں اہلِ کشمیر جن کے شیدا
دلوں کو تسخیر کر رہے ہیں
یہ کامیابی کا ان کی ہے گر
زبحرِ تاریخ غوطہ زن شد
مدن چو در قلزمِ معانی
بگفت ہاتف کہ کن مزین
خوشی محمد بہ خاں بہادر

خوشی محمد ناظرؔ جتنی دیر کشمیر میں رہے وہ اس خطۂ ارضی کی فطری رعنائیوں اور قدرتی مناظر کے مدح خواں رہے۔ ڈل جھیل پر انہوں نے یہ خوبصورت نظم لکھی:

اللہ اللہ ہے کیا حُسنِ چمن پانی میں
سبزہ و لالہ و گل سرو و سمن پانی میں
تودۂ سیم ہے اس ڈل کے خزانے میں نہاں
برفِ کہسار ہے کیا عکس فگن پانی میں
ہیں شکارے میں سیہ چشمِ بتانِ کشمیر
یا اُترتے ہیں غزالانِ ختن پانی میں
لبِ ڈل آپ بھی کاشانہ بنالیں ناظؔر
موسمِ گل میں رہے لطفِ سخن پانی میں

مغل شہنشاہ جہانگیر سے منسوب ایک مشہور شعر کی تضمین ناظؔر نے ایک دل نشین پیرائے میں اس غزل نما نظم میں کی ہے:

اُدھر اک وارثِ اورنگِ اکبر
جلوسِ خسرور فرما رہا تھا
شہہِ جم جاہ نورالدین جہاں گیر
شکوہِ بزمِ جم دکھلا رہا تھا
اُدھر نور جہاں کا جلوۂ حُسن
درودیوار کو چمکا رہا تھا
اُدھر محوِ نوا سرمست مطرب
سرودِ آسمانی گا رہا تھا
یہ نقشہ دیکھ کر بزمِ شہی کا
سروشِ غیب یہ فرما رہا تھا

”اگر فردوس بروئے زمین است

ہمیں است وہمین است وہمین است“

ناظر نے حسنِ کشمیر اور اس کے رنگارنگ موسموں کی اپنے کلام میں دل کھول کر ستائش کی ہے۔ وادیٔ کشمیر میں جاڑوں کے دوران سردی سے کپکپاتے ہوئے جسم گرم رکھنے کی مقامی محسن ”کانگڑی“ غالباً ان کی کہی ہوئی نظم کسی شاعر کی تحریر کردہ واحد نظم ہے۔

کانگڑی کی تشکیل ایک ایسے مٹی کے گول برتن سے ہوتی جسے کمہار پیشہ لوگ کچی مٹی سے بنا کر اسے بھٹی میں تاپ کر مضبوطی بخشتے ہیں۔ پھر شاخساز پیشہ کے لوگ اس برتن کے اردگرد بید کے درخت کی پتلی ٹہنیوں کا ایک جال سا بُن کر اسے نئی شکل وصورت میں ڈھالتے ہیں۔ اس کا اوپری حصہ دائیں اور بائیں دو دستوں کی شکل میں بُنا جاتا ہے جسے اہلِ کشمیر دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے لمبے چغے یعنی پھرن کے نیچے رکھ کر موسمِ سرما میں اس میں ڈالے ہوئے انگاروں سے گرمی حاصل کرتے ہیں۔ کانگڑی کو زیادہ دیدہ زیب اور قیمتی بنانے کے لئے اس کی تیلیوں کے اندر مختلف رنگوں والے ابرق کے ٹکڑے جب سجائے جاتے ہیں۔

اس مقالے میں خوشی محمد ناظر کی دو شہرہ آفاق نظمیں جوگی اور فردوسِ زمین کو من و عن پوری طرح شائع کیا جاتا ہے تاکہ محققین اپنی تحقیقی سرگرمیوں میں ناظر کی اس نایاب شاعری اور بیش بہا منظومات سے استفادہ کر سکیں۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ناظر کا کلام اب تقریباً ناپید ہے۔ ”نغمۂ فردوس“ کے نام سے ان کی منظومات کو ان کے ایک فرمانبردار حبیب اور ”اولادِ معنی“ مولوی محمد عبداللہ کامل نے مرتب کر کے آج سے پون صدی قبل ۱۹۳۷ء میں منظرِ عام پر لایا تھا۔ یہ کتاب بھی اب کسی کتب خانے میں خال ہی دیکھی جا سکتی ہے۔

خطۂ کشمیر کے ساتھ ناظر کے بے پناہ عشق کا اظہار ”فردوسِ زمیں“ جیسی اس

بہترین نظم میں ان دل نشیں اشعار میں کیا گیا ہے:

کبھی گلشن کبھی ویرانہ دیکھا
مری آنکھوں نے بھی کیا کیا نہ دیکھا
مگر عالم میں اے گلزارِ کشمیر
کوئی خلدِ بریں تجھ سا نہ دیکھا
ہیں حسن و عشق کے رمنے ترے باغ
گل و بلبل میں یاں یارانہ دیکھا
چمن زاروں میں آبِ جو کا منظر
وہ موجِ سیم کا لہرانا دیکھا
وہ اونچی وادیوں میں جلوۂ گل
کہ باغ و راغ میں اصلانہ دیکھا
وہ کوہِ برف پر تنویرِ خورشید
پھر ایسا آتشیں دریا نہ دیکھا
وہ گلزاروں میں ہر سُو بعدِ سنبل
حریفِ گیسوئے جانانہ دیکھا
الگ بزمِ چمن سے سونے والا
لبِ جُو سبزۂ بیگانہ دیکھا
ہے ہر سر وسمن لیلےٰ کا محمل
مگر مجنوں نے یہ صحرا نہ دیکھا
افق پر وہ ضیا پاشی سحر کی
کہیں یہ نور کا تڑکا نہ دیکھا

سفیدوں کے وہ پرچم وادیوں میں
وہ میداں مخیمِ شاہانہ دیکھا
وہ ہر سو سیم گوں تالاب دیکھے
کہ ایسا کوئی مہہ سیما نہ دیکھا
کنول کے پھول پر جس دم نظر کی
مئے گلرنگ کا پیمانہ دیکھا
گرے پتوں پہ جب پانی کے قطرے
تو ہر اک گوہرِ یک دانہ دیکھا
شفق کی جلوہ ریزی بادلوں میں
کہ موسیٰ نے بھی یہ سینا نہ دیکھا
وہ جاں پرور ہے کیفِ زعفران زار
کہ دہقاں بے پئے مستانہ دیکھا
وہ دھانی کھیت میں شفاف پانی
زمینداروں کا آب ودانہ دیکھا
چھتوں پر لالہ و گل کا سماں تھا
تو پائیں باغ صحن خانہ دیکھا
وہ ہر جانب تماشائے لبِ بام
وہ ہر سو کوچۂ جانانہ دیکھا
تھا صحنِ بوستاں بزم حریفاں
کہیں شیشہ کہیں پیمانہ دیکھا
کہیں تھی گرم مشتاقوں کی محفل

ادھر شمع، اُدھر پروانہ دیکھا
سیہ چشموں کی اک ترچھی نظر سے
غزالِ دشت کو دیوانہ دیکھا
اسی کیف تماشا میں سرِ شام
وہ شالامار کا مئے خانہ دیکھا
سماں پھر چاندنی کا اس چمن میں
سکوتِ شب میں خاموشانہ دیکھا
وہ دیکھا خواب میں رنگیں مرقّع
کہ بیداری میں پھر ایسا نہ دیکھا

....

دھند لکا آسماں پر چھا رہا تھا
زمیں پر ابر سا لہرا رہا تھا
اُٹھا تھا جھوم کے وہ وادیوں سے
خراماں گھاٹیوں کو آرہا تھا
شمیمِ روح پرور سے گلستاں
نسیمِ صبح کو مہکا رہا تھا
چناروں کے قدِ بالا سے طوبیٰ
ریاضِ خلد میں شرما رہا تھا
تھا فوّارے کا ہر سو رقصِ پیہم
تو آبِ جو اُچھلتا جارہا تھا
یہ فوّارہ تھا یا سیالِ گلبن

روپہلے پھول سے برسا رہا تھا
یہ سیمیں سلسلہ آبِ رواں کا
چمن میں چاندنی چھٹکا رہا تھا
مقابل باغ کے تالاب ڈل کا
پری کو آئینہ دکھلا رہا تھا
وہ عالم نور کا تھا بزمِ گل پر
کہ شعلہ طور کا شرما رہا تھا
چمن میں موجزن تھا جلوۂ گل
کہ سیلِ رنگ اُمڈا آرہا تھا
تھے طائر نغمہ خواں شاخ و شجر پر
کہ سر تا پاگلستاں گا رہا تھا
ترنّم سا ہوا میں بس رہا تھا
تجمل سا فضا پر چھا رہا تھا
صدائے کوس و طبلِ شہر یاری
کہستاں ہر طرف دوہرا رہا تھا
ادھر رشکِ درفشِ کاویانی
شہنشاہی علم لہرا رہا تھا
ادھر اک وارثِ اورنگِ اکبر
جلوسِ خسروی فرما رہا تھا
شہہِ جم جاہ نور الدین جہانگیر
شکوہِ بزم جم دکھلا رہا تھا

ادھر نورِ جہاں کا جلوۂ حسن
درودیوار کا چمکا رہا تھا
فروغِ عارفیں مہر النساء سے
جمالِ یوسفی گہنا رہا تھا
وہ حسن و عشق کا مغلی مرقّع
زمانہ کو دکھایا جارہا تھا
ادھر محوِ نوا سر مست مطرّب
سرودِ آسمانی گا رہا تھا
وہ تار چنگ و بربط کی تڑپ سے
رگِ جاں میں لہو دوڑا رہا تھا
وہ تھی دربار کی شان آشکارا
کہ بندوں کو خدا یاد آرہا تھا
یہ نقشہ دیکھ کر بزمِ شہی کا
سروشِ غیب یہ فرما رہا تھا
"اگر فردوسِ برروئے زمیں است
ہمین است وہمین است وہمین است"

دراصل خوشی محمد ناظر کی مکمل پہچان ایک کامیاب اور پُر اثر نظم گو کی حیثیت سے اُس وقت ہوئی جب انہوں نے "جوگی" نظم لکھی جو دیکھتے ہی دیکھتے ہر خاص و عام کی زبان سے سنی جانے لگی۔

اس نظم میں ایک مردِ میدان اور ایک سادھو کے درمیان ملاقات کا حال بیان کیا گیا ہے۔شاعر جوگی کو کشمیر کے پہاڑوں میں بے مزہ زندگی گزارنا ترک کر کے واپس شہر

میں لانے اور زندگی کے عمل میں بھرپور حصہ لینے کی دعوت دیتا ہے لیکن جوگی دنیاوی زندگی کے ان مکروہ اور انسان دشمن پہلوؤں کی نقاب کشائی کے پیشِ نظر اپنی خلوت ہی کی جلوت سمجھتا ہے۔ جس نے زمانے کی ساری نیکیوں اور روحانی اقدار کو پامال کر رکھا ہے۔ وہ شاعر سے کہتا ہے کہ وہ اس دنیا میں واپس نہیں لوٹ سکتا جہاں فتنہ و فساد اور انسانی نفرت کا دور دورہ ہو۔ وہ شاعر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ بھی اس بے رحم دنیا کی بے رحمیوں سے کنارہ کش ہو کر جوگی کے ساتھ ہم نشین ہو اور اس خلوت میں خدا کے ذکرِ حمیدہ میں اپنی باقی ماندہ زندگی سکون اور طمانیت کے ساتھ گزارے۔ یہ سدا بہار نظم یوں ہے:

"جوگی"

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیٔ ایمن تھی ہر کوہ پہ جلوہ طور ہوا
جب بادِ صبا مضراب بنی ہر شاخ نہالِ رباب بنی
شمشاد و ستار ستار ہوئے ہر سرو و سمن طنبور ہوا
سب طائر مل کر گانے لگے مستانہ وہ تانیں اُڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے گلزار بھی بزمِ سرور ہوا
سبزے نے بساط بچھائی تھی اور بزمِ نشاط سجائی تھی
بن میں، گلشن میں، آنگن میں فرشِ سنجاب و سمور ہوا
تھا دل کش منظرِ باغِ جہاں اور چال صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظرؔ دیوانہ
چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے پربت پر چھاؤنی چھائی تھی

تھے خیمے ڈیرے بادل کے کُہرے نے قنات لگائی تھی
یاں برف کے تودے گلتے تھے چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اُگلتے تھے نالوں نے دھوم مچائی تھی
اک مست قلندر جوگی نے پربت پر ڈیرا ڈالا تھا
تھی راکھ جٹائیں جوگی کی اور انگ بھبھوت رمائی تھی
تھا راکھ کا جوگی کا بستر اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیبِ کمر جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی
سب خلقِ خدا سے بیگانہ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ آنکھوں میں مستی چھائی تھی
جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں اور جھک کے ہم نے سلام کیا
تیکھے چتون سے جوگی نے تب ناظرؔ سے یہ کلام کیا
کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لئے آکے ستاتے ہو؟
ہیں پنکھ پکھیرو بن باسی تم جال میں اُن کو پھنساتے ہو
کوئی جھگڑا دال چپاتی کا کوئی دعویٰ گھوڑے ہاتھی کا
ہر حرص و ہوا کو چھوڑ چکے اس نگری سے منہ موڑ چکے
ہم جو زنجیریں توڑ چکے تم لا کے وہی پہناتے ہو
تم پوجا کرتے ہو دھن کی ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی
ہم جوت لگاتے ہیں من کی تم اس کو آکے بجھاتے ہو
سنسار سے یاں مکھ پھیرا ہے من میں ساجن کا ڈیرا ہے
یاں آنکھ لڑی ہے پتیم سے تم کس سے آنکھ ملاتے ہو؟
یوں ڈانٹ ڈپٹ کر جوگی نے جب ہم سے یہ اشارد کیا

سر اُس کے جھکا کر چرنوں پر جوگی کو ہم نے جواب دیا

ہیں ہم پردیسی سیلانی یوں آنکھ نہ ہم سے چُرا جوگی
ہم آئے ہیں ترے درش کو چتون پر میل نہ لا جوگی
آبادی سے منہ پھیرا کیوں جنگل میں کیا ہے ڈیرا کیوں
ہر محفل میں، ہر منزل میں، ہر دل میں ہے نورِ خدا جوگی
کیا مسجد میں، کیا مندر میں ،سب جلوہ ہے وجہُ اللہ کا
پربت میں نگر میں، ساگر میں ہر اُترا ہے ہر جا جوگی
جی شہر میں خوب بہلتا ہے واں حُسن پہ عشق مچلتا ہے
واں پریم کا ساگر چلتا ہے چل دل کی پیاس بجھا جوگی
واں دل کا غنچہ کھلتا ہے گلیوں میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں شنکھ بجا جوگی بازار میں دھونی رما جوگی

پھر جوگی جی بیدار ہوئے اس چھیڑنے اتنا کام کیا
پھر عشق کے اس متوالے نے یہ وحدت کا اک جام دیا
ان چکنی چپڑی باتوں سے مت جوگی کو پھسلا بابا
جو آگ بجھائی جتنوں سے پھر اس پہ نہ تیل گرا بابا
ہے شہروں میں غل شور بہت اور کام کرودھ کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت سادھو کی ہے بن میں جا بابا
ہے شہر میں شورِ نفسانی جنگل میں ہے جلوہ روحانی
ہے نگری ڈگری کثرت کی بن وحدت کا دریا بابا
ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں
راجہ کے نہ دوارے جاتے ہیں پرجا کی نہیں پروا بابا

سر پر آکاش کا منڈل ہے دھرتی پہ سہانی مخمل ہے
دن کو سورج کی محفل ہے شب کو تاروں کی سبھا بابا
جب جھوم کے یاں گھن آتے ہیں مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبور بجاتے ہیں گاتی ہے ملہار ہوا بابا
جب پنچھی مل کر گاتے ہیں پتیم کے سندیس سناتے ہیں
ہے حرص و ہوا کا دھیان تمہیں اور یاد نہیں بھگوان تمہیں
سل پتھر، اینٹ، مکان تمہیں دیتے ہیں یہ راہ بھلا بابا
پرماتما کی وہ چاہ نہیں اور روح کو دل میں راہ نہیں
ہر بات میں اپنے طلب کی تم گھڑ لیتے ہو خدا بابا!
تن من کو دھن میں لگاتے ہو ہر نام کو دل سے بھلاتے ہو
ماٹی میں لعل گنواتے ہو تم بندۂ حرص و ہوا بابا
دھن و دولت آنی جانی ہے یہ دنیارام کہانی ہے
یہ عالم عالمِ فانی ہے باقی ہے ذاتِ خدا بابا

جب سے مستانہ جوگی کا مشہور جہاں افسانہ ہوا
اُس روز سے بندۂ ناظر بھی پھر بزم میں نغمہ سرانہ ہوا
کبھی منصب و جاہ کی چاٹ رہی کبھی پٹ کی پوجا پاٹ رہی
لیکن یہ دل کا کنول نہ کھلا اور غنچۂ خاطر وانہ ہوا
کہیں لاگ رہی کہیں پیت رہی کبھی ہار رہی کبھی جیت رہی
اس کل جگ کی یہی ریت رہی کوئی بند سے غم کی رہانہ ہوا
یوں تیس برس جب تیر ہوئے ہم کارِ جہاں سے سیر ہوئے
تھا عہدِ شباب سراب نظر وہ چشمۂ آبِ بقا نہ ہوا

پھر شہر سے جی اُکتانے لگا پھر شوق مہار اُٹھانے لگا
پھر جوگی جی کے درشن کو ناظر اک روز روانہ ہوا

کچھ روز میں ناظر جا پہنچا پھر ہوش رہا نظاروں میں
پنجاب کے گرد و غباروں سے کشمیر کے باغ و بہاروں میں
پھر بن باسی بیراگی کا ہر سمت سراغ لگانے لگا
بنہال کے بھیانک غاروں میں پنچال کی کالی دھاروں میں
اپنا تو زمانہ بیت گیا سرکاروں میں درباروں میں
پر جوگی میرا شیر رہا پربت کی سونی غارون میں
وہ دن کو ٹہلتا پھرتا تھا ان قدرت کے گلزارون میں
اور رات کو محو تماشا تھا انبر کے چمکتے تاروں میں
برفاب کا تھا ایک تال یہاں یا چاندی کا تھا تھال یہاں
الماس جڑا تھا زمرد میں یہ تال نہ تھا کہساروں میں
تالاب کے ایک کنارے پر یہ بن کا راجہ بیٹھا تھا
تھی فوج کھڑی دیواروں کی ہر سمت بلند حصوروں میں
یہاں سبز و گل کا نظارہ تھا اور منظر پیارا پیارا تھا
پھولوں کا تخت اُتارا تھا پریوں نے ان کہساروں میں
یاں بادِ سحر جب آتی تھی بھیروں کا ٹھاٹھ جماتی تھی
تالاب رباب بجاتا تھا لہروں کے تڑپتے تاروں میں
کیا مست الست نوائیں تھیں ان قدرت کے نرماروں میں
ملہار کا روپ تھا چشموں میں سارنگ کا رنگ فواروں میں

جب جوگی جوشِ وحدت میں ہر نام کی ضرب لگاتا تھا
اک گونج سی چکر کھاتی تھی کہساروں کی دیواروں میں

اس عشق و ہوا کی مستی سے جب جوگی کچھ ہوشیار ہوا
اس خال نشیں کی خدمت میں یوں ناظر عرض گزار ہوا

کل رشکِ چمن تھی خاکِ وطن ہے آج وہ دشتِ بلا جوگی
وہ رشتۂ الفت ٹوٹ گیا کوئی تسمہ لگا نہ رہا جوگی
برباد بہت سے گھرانے ہوئے آباد جو بندی خانے ہوئے
شہروں میں ہے شور بپا جوگی گاؤں میں ہے آہ و بکا جوگی
وہ جوشِ جنوں کے زور ہوئے انساں بھی ڈھنگر ڈھور ہوئے
بچوں کا ہے قتل روا جوگی بوڑھوں کا بھی خون بہا جوگی
یہ مسجد میں اور مندر میں ہر روز تنازع کیسا ہے ؟
پرمیشر ہے جو ہندو کا مسلم کا وہی ہے خدا جوگی
کاشی کا وہ چاہنے والا ہے یہ مکے کا متوالا ہے
چھاتی سے تو بھارت ماتا کی دونوں نے ہے دودھ پیا جوگی
ہے دیش میں ایسی پھوٹ پڑی اک قہر کی بجلی ٹوٹ پڑی
روٹھے متروں کو منا جوگی بچھڑے بیروں کو ملا جوگی
کوئی گرتا ہے کوئی چلتا ہے گرتوں کو کوئی کچلتا ہے
سب کو اک چال چلا جوگی اور ایک ڈگر پر لا جوگی
وہ میکدہ ہی باقی نہ رہا وہ خم نہ رہا ساقی نہ رہا
پھر عشق کا جام پلا جوگی یہ لاگ کی آگ بجھا جوگی

پربت کے نہ سوکھے رُوکھوں کو یہ پریم کے گیت سنا جوگی
یہ مست ترانہ وحدت کا چل دیس کی دُھن میں گا جوگی

بھگتوں کے قدم جب آتے ہیں کل جگ کے کلیش مٹاتے ہیں
تھم جاتا ہے سیلِ بلا جوگی رُک جاتا ہے تیرِ قضا جوگی
ناظرؔ نے جو یہ افسانۂ غم روداد وطن کا یاد کیا
جوگی نے ٹھنڈی سانس بھری اور ناظرؔ سے ارشاد کیا

بابا ہم جوگی بن باسی جنگل کے رہنے والے ہیں
اس بن میں ڈیرے ڈالے ہیں جب تک یہ بن ہریالے ہیں
اس کام، کرودھ کے دھارے سے ہم ناؤ بچا کر چلتے ہیں
جاتے نہیں منہ میں مگرمچھ کے دریا کے نہانے والے ہیں
ہے دیس میں شور پکار بہت اور جھوٹ کا ہے پرچار بہت
واں راہ دکھانے والے بھی بے راہ چلانے والے ہیں
کچھ لالچ لوبھ کے بندے ہیں کچھ مکروفریب کے پھندے ہیں
مورکھ کو پھنسانے ولاے ہیں یہ سب مکڑی کے جالے ہیں
جو دیس میں آگ لگاتے ہیں پھر اس پر تیل گراتے ہیں
یہ سب دوزخ کا ایندھن ہیں اور نرک کے سب یہ نوالے ہیں
بھارت کے پیارے پُوتوں کا جو خون بہانے والے ہیں
کل چھاؤں میں جس کی بیٹھیں گے وہی پیڑ گرانے والے ہیں
جو خون خرابا کرتے ہیں آپس میں کٹ کٹ مرتے ہیں
یہ بیر بہادر بھارت کو غیروں سے چھڑانے والے ہیں؟

جو دھرم کی جڑ کو کھودیں گے بھارت کی ناؤ ڈبودیں گے
یہ دیس کو ڈسنے والے ہیں جو سانپ بغل میں پالے ہیں
جو جیو کی رکھشا کرتے ہیں اور قہرِ خدا سے ڈرتے ہیں
بھگوان کو بھانے والے ہیں ایشور کو رجھانے والے ہیں
دُنیا کا ہے سرجن ہارو ہی معبود وہی مختار وہی
یہ کعبہ کلیسا بت خانہ سب ڈول اُسی نے ڈالے ہیں
وہ سب کا پالن ہارا ہے یہ کنبہ اس کا سارا ہے
یہ پیلے ہیں یہ کالے ہیں سب پیار سے اس نے پالے ہیں
کوئی ہندی ہو کہ حجازی ہو کوئی ترکی ہو یا تازی ہو
جب نیر پیا اک ماتا کا سب ایک گھرانے والے ہیں
سب ایک ہی گت پرناچیں گے سب ایک ہی راگ الاپیں گے
کل شیام کنہیا پھر بَن میں مُرلی کو بجانے والے ہیں
آکاش کے نیلے گنبد سے یہ گونج سنائی دیتی ہے
اپنوں کے مٹانے والوں کو کل غیر مٹانے والے ہیں
یہ پریم سندیسا جوگی کا پہنچا دو اُن مہا پُرشوں کو
سودے میں جو بھارت ماتا کے تن من کے لگانے والے ہیں
پرتما کے وہ پیارے ہیں اور دیس کے چاند ستارے ہیں
اندھیر نگر میں وحدت کے جو جوت جگانے والے ہیں
ناظرؔ یہیں تم آبیٹھو اور بن میں دھونی رما بیٹھو
شہروں میں گرو پھر چیلوں کو کوئی ناچ نچانے والے ہیں

ناظرؔ کی اس یادگار نظم کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس کے ہر شعر میں دیا ہوا پیغام

روحانیت ہمالہ کے ایک شفاف چشمے کی طرح نظر آتا ہے جس میں انسان مظہرِ الٰہی دیکھ کر روحانی اور فکری طور پر سرشار ہو جاتا ہے۔ اس تخلیق میں جو منفرد اسلوب استعمال کیا گیا ہے وہ شاعر کے اندازِ کلام کی بھی ترجمانی کرتا ہے اور جوگی کے مخصوص لہجے کو بھی اپنی مخصوص تلمیحات، ترکیبوں اور اشاروں سے حیات بخش بنا دیتا ہے۔

نظم میں ان جٹادھاری جوگیوں اور ننگ دھڑنگ سادھوؤں کی خلوت گاہیں نظروں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں جن میں زندگی گزار کر یہ عاشقِ خالقِ کائنات اپنے ہی دل میں مالک کے دیدار کرتے ہیں اور شہروں کے بے ہنگم شور و غوغا اور مسجدوں اور مندروں میں انہیں ذاتِ باری کی تلاش بے سُود لگتی ہے۔

جوگی تصوّف کے اس فلسفہ کی بھی عکاسی کرتی ہے جس کی رُو سے ہر ذی ہوش انسان بنی آدم کو ایک ہی ماں باپ کی اولاد جان کر اُس کے احترام کو آدمیت کا ماحصل سمجھتا ہے۔ یہ فلسفہ ہمارے یہاں للہ عارفہ اور شیخ نورالدین سے پہلے ہی دنیائے مشرق میں سینکڑوں صوفی شاعروں، اولیاء اللہ اور وحدت الوجود کے پرستاروں نے چارسُو ایک مکمل اور پاکیزہ طرزِ حیات کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ نظم آج کے معاشرے کے لئے برمحل اور برحق ہے۔ اس میں بھی اس کی افادیت کا راز پوشیدہ ہے۔

خوشی محمد ناظر سرزمین کشمیر سے دلی الفت رکھنے والے ایک ایسے سخن ور کا نام ہے جو کشمیری ثقافت اور ادبیات کے حوالہ سے ابد تک اہلِ کشمیر کے دلوں میں مسند نشیں رہے گا۔

..............☆☆☆..............

✿ ...... اصل: ڈاکٹر محمد اقبال نازکی

✿ ...... انگریزی سے ترجمہ: غلام نبی آتش

لداخ کے بروکھپا

افتتاحیہ:

سن ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۵ء کے دوران ڈاکٹر محمد اقبال نازکی، جو اُس زمانے میں کشمیر یونیورسٹی کے وسط ایشیائی مطالعاتی مرکز میں کام کرتے تھے، Ladakh character-A Socio -Psychological Study نام کے اہم تحقیقی منصوبے پر کام کرنے کے سلسلے میں کئی بار لداخ تشریف لئے گئے۔ اس دوران انہوں نے لداخ کے بروکھپا قبیلے کے بارے میں تحقیق کر کے دلچسپ معلومات حاصل کیں۔ ان معلومات کی تفصیلات کو کشمیری یونیورسٹی کے وسطِ ایشیائی مطالعاتی مرکز نے (Brokhpas of Ladakh) نامی مونوگراف میں ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر محمد اقبال نازکی کے اُنتالیس صفحات پر مشتمل اس مونوگراف کی اہمیت، دلچسپی اور افادیت کے پیشِ نظر اس کا ترجمہ اور اس کی تلخیص پیشِ خدمت ہے۔ (غلام نبی آتش)

تعارف: لداخ کی موجودہ آبادی تبّتی ، درد (Dard) اور مونز (Mons) جیسی مختلف نسلوں کے امتزاج کے طویل عمل کا نتیجہ ہے۔ تبّتی اصل میں منگولیائی نسل سے ہیں جبکہ درد اور مانز آریائی نسل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ گلگت کی نشاندہی دردوں کے اصلی وطن کے طور پر کی جاتی ہے۔ یقین کیا جاتا ہے کہ مونز شمالی ہندوستان (شاید کشمیر) سے نقلِ مکانی کر کے آئے تھے۔

دردوں کا ذِکر سب سے پہلے ہیروڈوٹس (Hero Dotus) نے کیا ہے۔ فرینکی (۱۹۰۷ء) "Francke" نے لکھا ہے کہ سونا کھودنے والی چیونٹیوں کا ملک "جس کا ذکر ہیروڈوٹس نے کیا ہے، سندھ میں موجودہ دردوں کا علاقہ ہے۔ وہ ہندوستان میں سب سے زیادہ جنگ پسند لوگ بتائے جاتے ہیں۔ اس سے صاف عندیہ ملتا ہے کہ درد قدیم لوگ ہیں اور انہوں نے ایرانیوں کے ساتھ بھی کچھ تعلقات پیدا کئے تھے۔

دردوں کی گلگت سے لداخ نقلِ مکانی کرنے کے صحیح وقت کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ دا (Da) کے دردوں کے بارے میں " Tribes of Hindukush" میں قیاس کیا گیا ہے کہ یہ قبیلہ گلگت سے ساتویں صدی عیسوی میں ترکِ وطن کر کے آیا تھا۔ ممکن ہے الگ الگ کنبے اس زمانے کے بعد نقل مکانی کر گئے ہوں۔ لیکن اس قبیلے کی اجتماعی نقلِ مکانی بہت پہلے زمانے میں عمل میں آئی ہو۔ ماہرین اس سلسلے میں لسانیاتی وجوہات پیش کرتے ہیں۔ پالمے (Ptolemy) کا حوالہ دے کر سنیل گرود (Snellgrove) اور سکوروپسکی 1977ء "Skorupski " کہتے ہیں کہ درد اُس زمانے میں بھی لداخ میں رہائش پذیر تھے، جب مشرقی افغانستان اور شمال مغربی ہندوستان پر کُشانوں کا راج تھا۔ یہ زمانہ پہلی صدی قبل مسیح اور تیسری صدی عیسوی کے درمیان کا ہے۔

زراعت دردوں کا خاص پیشہ رہا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ناقابلِ رسائی کھڑی

چٹانوں تک پانی لے جانے والی چھوٹی نالیاں بنانے میں اُنہیں خاصی مہارت ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بُدھ مت کی ایک شکل جو اُس زمانے میں گلگت میں رائج تھی، قدیم دردوں کا مذہب تھا۔ ہانو(Hanu) اور دا(Da) دیہات میں قبروں کی نشاندہی کی وضاحت کرتے ہوئے فرینکی ۱۹۰۷ء "Francke" نے لکھا ہے کہ قدیم دردوں میں نعش سوزی کا رواج نہیں تھا وہ مردوں کو دفناتے تھے۔ مگر یہی بات ہیبر اور ہیبر) ۱۹۰۳ء Heberand Heber نے دوسری طرح سے بتائی ہے۔ اُن کی رائے میں جو درد گلگت سے نقل مکانی کر کے لداخ آئے تھے، اُن کا مذہب اسلام رہا ہوگا۔ اس نقطۂ نظر کی تائید میں وہ کہتے ہیں بُدھ کنبے کی ہر نسل میں سے ایک بچے کو مسلمان اور ہر مسلمان کنبے کی ہر نسل میں سے ایک بچے کو بودھ بنایا جاتا تھا۔

لداخ کے دردوں نے اپنی تمدنی شناخت صدیوں سے قائم رکھی ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ لداخ اور بلتستان کے درمیان رابطے کے راستے پر آباد ہوئے ہیں، انہوں نے اپنی تمدّنی شناخت کو تبدیل ہونے نہیں دیا ہے۔ اگر چہ وہ بودھ ہیں لیکن اپنی کی مذہبی اور تمدنی سرگرمیوں دیگر لداخیوں یا لداخی قبیلوں سے پوری طرح ہمکنار نہیں ہیں۔ فرینکی ۱۹۰۷ء (Franckie) لداخی درد کریکٹر کو زیرِ بحث لاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان لوگوں نے اب تک اپنی زبان نہیں کھوئی ہے۔ انہوں نے تبّتی تمدّن کے سیلاب، جو اُن پر اُمڈ آیا تھا، کا جم کر مقابلہ کیا ہے۔ دا(Da) کے دردوں نے دراس کے دردوں کی طرح نہ اسلام کو گلے لگایا اور نہ ہی دِل کھول کر تبّتی لاما اِزم قبول کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے اپنی اصل Original کا بڑا حصہ محفوظ کرلیا ہے۔ اُن لوگوں نے عارضی طور ہی سہی، بھُلا دیا ہے کہ وہ تبتیوں اور ڈوگروں کے زیرِ نگین رہ چکے ہیں۔ اپنے تہواروں کے دوران وہ لمبے گیت گاتے ہیں جو اُن کے ماضی کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات فراہم کرتے ہیں۔

بروکھپا:

لداخ کے درد بروکھپا یا ڈوکھپا، چراگاہوں کے لوگ" (Brokhpas & Dokhpas) کے ناموں سے جانے جاتے ہیں۔ یہ لوگ لداخ کے چار مختلف دیہات، ہانو (Hanu)، دا (Da) دارسک (Darsik)، اور گارکونے (Garkone)، میں آباد ہیں۔ درد جو لداخ میں دوسری جگہوں پر سکونت پذیر ہوئے تھے اپنی شناخت کھو چکے ہیں، وہ ملی جلی نسل و تہذیب کا حصّہ بن گئے ہیں۔

زیرِ نظر مونوگراف کی بنیاد اُس فیلڈ سروے Field Survey کی معلومات ہیں، جو مصنف نے ۱۹۸۶ء میں انجام دی ہے۔ لداخ کے درد سماج کی خصوصیات کی تحقیق و تلاش اور نشاندہی اس مطالعے کا خاص مقصد تھا۔ مشاہدے کے علاوہ حقائق اور نتائج کے حصول کے لئے لوگوں کے ساتھ ملاقاتیں بھی اس کام کا ایک خاص حصّہ رہا ہے۔

دا اور ہانو Da & Hanu: تحقیق، تلاش اور مطالعہ دا اور ہانو دیہات تک محدود رکھا گیا۔ یہ گاؤں کھلسی سے ساٹھ ستر کلومیٹر کی دوری پر دریائے سندھ سے نیچے قدیم لداخ بلتستان روڑ پر واقع ہیں۔ لوگ دو زبانیں بولتے ہیں لداخی اور دروسخط (Droskhat)، دروسخط اُن کی مادری زبان ہے۔ یہ ایک آریائی زبان ہے اور زبانوں کے اُسی ذیلی خاندان سے تعلق رکھتی ہے، جس کے ساتھ کشمیری زبان کا تعلق ہے۔

مکان:

بروکھپا کے مکانات لداخیوں کے مکانات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ اُن کے مکانات ناہموار اور کھردرے پتھروں اور چکنی مٹی سے بنے ہیں۔ چھت پر درختوں کی ٹہنیاں بچھائی جاتی ہیں، جن پر پوری طرح گوندھی ہوئی چکنی مٹی ڈال دی جاتی ہے۔ ہر مکان کی چھت ہموار ہے۔ ان مکانوں میں برائے نام صفائی ہے۔ ان کو کبھی کبھار ہی صاف کیا جاتا ہے۔ دور سے ان مکانوں کی شدید گھن اور کراہت محسوس ہو جاتی ہے۔ وہ

لوگ نہانے اور صفائی رکھنے سے احتراز اور کنارہ کشی کرتے ہیں۔نہانے اور صفائی ستھرائی سے خوف کھانے کا تعلق اُن کے عقیدے کے ساتھ ہے۔اُن کا عقیدہ ہے کہ نہانا دھونا اور صفائی ستھرائی کرنا اُن کے لئے بد قسمتی اور مصیبت پیدا کرے گی۔ بہر حال وہ صنوبر کی خوشبودار نازک ٹہنیاں جلاتے ہین اور اپنے جسموں پر عمدہ جڑی بوٹیوں کے سفوف سے مالش کرتے ہیں تہواروں اور مجلسوں کو پاک رکھنے کے لئے ارغوانی رنگ کے پھول جلاتے ہیں۔

طبعی شکل اور نمایاں خصوصیات:

بروکھپاؤں نے آریائی چہرہ مہرہ اور خدوخال کو محفوظ رکھا ہے۔ بروکھپا مرد اور عورتیں لداخیوں کے مقابلے میں آسانی سے علاحدہ طور پر پہچانے جاسکتے ہیں۔ان کے خدوخال عمدہ اور اعضائے بدن متناسب ہیں۔گوری عورتیں بادامی رنگ کی آنکھوں والی ہیں۔مرد بادامی آنکھوں والے اور لمبے قد کے ہیں۔لوگ سخت محنتی ہیں۔ایک زمانے میں وہ بہادر لوگ رہے ہیں۔ وہ اپنے اسلاف کی بہادری کے کارنامے دہراتے رہتے ہیں۔ اپنے لوک ادب میں انہوں نے اپنے ہیروؤں (Heros) کی بہادری کی کہانیاں محفوظ کرلی ہیں۔ یہ بہادر اور جری لوگ لداخ کے بادشاہوں کے دباؤ کا شکار نہیں ہوئے اور جبری محنت مزدوری سے صاف انکار کیا۔لداخ میں ایک کہاوت ہے کہ" دو چیزیں ناممکن ہیں، کتے پر بوجھ لادرکھنا اور بروکھپا سے جبری مزدوری کروانا" یہ کہاوت بروکھپاؤں کی بہادری اور ہمت کی نشاندہی کرتی ہے۔وہ لوگ سیدھے سادے، ایماندار اور مہمان نواز ہیں۔اُن کی دیانت اور ایمانداری سے دوسرے علاقوں کے لوگ متاثر ہوجاتے ہیں۔اُس سماج میں چوری چکاری کے نام سے لوگ ناواقف ہیں۔ جرم برائے نام بھی نہیں۔ اجنبیوں کو آبرومند مہمان مانا جاتا ہے اور چھنگ سے اُن کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔

میوے پیش کیئے جاتے ہیں۔ چھنگ ایک مقامی شراب ہے۔

پہناوا:

بروکھپاؤں کے سر کا پہناوا لائقِ امتیاز ہے۔ یہ سینگ نُما ٹوپی ہوتی ہے، جس پر سوئیاں، تکمے، ربن اور پھول لگائے جاتے ہیں۔ لوگ پھولوں کے خاص عاشق ہیں۔ بردکھپا مرد اور عورتیں اپنے کھیتوں میں طرح طرح کے پھول اُگا کر اپنی ٹوپیوں پر سجاتے ہیں۔ زمستان کے دوران سُکھائے ہوئے اور نقلی، دونوں طرح کے پھول استعمال کیئے جاتے ہیں۔ عورتیں سر کے بالوں کو مختلف گچھوں میں بانٹ کر ان میں موتی اور منکے لگا لیتی ہیں۔ بروکھپاؤں کے پہناوے کا دوسرا اہم جز اُن کا گاؤن (Gown) ہے، جو اُون سے بنایا جاتا ہے لیکن لداخیوں کے گنچا (Guncha) سے مختلف ہوتا ہے۔ اس میں لداخی Guncha کی طرح بیلٹ نہیں ہوتا ہے اور کافی ڈھیلا بھی ہوتا ہے۔ عورتیں سلائی کے کام میں دلچسپی لیتی ہیں، وہ اپنے گاؤن (Gown) پھولوں کے ڈیزائنوں سے سجاتی ہیں۔

روزمرہ کا کام:

بروکھپاوں کی زندگی میں رنگارنگی نہیں ہے، اس لئے اُن کی معمول کی زندگی یکسانیت کے باعث اُکتا دینے والی ہے۔ کھیتوں میں کام کاج کی شروعات کے لئے عورتیں مردوں کے مقابلے میں بہت سویرے جاگ جاتی ہیں۔ مرد اُن کے بعد کام پر پہنچ جاتے ہیں۔ مرد اور عورتیں ایک ساتھ ایک گھنٹے تک کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ عورتیں گھروں کو لوٹ کر ناشتہ تیار کر لیتی ہیں، جس میں پپا (Papa)، تھپا (Thupa) اور گُر گُر چائے شامل ہوتی ہے۔ پپا اور تھپا بھنے ہوئے آٹے سے بنایا جاتا ہے جبکہ لکڑی کے ایک میٹر لمبے پیپے میں چائے کی پتیاں، دودھ، نمک اور مکھن ایک ساتھ ڈال کر اسے ایک بلونے سے خوب بلویا جاتا ہے، یہی مرکب گُر گُر چائے کہلاتا ہے۔ مرد اور عورتیں ناشتہ کر کے دوبارہ کھیتوں میں جا کر شام تک کام میں مصروف رہتے ہیں۔ دو پہرہ کو چائے اور

معمولی ہلکی غذا کھاتے ہیں۔ شام کا کھانے کھا کر بروکھپا چھنگ کی پیالی پی لیتے ہیں۔ گاتے ہیں اور رقص کرتے ہیں۔

جاڑوں میں کام کاج اور سرگرمیاں ٹھپ ہو جاتی ہیں۔ یہ وہ موسم ہے جس میں بروکھپا زیادہ تر سوتے رہتے ہیں۔ کچھ عورتیں اون کاتتی ہیں اور مرد گرم کوٹوں اور چادروں کے لئے اس کی بُنائی کرتے ہیں۔

بنیادی معاش اور روزگار:

ا۔ زراعت:

زراعت بروکھپاؤں کا بڑا پیشہ ہے۔ بروکھپاؤں کے گاؤں دریائے سندھ کے آس پاس بلند اور بے برگ و گیا، بنجر پہاڑی چوٹیوں سے گھری ہوئی تنگ گھاٹی میں واقع ہیں۔ اُن کے پاس قابلِ کاشت زمین بہت کم ہے۔ لیکن زمین کی زرخیزیت، کاشتکاری کے لئے پانی کی دستیابی، آفتاب کی تیز تر گرمی اور روشنی اور گرم آب و ہوا کی وجہ سے وہ لوگ سال میں دو فصلیں اُگاتے ہیں۔ یہ فصلیں ہیں جو باجرہ، سیاہ گندم وغیرہ۔ یہی فصلیں اُن کی خوراک ہیں۔ ٹماٹر، انگور اور خوبانیاں فروخت کر کے پیسہ حاصل کیا جاتا ہے۔ خوبانیاں سُکھا کر لیہہ اور کرگل کے بازاروں میں فروخت کی جاتی ہیں۔ انگور بھی بیچے جاتے ہیں مگر کچھ انگور اپنے پاس رکھے جاتے ہیں، جن سے مقامی طور شراب کشید کی جاتی ہے۔ سفیدے اور بید کے درختوں سے جلانے کے لئے لکڑی حاصل کی جاتی ہے۔ وہ لوگ گائے کے گوبر کے اوپلے ایندھن اور بالن کے طور پر استعمال نہیں کرتے، حالانکہ لداخ میں اس کا رواج ہے۔

۲۔ مویشی پالن:

بروکھپا بھیڑ بکریاں پالتے ہیں لیکن گائے پالنے کے خیال سے بھی متنفر ہیں۔

مُرغ، مرغیاں اور کتے بھی نہیں پالتے۔گایوں، مرغ، مرغیوں اور کتوں کی موجودگی کو دیوتاؤں کی بے حرمتی سمجھا جاتا ہے۔گائے کے دودھ، دودھ سے بننے والی اشیا اور انڈوں کی سخت ممانعت ہے۔گائے کا گوبر ایندھن اور بالن کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا۔ کھیتوں میں بھی بطورِ کھاد یا یوں ہی یہ گوبر ڈالنے کا رواج نہیں، اس کام کو بھی آفت آور اور شامت آور مانا جاتا ہے۔اس خاندان کا صرف ایک حیوان ذُو(Zo) جو کہ گائے اور یاک کی ملی جُلی نسل کا ہوتا ہے، پالا جاتا ہے۔یہ اُن کی زبردست مجبوری ہے کیونکہ زمین جوتنے کے لئے ہل کھینچنے والا کوئی اور حیوان یا متبادل طریقہ اُن کے پاس نہیں ہے، اسی لئے ذو (ZO) کو برداشت کیا جاتا ہے۔پھر بھی اس حیوان کو سال بھر سوائے زمستان اور زمین جوتنے کے، موسم کے چراگاہوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔زمستان میں ذُو(Zo) کو علاحدہ چھپروں کے نیچے رکھا جاتا ہے جبکہ بھیڑوں اور بکریوں کو اپنے رہائشی مکانوں کے اندر کسی حصے میں بہ حفاظت رکھا جاتا ہے۔گاؤں میں گوبر کے بڑے بڑے ڈھیر پڑے ہیں، جو کسی بھی طرح استعمال میں نہیں لائے جاتے ہیں۔

۳۔ معاشی حالت:

بروکھپاؤں کی معاشی حالت نہایت پست ہے، اس کی مختلف سطحوں کی وضاحت مشکل ہے۔اس سماج کی کمزور معاشی حالت کی مختلف وجوہات ہیں۔مثلاً جغرافیائی علاحدگی کی وجہ سے سماجی اور تعلیمی پسماندگی۔لوگ اپنے گھر اور گاؤں سے روزگار کی تلاش میں باہر جانے سے ہچکچاتے ہیں اور ہر وقت غیر آمادہ رہتے ہیں۔چند ہی لوگ ہوں گے جو کبھی سری نگر یا جموں گئے ہوں۔اُن کی آخری منزل لیہہ اور کرگل کے بازار ہیں، جہاں وہ خرید و فروخت کے لئے جاتے ہیں اور ضرورت کی چیزیں لاتے ہیں۔

۴۔ مردوں کا مقام:

معاشی اور اقتصادی معاملات میں مردوں کے فیصلے حتمی ہوتے ہیں۔ یہ فیصلہ صرف اُن کو کرنا ہے کہ زمین یا مویشی فروخت کیئے جائیں یا خریدے جائیں۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ جائیداد میں سے کوئی چیز خریدنے یا بیچنے کا اختیار صرف مردوں کے ہاتھ میں ہے۔ اپنی فصلوں کی قیمت مقرر کرنے اور اُن کے بیچنے کے عمل پر مردوں کی اجارہ داری قائم ہے۔ مرد بیوپاریوں کے ساتھ خرید وفروخت کے بارے میں بات چیت کرتا ہے، بیچنے کے لئے مال لیہہ یا کرگل کے بازاروں تک لے جاتا ہے۔ کچھ بیوپاری گاؤں میں آکر ٹماٹر، سبزیاں اور میوے خریدتے ہیں۔

۵۔ محنت ومشقت کی تقسیم:

بروکھپا سماج میں دستکار اور فنکار موجود نہیں ہیں، سماج کی خدمت کے لئے ماہر لوگ مثلاً حجامت کرنے والے، درزی وغیرہ نایاب ہیں لوہاروں اور ترکھانوں کے کام بھی ذیلی پیشے میں آتے ہیں۔ یہ کوئی خاص پیشے تصور نہیں کیئے جاتے بلکہ لوہار اور ترکھان بھی زیادہ وقت زمینداری کے کاموں میں گزارتے ہیں۔ خاص طور پر کام اور محنت کی تقسیم اور باہمی انحصار کا فقدان ہے۔ ہر گھر ایک خود کفیل اکائی ہے۔ یہ لوگ صدیوں سے مشکل حالات میں گذر بسر کرتے آئے ہیں۔ بروکھپاؤں کے گاؤں کے ارد گرد لداخ کے مختلف علاقوں میں لداخی آباد ہیں، جن کے ساتھ ماضی میں اُن کے تعلقات اچھے نہیں رہے ہیں۔

لوگ سخت محنتی ہیں۔ عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ کام کرتی ہیں۔ وہ زمینداری کے کاموں میں مردوں کے دوش بدوش رہتی ہیں، بچے پالتی ہیں اور گھر کا کام کاج کرتی رہتی ہیں۔ بچے بھی معاشی کاموں میں اپنا معمولی سا حصہ ادا کرتے ہیں۔ کار آموزوں کے طور پر یہ بچے نہایت چھوٹی عمر سے والدین کے ساتھ باغوں اور کھیتوں میں

چلے جاتے ہیں۔

سماجی نظم:

دا(Da) میں ۵۳ اور ہانو(Hanu) میں ۸۰ گاؤں ہیں۔ دا(Da) کی آبادی ۴۵۰ اور ہانو(Hanu) کی ۷۵۰ سے ۸۰۰ نفوس پر مشتمل ہے۔ دا(Da) میں بیما(Beama)، لاسٹنگ (Lasting)، سینٹ (Sanit) اور بورڈش سمیت کل پانچ چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں۔ دا(Da) گاؤں ان ہی بستیوں کا مجموعہ ہے۔ ہانو تھینگ (Hanu Thang)، ہانو یوگما(Hanu Yogma) اور ہانو گوما(Hanu Goma) کی بستیاں ہانو (Hanu) گاؤں کا وفاق بنائے ہوئے ہیں۔

ا۔ چھوٹے قبیلوں کے درمیان تعلقات:

مختلف خاندانوں کا ایک چھوٹا قبیلہ ہوتا ہے۔ ہر گاؤں میں چند چھوٹے قبیلے ہیں۔ ہر قبیلے کا اپنا سردار ہے۔ لیکن ان سرداروں کے پاس بہت کم اختیارات ہیں۔ سب لوگ صرف ایک شخص کے اختیارات سے باخبر ہیں جس کو جمہوری طریقے سے منتخب کیا جاتا ہے اور کافی اختیارات کا مالک ہے۔ اسے مقدم (Mokdam) کہتے ہیں اور یہی گاؤں کا مکھیا ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر کمیونٹی کے اہم فیصلے وہی کرتا ہے۔ گاؤں کی بہبودی کے کاموں کے لئے اربابِ اقتدار سے ملتا ہے۔ وہی تہواروں کی تاریخیں مقرر کرتا ہے۔ بروکھپا عدالت اور مقدمہ بازی نہیں جانتے۔ بھائیوں، دوستوں اور ہمسایوں کے درمیان تنازعات کو سلجھانے کے لئے، مقدم Mokdam گاؤں کے دوسرے بزرگوں کے ساتھ مشاورت کر کے، خود فیصلے سناتا ہے۔ مقدم اور اُس کی ساتھ پوری تحقیق اور تفتیش کے بعد فیصلے دیتے ہیں۔ مجرم کا جرم اور ظالم کا ظلم ثابت ہو جانے پر مظلوم کو معارضہ دیا جاتا ہے۔ معارضہ نقدی صورت میں دیا جاتا ہے اور کبھی کبھی جنس کی صورت میں بھی۔ کئی معاملوں

میں جرم ثابت ہونے کی صورت میں مجرم سے عوام کے لئے کوئی چیز جیسے قالین، غالیچہ یا مٹی کے تیل سے روشن ہونے والا لمپ وغیرہ، وصول کی جاتی ہے، جو عوامی مجلسوں اور تہواروں کے انعقاد کے وقت استعمال کی جاتی ہے۔ جن مقدمات میں فیصلے سُنانے میں دقت پیش آتی ہے، اُس کا جو فریق اپنی بات زوردار طریقے سے پیش کرتا ہو تو اُسے قسم کھانی پڑتی ہے۔ اس طرح اس کی قسم پر بھروسہ کر کے اُسی کے حق میں فیصلہ دیا جاتا ہے۔ مقدمہ دائر کرنے والے فریقین کو اِس بات پر پوری طرح پابند رہنا پڑتا ہے کہ فیصلہ سنائے جانے کے ایک سال بعد تک وہ عوامی اجتماعات میں بحث ومباحثے اور مقابلے میں باہمدیگر نہ اُلجھیں۔ اگر ایک فریق کسی تہوار میں مثال کے طور پر لوسر اشروپلا (Shrupla) یعنی فصل کٹائی کا تہوار، پہلے دِن شامل ہو جائے تو دوسرا فریق اُس دن نہیں بلکہ دوسرے دن تہوار میں شامل ہوگا۔ اس طرح بار بار کے جھگڑوں کو روکا جاتا ہے۔

مختلف قبیلوں کے تعلقات بہت قریبی اور مضبوط ہیں۔ اُن میں ذات پات کا تصور نہیں ہے۔ مختلف قبیلے آپس میں شادیاں کرتے ہیں۔ اگرچہ لداخی اور بروکھپا نسل کے لحاظ سے اپنی اپنی برتری کا احساس رکھتے ہیں تاہم ایسا لگتا ہے کہ وہ ماضی کی تلخیوں کو شاید بھول چکے ہیں۔

۲۔ گھروں کی نظم

بروکھپا بنیادی طور پر مشترکہ خاندانوں میں رہتے ہیں۔ اُن کے گھر یا خاندان پوری طرح مربوط ہیں۔ چند شوئی (ایک سے زیادہ شوہر) اور کثرتِ ازدواج (ایک سے زیادہ شوہر یا ایک سے زیادہ بیویاں) کے رواج شاید، اُن کے مشترکہ خاندانوں کو استحکام دیتے ہیں۔ اگرچہ گھر یا خاندان کی عورت کو توقیر وعزت اور تھوڑا اختیار حاصل ہے پھر بھی مرد ہی گھر، خاندان اور قبیلے کا سردار ہوتا ہے۔ گھر کے سب سے بڑے مرد کے فیصلے حتمی

ہوتے ہیں اور وہ اختیارات کا مرکز ہوتا ہے۔

۳۔خواتین کا درجہ:

عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ کام کرتی ہیں۔وہ کھیتوں میں مردوں کے ساتھ ساتھ کام کرتی ہیں، بچے پالتی ہیں اور گھر کا کام کاج کرتی ہیں۔سردیوں۔کے موسم میں اون کاتتی ہیں۔لیکن انہیں موروثی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد پر کوئی حق نہیں۔وہ تمام مذہبی اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہیں۔انہیں معاشی معاملات کے فیصلوں میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہے۔زمین، زرعی پیداوار اور مویشی خریدنے یا بیچنے کے عمل میں ان کو کوئی اختیار نہیں ہے۔عورتوں کو دوسروں کے ساتھ جنسی تعلقات رکھنے کے لئے کوئی سزا نہیں دی جاتی ہے۔

شادی :

شادیاں اپنے ہی قبیلوں میں کی جاتی ہیں۔قبیلے میں قریبی رشتہ داروں کے ساتھ شادیوں کے رواج کا زیادہ ہی چلن ہے۔نسل کی اصل کا خیال رکھنے کی وجہ سے شادیاں غیر بروکھپا لڑکی غیر بروکھپا عاشق سے اختلاط رکھے مگر بروکھپا لڑکا کسی غیر بروکھپا لڑکی سے مل کر اس کے ساتھ شادی کر لے یا اسے اپنے ساتھ گاؤں میں لے آئے ممکن نہیں۔اگر ایسا ہو بھی جائے تو وہ محض برائے نام ہوگا۔شادیوں کی تین قسموں کا رواج ہے۔یک زوجگی (ایک وقت میں ایک عورت کے ساتھ شادی) کثیر الازواج (ایک وقت میں ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ شادی) اور چند شوئی (ایک وقت میں ایک عورت کی ایک سے زیادہ مردوں کے ساتھ شادی)۔کثیر الازواجی اور چند شوئی نوع کی شادیاں ایک ایک گھر میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جہاں چند شوئی عورت کا بیٹا ایک سے زیادہ بیویاں رکھتا ہے۔ایسے گھروں کی نشاندہی بھی ہوئی ہے جہاں ایک مرد نے ایک ہی وقت دو سگی بہنوں کے ساتھ شادی کی ہے۔کثیر الازواج قسم کی شادیوں میں،

عورت کو اپنے کسی شوہر کو رد کرنے کا اختیار ہے۔ جس شوہر کو رد کیا جاتا ہے وہ مشترکہ گھر سے بے دخل ہو کر کہیں اور شادی کر کے گھر بسا لیتا ہے۔

کوئی عورت اگر خاوند کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے ساتھ شادی کر کے اُس کے گھر میں رہنے لگے تو چھوڑے ہوئے خاوند کو اُس عورت کے لئے خاوند کی طرف سے بطورِ تلافی نقد معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح چھوڑی ہوئی عورت کو بھی پہلے خاوند سے معاوضہ حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔

شادیاں پوری تیاریاں کر کے اہتمام سے انجام دی جاتی ہیں۔ بہت چھوٹی عمر میں لڑکوں کے لئے رشتے مقرر کئے جاتے ہیں۔ شیر خوار بچے کا باپ شیر خوار بچی کے والدین کے پاس جا کر انہیں ایک روپے اور کچھ چھنگ پیش کرتا ہے۔ چھنگ اور ایک روپے قبول کرنے کا مطلب شیر خواروں کی شادی کی قبولیت سمجھا جاتا ہے۔ اگر شیر خوار لڑکے کے والد کا ارادہ اپنے لڑکے کی شادی ایک سے زیادہ لڑکیوں کے ساتھ کروانا ہو، تو وہ اُس ہر لڑکی کے لئے الگ الگ چھنگ اور ایک ایک روپے پیش کر کے کثیر الازواج طریقے کی شادی کے لئے اقرار حاصل کرتا ہے اور یہ لڑکیاں ایک ہی خاندان کی ہوتی ہیں۔ منگنی کی رسم سولہ سے اٹھارہ سال کی عمر میں انجام دی جاتی ہے، اس وقت تک کوئی اور تقریب نہیں منائی جاتی یا کوئی رسم انجام نہیں دی جاتی ہے۔ منگنی کی رسم دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ اس موقعے پر متوقع دُلہے کا باپ اور ماموں گاتے اور رقص کرتے ہوئے متوقع دُلہن کے باپ کے گھر پہنچ کر چھنگ، ایک سوئی اور ایک روپیہ پیش کرتے ہیں۔ یہ چیزیں روٹی پر رکھ کر متوقع دُلہن کے والدین کے سامنے رکھی جاتی ہیں۔ اس موقعے پر متوقع دُلہے کے باپ اور ماموں کے ساتھ اپنے قبیلے کا کوئی اور مرد بھی آتا ہے۔ چھنگ، سوئی اور ایک روپے قبول کرنے کا مطلب ہے کہ لڑکی کا باپ اُس کی شادی کے لئے رضا مند ہے اور اُس نے ہاں کر دی ہے۔ لڑکی کو لباسِ عروسانہ پہنا کر سجایا جاتا ہے۔ رشتہ

داروں، دوستوں اور ہمسایوں کو دعوت دی جاتی ہے۔ خوب ناچنے گانے کے بعد انہیں شاندار ضیافتیں پیش کی جاتی ہیں۔ سب لوگ خوب چھنگ پیتے ہیں۔ دوسرے دن لڑکی کا ماموں متوقع دُلہے اور متوقع دلہن کو اپنے گھر میں دعوت کھلاتا ہے۔ اسی طرح لڑکے کا ماموں بھی دونوں کی اپنے گھر میں خوب خاطر تواضع کرتا ہے۔ بروکھپاؤں کے برعکس لداخیوں میں شادی سے قبل ایسی دعوتیں کھلانے کا رواج نہیں ہے۔ لداخی یہ سب شادی ہونے کے بعد کرتے ہیں۔

لاما کے مشورے اور ہدایت کے مطابق شادی کی تاریخ، وقت اور دِن کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ بارات میں دس سے پندرہ لوگ شامل ہوجاتے ہیں۔ دُلہے کے باپ اور ماموں کو بارات میں ضرور شامل ہونا پڑتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ دُلہا باراتیوں کے ساتھ نہیں ہوتا۔ باراتی دُلہن کے میکے پہنچ جاتے ہیں تو اُن کے مکان کا بڑا دروازہ مقفل پاتے ہیں۔ باراتی آنگن میں کچھ دیر کے لئے گاتے اور ناچتے ہیں۔ اس کے بعد مکان کا صدر دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ دُلہے کا باپ اور ماموں دونوں اس رقص اور سنگیت کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اسی اثناء میں دُلہن کو اپنے ماموں کے مکان میں پہنچا دیا جاتا ہے۔

باراتی بہت دیر تک گانے، ناچنے اور چھنگ پینے میں مصروف رہتے ہیں۔ اس دوران دُلہن کو نہلایا جاتا ہے، لباسِ عروسانہ پہنایا جاتا ہے اور اُس کا بناؤ سنگار کیا جاتا ہے۔ باراتی بعد میں دُلہن کے ماموں کے گھر چلے جاتے ہیں۔ وہاں بھی کچھ وقت رقص و سرور، گانے بجانے اور چھنگ پینے میں بتاتے ہیں۔ دُلہن کو ایک جوان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اپنے باپ کے کھیتوں تک لے جایا جاتا ہے۔ باراتی بھی اُن کے ساتھ جاتے ہیں۔ یہاں تھوڑی دیر کے لئے ناچنے گانے کے بعد وہ سب دُلہے کے گھر کی سیدھ لیتے ہیں۔ راستے میں دُلہے کے دوست اور رشتے دار باراتیوں کو ستو (بُنا ہوا آٹا) پیش کرتے ہیں۔ واپسی میں اُن کو پیسے دیئے جاتے ہیں۔

دُلہے کے گھر پہنچ کر باراتیوں اور دُلہن کا والہانہ استقبال کیا جاتا ہے۔ استقبال کرنے والوں میں سارے مہمان شامل ہوتے ہیں۔ لاما آنگن میں کچھ دیر کے لئے ساز بجا کر سُتو تیار کرتا ہے۔ کچھ مذہبی (Text) دُہرا دُہرا کر ستو کو دُلہن کے سر پر تین تین بار پھیرا کر دور پھینکتا رہتا ہے۔ اس کے بعد دُلہن دُلہے کے رہائشی مکان کے قریب پہنچ کر اُس کا صدر دروازہ مقفّل پاتی ہے۔ اُس کی ساس اندر سے دروازے کی ایک جھروکے میں سے اُسے ایک چوڑی پیش کرتی ہے۔ دُلہن کے لئے ضروری ہے کہ وہ چوڑی پہن لے۔ ایسا کر کے دروازہ کھلتا ہے اور دُلہن اندر داخل ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ جس کمرے میں چلی جاتی ہے وہاں پہلے سے دُلہا انتظار میں بیٹھا ہوتا ہے۔ دُلہن اُس کے بالکل قریب بیٹھ کر اپنی داہنی ران دُلہے کی بائیں ران کے نیچے رکھ دیتی ہے۔ اگر دو بہنیں ایک ہی وقت میں ایک دلہے کے لئے ہوں۔ تو بڑی بہن دُلہے کے بالکل قریب بیٹھ جائے گی۔ چھوٹی بہن بڑی بہن کی ٹوپی، جو سوئیوں، پھولوں، تکموں اور فیتوں سے سجائی ہوئی ہوتی ہے، اُس کے سر سے اُتار دی جاتی ہے اور وہ ساس کے پاس، جو اُسی کمرے میں ایک کونے میں بیٹھی ہوتی ہے، چلی جاتی ہے۔

ناچ گانا، جو ساری رات اور دوسرے دن کے اختتام تک جاری رہتا ہے، دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ اُس دن دُلہن اور دُلہا بھی ناچ گانے میں شریک ہو جاتے ہیں۔ آنے والی رات کو شادی اس وقت تکمیل کو پہنچتی ہے جب دُلہا اور دُلہن وہاں سے چلے جاتے ہیں۔

مذہب اور مذہبی سرگرمیاں:

بروکھپا بودھ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے عقاید اور مذہبی رسوم کا مشاہدہ اور پوری چھان بین کر کے انہیں کسی ایک عقیدے کے ساتھ جوڑنا بہت مشکل ہے۔ ان کا عقیدہ اور اعتقاد مختلف عقاید کا مرکّب ہے۔ حیوانوں کی قربانی دینا، حیوانوں کی پرستش

کرنا، سورج اور دیوتاؤں کو پوجنا اور کبھی کبھی ساکیہ مُنی کے حامی اور پیرو ہونے کا دعویٰ کرنا مبہم اور خلط ملط معاملہ ہے۔ مورّخوں کو بھی اُن کے کسی ایک مذہب، عقیدے اور اسطور پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ اتفاق نہیں ہے۔ بہر حال یہاں اُن کے معاصر مذہبی عقاید اور سرگرمیوں کے بارے میں ایمانداری کے ساتھ تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

بروکھپا بنیادی طور پر تقدیر کے قائل ہیں۔ وہ دیوتاؤں، بھوتوں، پربتوں، اور آسیبوں میں یقین رکھتے ہیں۔ اُن کے تین اہم دیوتا ہیں۔ لا (La) ڈوگلا (Dogla) اور سپڈک (Sapdak)، جن کی وہ مہاتما بدھ سے بہت زیادہ پوجا کرتے ہیں۔ ان دیوتاؤں کا بروکھپاؤں کی زندگی پر زبردست اثر ہے۔ اُن دیوتاؤں کا غصّہ اور اُن کی ناراضگی مصیبتوں، بیماریوں اور موت کا سبب بن جاتی ہے۔ ان دیوتاؤں کی رضا، خوشی اور مسّرت بروکھپاؤں کے لئے لمبی عمر، خوشی اور خوشحالی اچھی صحت اور دیگر مسّرتیں لاتی ہے۔ ہر گھر میں تینوں دیوتاؤں کی پتھر کی غیر منقش مورتیاں موجود رہتی ہیں۔

بروکھپاؤں کے لئے اُن کے مطبخ نہایت مقدس ہیں۔ دوسروں کے لئے وہ ممنوعہ جگہیں ہیں۔ مطبخوں میں چولہے کے پاس تینوں دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی جاتی ہیں۔ باہر سے آنے والے علی الخصوص جو گائیں پالتے ہوں، کتّے اور مرغ مرغیاں پالتے ہوں، انڈے اور گائے کا دودھ کھاتے پیتے ہوں، ان مطبخوں کے اندر نہیں جاسکتے۔ اگر وہ کسی طرح اندر جانے کی اجازت پالیتے ہیں تو یقین کیا جاتا ہے کہ دیوتاوں کی ناراضگی کو مدعو کیا گیا، جس کا لازمی نتیجہ گھر والوں کے لئے دیوتاؤں کا غصّہ، مصیبتیں جیسے کہ موت، بیماریاں اور قحط وغیرہ ہے۔ اب چونکہ باہر کے لوگوں نے بروکھپاؤں کے پاس آنا جانا شروع کیا ہے، اس لئے ہر بروکھپا گھر میں دو دو مطبخ بنائے جانے لگے ہیں۔ ایک وہ جو غیروں کے لئے ممنوعہ رکھا جاتا ہے اور جس میں مذہبی رسوم ادا کئے جاتے ہیں اور دوسرا وہ جہاں کوئی بھی آجاسکتا ہے۔ ممنوعہ مطبخ مکان کے بالکل اندر ہوتا ہے، جس میں نہایت کم

تازہ ہوا اور روشنی پہنچ پاتی ہے۔ گھر کے بڑے لوگ دیوتاؤں کی مورتیوں کی روزانہ پوجا کرتے ہیں اور مورتیوں کو کھانے کا تیل ارپن کیا جاتا ہے۔ ہر نئی پکی فصل کا نمونہ ان مورتیوں کی نذر کرنا پڑتا ہے۔ ایسے نذرانے ان مورتیوں کے ساتھ لٹکے نظر آتے ہیں۔

بروکھپاؤں کے عقیدے کی ایک اور خاص بات ہے، دیوتاؤں کو حیوانوں کی قربانیاں پیش کرنا۔ مختلف موقعوں پر قربان گاہوں میں بڑے دیوتاؤں کے لئے بکریوں کی قربانیاں دی جاتی ہیں۔ یہ قربانیاں اس امید اور اعتقاد کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں کہ سال بھر کی محنت کے بعد بھرپور فصل ہاتھ آسکے، سردیوں کے بعد دیوتاؤں سے خوش بختی اور کرم مِل سکے اور زرعی سرگرمیاں اچھی طرح شروع ہو کر تکمیل کو پہنچ جائیں۔ اچھی فصل اور خوشحالی حاصل ہو سکے۔ کئی گھر مل کر قربانی پیش کرتے ہیں۔ بعض اوقات گھر والوں میں بانٹا جاتا ہے لیکن گھر کا مکھیا جو اصل میں قربانی پیش کرنے والا ہوتا ہے، چوبیس گھنٹوں تک یہ گوشت نہیں کھا سکتا ہے۔

قربان گاہیں عجیب جگہیں ہوتی ہیں۔ یہ چٹانوں کی بڑی بڑی دراڑوں میں یا چٹانوں کے اندر بنے قدرتی غاروں میں واقع ہیں۔ ان قربان گاہوں میں حیوانوں کے سینگ اور صنوبر کے درخت کی ٹہنیاں پڑی رہتی ہیں۔ قربانیوں کا یہ عمل قدیم عقیدوں اور رسموں کی باقیات میں سے ہے۔

بڑے بزرگ، جیسا کہ دوسرے تمدّنوں میں بھی ہوتا ہے زیادہ وقت دُعا اور عبادت میں گزارتے ہیں۔ اکثر اوقات وہ لداخیوں کی طرح "Prayer Wheel" جس پر ''اوم مانے پدمے ہُن'' "Om Mane Padme Hun" کندہ کیا ہوتا ہے، گھماتے رہتے ہیں۔ جوان صبح اور شام کو یہ عبادت کرنے کے لئے کچھ وقت نکال لیتے ہیں۔ بڑے بزرگ کبھی کبھار تین سے سات دنوں تک دنیا کو بھول کر اس عبادت میں محو رہتے ہیں۔ اس مدت کے دوران وہ ہرگز اپنا فاقہ نہیں توڑتے، کسی کے ساتھ بات نہیں

کرتے اور گونپے سے باہر نہیں آتے ہیں۔ یہ خاص عبادت موسمِ سرما کے اختتام کے فوراً بعد شروع کی جاتی ہے۔

بروکھپاؤں کا ہفتہ دس دنوں کا ہوتا ہے۔ ہر دس گھروں میں دس دس دنوں کے بعد دس دعائیہ مجالس منعقد کی جاتی ہیں۔ان میں ہمسائے شامل ہو جاتے ہیں۔میزبان چھنگ پلا کر اور گیت گا کر مہمانوں کی خاطر داری کرتا ہے۔

تہوار:

ا۔لوسر (Losar) نئے سال کا تہوار ہے۔ بروکھپا، دوسرے لداخی بودھوں کی طرح، بارہ سال والے کلینڈر پر عمل کرتے ہیں۔ ہر ایک سال کو کسی حیوان کا نام دیا جاتا ہے۔کوئی فرد جو (Monkey Year) مطلب بندروں کے سال میں پیدا ہو جاتا ہے، وہ عمر کے بارہ سال مکمل کر کے اپنے آپ کو پھر بندروں کے سال میں پاتا ہے۔اسی لئے بروکھپا اپنے جنم دِن ہر سال کے بجائے بارہ سالوں کے بعد مناتے ہیں۔ جو لوگ بندروں کے سال میں پیدا ہوئے وہ نئے بندروں کے سال کے پہلے دن مجموعی طور پر اپنا جنم دن مناتے ہیں۔ جو لوگ جنم دن مناتے ہیں وہ مختلف عمروں کے ہوتے ہیں۔لوسر نہ صرف سال کے لئے دن کے طور پر بلکہ جنم دن کے طور پر بھی منایا جاتا ہے۔ جو لوگ بارہ سال کا پہلا چکر مکمل کر چکے ہوں وہ یہ تہوار اور اپنا جنم دن زبردست جوش وخروش کے ساتھ مناتے ہیں۔رقص، موسیقی اور کھلا جنسی اختلاط اس جشن کی خصوصیات ہیں۔لوگ چھنگ پیتے ہیں، خاص کر جنم دن منانے والے لوگ رنگین کپڑوں میں ملبوس ہو کر پانی کی طرح چھنگ نوشی کرتے ہیں۔ ڈھول پیٹے جاتے ہیں۔لوگ شام ہونے تک ناچتے، گاتے اور چھنگ پیتے رہتے ہیں۔

۲۔ بونان (Bonana) یا چو پو شروپلا (Choppo Shrupla) بروکھپاوں کا دوسرا بڑا تہوار ہے۔ یہ فصل کٹائی کے موقعے پر منایا جاتا ہے۔لوسر کی طرح لوگ اس تہوار

کے موقعے پر بھی ناچتے اور گاتے ہیں۔

آرٹ:

بروکھپا رقص اور موسیقی کا خاص ذوق رکھتے ہیں۔ لیکن اُن میں ان فنون کے ماہر موجود نہیں ہیں۔ مختلف موقعوں پر ہر ایک شخص ڈول پیٹتا ہے، گاتا ہے اور رقص کرتا ہے۔ خاص کر کسی بچے کی پیدائش کی خوشی میں، شادیوں اور تہواروں کے موقعوں پر۔ یہاں ایسے ادارے نہیں ہیں جو ان لوگوں کو اس فن کی صحیح تربیت دیتے۔ بچے بڑوں کی نقل کر کے غیر رسمی طور ناچ گانا اور ڈول پیٹنا سیکھتے ہیں۔ اس سماج نے اپنی تواریخ کو طویل حمدیہ اور دعائیہ نظموں میں محفوظ کر لیا ہے۔ یہ نظمیں اور گیت سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اُن کے لوک ادب کا مرکزی نکتہ زمانۂ قدیم میں اُن کی گلگت سے لداخ تک نقلِ مکانی کی یاد ہے۔ بروکھپا کسی جدید آرٹ فارم کا علم نہیں رکھتے، وہ صرف مذہبی خیالات وعقاید کو پینٹنگ کے ذریعے پیش کرتے ہیں، اس کو تھنگہ Thangkas کہتے ہیں اور اُسے پسند کیا جاتا ہے۔

بیماریاں اور موت:

بروکھپاوں کا عقیدہ ہے کہ دیوتاوں کی ناراضگی کے نتیجے میں مصیبتیں، جن میں بیماریاں اور موت بھی شامل ہیں، آجاتی ہیں۔ وہاں کوئی ڈسپینسری یا ہسپتال نہیں ہے، صرف داDa میں ایک طبی امداد کا مرکز ہے۔ لوگ بیماریوں کا علاج تربیت یافتہ طبی افراد کے پاس جا کر نہیں کرواتے ہیں۔ ان کے بجائے بروکھپا ان اوہام، رسوم ورواج وغیرہ کی طرف رجوع کرتے ہیں جو لاما انجام دیتا ہے۔ لاما بیماریوں کے وجوہات کی نشاندہی کر کے علاج تجویز کرتا ہے۔ لاما کی مدد سے بڑے دیوتاؤں کی مہربانی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کچھ خیالی اور بالا فطری وجودوں کے ماڈل جن کو چوٹپا کہتے ہیں ستو سے بنائے جاتے ہیں۔ لاما اُن پر کچھ مذہبی Text پڑھ کر انہیں دور پھینک دیتا ہے۔

یقین کیا جاتا ہے کہ اس عمل سے شیطان اور بدروحیں بھاگ جاتی ہیں اور مریض کا مرض ختم ہو جاتا ہے۔ اسے صحت اور قوت واپس ملتی ہے۔

کسی کے مرجانے پر لاما کو فوراً بلایا جاتا ہے۔ وہ نعش کے قریب موم بتی جلا کر مذہبی نظمیں دہراتا ہے۔ مردے کو جلانے کے دن اور وقت کا تعین لاما ہی کرتا ہے۔ مرنے اور مردے کو جلانے کے درمیان اتنا زیادہ وقت نہیں رکھا جاتا ہے جتنا کہ لداخیوں میں رواج ہے۔ مردے کو سفید کپڑے میں لپیٹ کر، لکڑی کے فریم پر رسی سے باندھ دیا جاتا ہے۔ مردے کا بیٹا چلا چلا کر ماتم کرتا ہے اور اپنی ٹوپی سے کانوں کو ڈھانپ لیتا ہے۔ وہ مردے کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ بیٹے کی غیر موجودگی میں یہ کام مردے کی بیوی بھی کرتی ہے۔ لداخی بودھ مردے کو بٹھا کر رکھتے ہیں اور جلاتے ہیں اس کے برعکس بروکھپا مردوں کو لٹا کر جلایا کرتے ہیں۔ قبیلے کا کوئی فرد چِتا کو آگ لگاتا ہے۔ چار پانچ روز بعد مردے کی راکھ اور باقیات کو جمع کرکے پانی کے سپرد کرنے کے بجائے، جیسا کہ لداخیوں میں رواج ہے، وہ لوگ اُسے زمین میں دفن کرتے ہیں۔ شاید یہ رواج اُس زمانے کی باقیات میں سے ہے، جب بروکھپا مُردوں کو جلانے کے بجائے دفن کیا کرتے تھے۔ آج بھی اُن کے یہاں مختلف قبیلوں کے لئے اپنے اپنے قبرستان موجود ہیں۔

بچوں کی پیدائش اور پرورش:

بروکھپا فیملی پلاننگ کے تصور سے بھی نابلد ہیں۔ بچوں کی پیدائش کو پوری طرح بالا فطری طاقتوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ بے اولاد جوڑے حقیر سمجھے جاتے ہیں، لداخی سماج کے معتد بہ حصے میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ بچے کی پیدائش ہمیشہ رحمت تصوّر کی جاتی ہے۔ حاملہ عورتوں کے ساتھ کوئی خاص سلوک اور احتیاط نہیں برتی جاتی ہے۔ وہ معمول کا خوراک کھاتی ہیں اور معمول کا کام کرتی ہیں۔ حمل کے دوران اور بچہ جننے کے موقعے پر

اُنہیں کوئی طبی نگہداشت دستیاب نہیں رہتی ہے۔ حاملہ خواتین کے مسائل کا حل لاما کی دعاؤں اور اوہام پرستانہ رسوم و رواجوں کی ادائیگی کو سمجھا جاتا ہے۔ وضع حمل کے لئے کوئی خاص انتظامات نہیں کئے جاتے ہیں، نہ کسی تجربہ کار اور تربیت یافتہ کارکن کی مدد حاصل کی جاتی ہے۔ عورتیں گھروں میں بچے جنتی ہیں۔ وضعِ حمل کے بعد ایک ماہ تک عورت گھر سے باہر نہیں نکلتی ہے۔ نوزائد بچے کا باپ بھی گھر کے اندر ہی رہتا ہے اور باہر سے آنے والوں کی آؤ بھگت بھی نہیں ہوتی ہے۔

دودھ پلانے والی عورت شیر خوار کو ایک ٹوکری میں رکھ لیتی ہے، ٹوکری اپنی پُشت پر باندھ کر رکھتی ہے اور کھیتوں میں کام کرتی رہتی ہے۔ اُنہی ٹوکریوں میں مختلف چیزیں، میوے اور گھریلو کھاد وغیرہ رکھ کر اِدھر اُدھر لائی لے جائی جاتی ہیں۔ چند مہینوں کی عمر کے بچے کو ذرا بڑی عمر کے بچے کی تحویل میں دیا جاتا ہے۔ بچوں کو سرد موسم میں سارے لداخیوں کی طرح ایک تھیلے میں، جو اونی کپڑے یا چمڑے کا ہوتا ہے اور جس میں بیلٹ لگے ہوتے ہیں، ڈال دینے کا رواج ہے۔ تھیلے کا سائز اتنا ہوتا ہے کہ بچے کا جسم ناف تک اُسی کے اندر سمایا رہتا ہے۔ تھیلے میں بھیڑ بکریوں کی مینگنیوں کا سفوف بھر دیا جاتا ہے۔ ایک پتھر کو آگ میں بہت گرم کر کے تھیلے میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ اُس میں گرمی پیدا ہو سکے۔ پتھر کو باہر نکال کر بچے کو تھیلے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ مینگنیوں کا سفوف تری کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے، بچے کے کپڑے، بچہ اور تھیلا گندگی سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

چھے مہینوں تک بچوں کو صرف ماں کا دودھ پلایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ماں کے دودھ کے ساتھ ساتھ اُن کو چائے اور ستو بھی دیا جاتا ہے۔ پیشاب پاخانہ کرنے کی تربیت دو سے تین سال کے عرصے میں مکمل کرائی جاتی ہے۔ بچے نہایت چھوٹی عمر سے معاشی اور سماجی معاملات میں اپنا معمولی رول ادا کرنے لگتے ہیں۔ وہ بڑوں کے ساتھ کھیتوں اور باغوں میں جاتے ہیں اور تہواروں میں شریک رہتے ہیں۔ بچے شادی کی عمر کو پہنچنے سے

بہت پہلے جنسی تعلقات کے تجربے حاصل کرتے ہیں۔ چھنگ پارٹیوں پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جوان لڑکیوں کے لئے بھی چھنگ پارٹیوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ چھنگ پی کر نشے کی حالت میں رہنا اُن کے لئے عام بات ہے۔

بچے گھر کے بڑے مرد کے بغیر، جو گھر کا مُکھیا ہوتا ہے، کسی اور کو نہیں جانتے ہیں۔ گھر کے دوسرے افراد کی طرح بچے اس کے احکامات کی تعمیل کرتے رہتے ہیں۔ بچے اور نوجوان فرماں بردار ہوتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر مختلف نسلوں کے درمیان تضاد اور تفاوت کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

بچوں کو کسی بھی سطح پر مقابلہ آرائی نہیں سکھائی جاتی۔ زیادہ زور باہمی اشتراک، مدد، کام اور فرماں برداری پر دیا جاتا ہے۔ اُنہیں گروہوں میں رہ کر کھیلنا اور کام کرنا سکھایا جاتا ہے۔

رسمی تعلیم:

بروکھپاؤں کے ہر گاؤں میں مشکل سے دو یا تین آدمی ہیں، جنہوں نے آٹھویں یا دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی ہو۔ تاہم اب یہاں کچھ سکول ہیں، جہاں کچھ بچے تعلیم پانے کے لئے جاتے ہیں۔ مگر استاد نیم خواندہ اور سکول عمارات خستہ اور بنیادی ضروری سامان کے بغیر ہیں۔ کھیل کے میدان نہیں ہیں، غیر نصابی سرگرمیوں کا انتظام نہیں۔ سکول عمارات تاریک اور غلیظ ہیں اساتذہ کی تربیت کا بندوست نہیں ہے۔ سکولوں کی اچھی طرح نگرانی نہیں کی جاتی ہے۔ اساتذہ وقت کے پابند نہیں ہیں۔ کچھ اساتذہ اوقات کار کے دوران سکولوں سے باہر چھنگ پینے میں مصروف رہتے ہیں۔

تعلیمِ بالغان کے لئے یہاں کافی گنجائش ہے مگر اس کے لئے مراکز نہیں ہیں۔ ایک کارپیٹ ویونگ مرکز ہے، چند عورتیں اور لڑکیاں اس مرکز میں جاتی ہیں۔ ایسے مراکز میں رسمی تعلیم کا انتظام بھی ہونا چاہیئے۔

..................☆☆☆..................

انگریزی : پروفیسر فدا محمد حسنین
اردو ترجمہ : ولی محمد خوشباش

کشمیر......شناخت کے بعض مباحث

تاریخی اعتبار سے کشمیریوں کا تعلق تب سے یہودیوں کے ساتھ گردانا جاتا ہے جب سے مانو کے سب سے بڑے سیلاب کا واقعہ رونما ہوا۔ اِس واقعے کو طوفان نوحؑ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ عبرانی میں مانو نوحؑ کو کہا جاتا ہے جبکہ انگریزی میں اِسے نُو، نوچ یا نوح کہتے ہیں۔ عربی میں اِس لفظ کو نوح، سنسکرت میں مانو، چینی میں نوا، مصری میں نون اور کشمیری اور تبّتی زبانوں میں اِسے نوح کہا جاتا ہے۔ تاریخی حوالوں کے مطابق طوفانِ نوح کی آفت نے تقریباً چار ہزار قبل مسیح ساری زمین کو تباہ و برباد کر دیا۔ عبرانی اِلہامی کتابوں کے مطابق نوح، لیمیچ کا بیٹا تھا جو کہ حضرت آدمؑ کی دسویں نسل سے تھا۔ آدمؑ کی ذات تب چھ سو سال عمر کی تھی جب خداوندِ قدوس نے ظالم آدم ذات کو اپنے ظالمانہ اعمال کی پاداش میں تباہ و برباد کرنے کے لئے ایک زبردست طوفانی سیلاب نازِل کیا۔ چونکہ حضرت نوحؑ بذاتِ خود ایک خدا ترس آدمی تھا۔ اللہ نے اُسے اپنے آپ کو اور اپنے کنبے اور اپنی اُمّت کو اس طوفان سے بچنے کیلئے ایک کشتی بنانے کا حکم دیا۔

طوفانِ نوحؑ کے وقوع پذیر ہونے سے قبل چالیس دِنوں تک متواتر زبردست بارش ہوتی رہی اور یوں بارشوں اور سیلابی پانی نے ایک سو پچاس دِنوں تک ساری زمین کو ڈبو دیا۔ سفینۂ نوحؑ نے اپنے آپ کو صحیح وسلامت رکھنے کے لئے پہاڑوں کی طرف رُخ کیا اور اِن ہی پر لنگر انداز ہوا۔ اس طرح سے حضرتِ نوحؑ کے تین بیٹے Japheth, Shem & Ham یوریشاء اور افریقہ کی آبادی کے بانی کار بن گئے۔ قرآنِ شریف میں درج ہے کہ حضرت نوحؑ نے اللہ کی عطا کی ہوئی تدبیر کے مطابق ایک بڑی کشتی بنائی اور یہ کشتی طوفانی ہواؤں کے بیچ ایک پہاڑ پر آکر جا رُکی۔ اِس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں یعنی یہودیوں اور مسلمانوں میں اس زبردست طوفانی سیلاب کے واقع کے حوالے سے تحریر شدہ واقعات میں مماثلت پائی جائی ہے۔ ہندو بھی اِس زبردست طوفان کے بارے میں اگرچہ قدرے مختلف ہی سہی لیکن ایسی ہی دلیل پیش کرتے ہیں۔ مہابھارت پُران کے مطابق تین دُنیا موت کے گہرے سمندر میں جھونک دیئے گئے لیکن طوفانی ہواؤں کے بیچوں بیچ اللہ کی طرف سے ایک بڑی کشتی نمودار ہوئی جس میں روئے زمین کی تمام جڑی بوٹیاں، بیج، وحشی حیوانات کے جوڑے اور سات سادھو سوار تھے۔ تب وشنو ایک مچھلی کی شکل میں نمودار ہوا اور اُس نے اس کشتی کو صحیح وسلامت ایک مقام پر پہنچا دیا۔

ہندوؤں کے سب سے شیو پُران جس میں کشمیر کو اس زبردست سیلاب کے ساتھ جوڑنے کے دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ وہ کشمیر کی اپنی ساتویں صدی کی سنسکرت تاریخ کی کتاب نیل مت پُران ہے۔ اس کتاب میں ستی سر کے بارے میں گئی روایات درج ہیں۔ یہ روایات اصل میں اُس طوفان نوحؑ کی سرگزشت کے بارے میں لکھی گئی ہیں جس کی وجہ سے ملکِ کشمیر کی سرزمین پر پانی ہی پانی محیط تھا۔ نیل مت پُران کے مطابق یہ تو وِشنو دیوتا ہی تھا جس نے خود کو مچھلی کے روپ میں دھار لیا اور اُسی نے اُس کشتیوں کے کارواں کو جس میں زندگی کی سبھی ضروریات کے بیج لدھے ہوئے تھے، پہاڑوں کی

اونچائی تک پہنچنے میں رہنمائی کی۔ اِس کے بعد جب پانی کی سطح نیچے آ گئی تو مذکورہ کشتیوں میں سے چند ایک کشتیاں وادیٔ کشمیر کے مختلف کریوں پر آ کر رُک گئیں۔ ان کریوں میں سے جو پہلی عمودی چٹان اِس سیلابی پانی میں سے اُبھر کر سامنے آئی وہ شارکا تھی جس کو اب چکریشوری کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ چٹان سرینگر شہر کے کوہِ ماران پہاڑی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس چٹان پر ایک پُراسرار صوفیانہ آکار یا خاکہ کندہ ہے جِسے چکر یشوری یا نجم داؤ سے یاد کیا جاتا ہے جو کہ یہودیوں کا ایک قومی نشان مانا جاتا ہے۔ تب سے کشمیریوں کو جو کہ اصل میں پنڈت اور بعد ازآں مسلمان بن گئے تاریخی اور نسلی اعتبار سے یہودیوں کے ساتھ جُڑے ہوئے سمجھے جاتے ہیں۔ کیونکہ دیکھا جائے تو کشمیریوں کی شکل وصورت، اُن کا طرزِ زندگی، اُن کی ٹوپیاں، اُن کی پگڑیاں اُن کا طرزِ عمل اور اُن کا کردار، اُن کی جسمانی خوبصورتی اور داڑھی وغیرہ جیسے نشانات اِس حقیقت کے گواہ ہیں کہ وہ اِس قدیم قوم سے وابستہ ہیں۔ کشمیری پنڈتوں نے اپنی ذات کی تصویر گزشتہ چھ ہزار سال کے دوران محفوظ بنا رکھی ہے۔ جبکہ کشمیری مسلمان گزشتہ پندرہ سو سال کے دوران دیگر قبائل کے ساتھ گھل مل جانے کہ وجہ سے اِس صورتِ حال کو بحال رکھنے نہیں رکھ سکے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دورِ حاضر کے یہودیوں میں سے کشمیری پنڈتوں کو DNA نمونے حاصل کرنے کی مدد سے پہچان سکتے ہیں۔ لیکن یہاں کشمیری مسلمانوں کا معاملہ کچھ الگ سی نوعیت کا ہے۔ کیونکہ اُن کا GENE اپنے خاندان یا نسل سے باہر کے خاندانوں کے ساتھ شادیاں رچانے کی وجہ سے دُھندلا سا ہو گیا ہے۔ بہر حال، اِس کے باوجود ہم اِس بات سے متفق ہیں کہ اُن کے CHROMOSOME-y پر DNA نشانات ابھی بھی اس طرح واضح ہیں کہ اُن سے کشمیری پنڈتوں اور اسرائیلی یہودیوں سے اُن کی نسلی وابستگی نمایاں ہوتی ہے۔

برنیر (Bernier) مغل دورِ حکومت میں تحریر کردہ اپنے کشمیر کے سفرنامے میں

کشمیریوں کے یہودی نسل ہونے کے بارے میں یوں رقمطراز ہے:۔

''اِس ملک میں یہودیوں کے طور طریقے اپنانے والوں کے کئی نشانات پائے جاتے ہیں۔ پیر پنچال پہاڑیوں کو پار کرنے کے بعد جب ہم اِس مملکت میں داخل ہوئے یہاں کے سرحدی دیہات کے رہنے والوں کو دیکھ کر مجھے اِن کی یہودیوں کے ساتھ مماثلت نے حیران کر دیا۔ اُن کی شکل وصورت وضع وقطع اور ناقابلِ بیان خصوصیات جن کی بنیاد پر ایک سیاح مختلف ملکوں میں بود و باش کرنے والوں کے درمیان تمیز کرنے کے قابلِ بن سکتا ہے۔ وہ سب کچھ مجھے پرانے زمانے کے لوگوں کی وضع وقطع جیسا دِکھائی دیا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ آپ محض خیالی تصوّر نہ کریں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اِن دیہات کے یہودی شکل وصورت والے لوگوں کے بارے میں ہمارے والد اور مجھ سے پہلے کشمیر کی سیاحت کرنے والے کئی دوسرے یورپیوں نے بھی رائے زنی کی ہے۔''

محمد اقبال قریشی نے اپنی کتاب ''حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں'' میں لکھا ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال جس کو کہ برِصغیر کا بہت بڑا شاعر مانا جاتا ہے اِس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ کشمیری اصل میں بنی اسرائیل نسل سے ہیں۔'' وہ کہا کرتے تھے کہ اِن کی وضع وقطع اور شکل وصورت افغانوں سے ملتی جلتی ہے جو اصل میں بنی اسرائیل یا اسرائیل کے فرزند ہیں۔ ڈاکٹر اقبالؔ اس بات سے اس قدر مطمئن تھے کہ ایک بار اُنھیں لارڈ ریڈنگ جو کہ وائسرائے ہند تھے کو اس بارے میں ایک میمورنڈم پیش کرنے کا خیال آیا جس میں وہ اُنھیں یہ بتانا چاہتے تھے کہ جیسے آپ بنی اسرائیل قوم سے ہیں ویسے ہی کشمیری بھی ہیں۔ اِس لئے اُنھیں دوہری غلامی سے نجات دِلایئے۔ اس طرح آپ بھی خدا ترس نجات دہندہ کہلائے جائیں گے۔

پنڈت ہر گوپال کول اپنی مشہور تصنیف گلدستہ کشمیر'' میں رقم طراز ہیں کہ مسلمان ''کشمیر'' کو دھرتی پر جنت کے مترادف مانتے ہیں اور اسی لیۓ اسے باغِ سلیمان کے نام

سے بھی یاد کرتے ہیں اُن کے مطابق حضرتِ سلیمانؑ اور حضرتِ موسیٰؑ اس ملک میں تشریف فرما ہوئے اور آخر پر یہیں داعیٔ اَجل کو لبیک کہہ گئے۔

یہودی۔ لفظ یہودی کو جوڑا یا جودا اِزم (یعنی یہودیوں کے طور طریقے اپنانے والے) ماننے والے سے لیا گیا ہے۔ اس لفظ کو مختلف زبانوں میں الگ الگ تلفّظ سے پڑھا جاتا ہے اور بولا بھی جاتا ہے۔

یہ ایک اتفاق بھی ہوسکتا ہے کہ گزشتہ زمانے میں کشمیر میں ہر کسی نام کے ساتھ آخر پر لفظ "جُو" جوڑا جاتا تھا اور یہ عمل دونوں کشمیری پنڈتوں کے ساتھ ساتھ کشمیری مسلمانوں میں بھی عام تھا۔ اصل میں یہ لفظ پرانی نسل کے لوگوں کی اصلیت ظاہر کرنے کیلئے احتراماً اُن کے ناموں کے ساتھ جوڑا جاتا تھا۔

اسرائیلی فرزندان۔ مغرب میں اسرائیلیوں یا اُن کے بچوں کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔ حضرتِ یعقوبؑ کو اپنی بیویوں سے بارہ بیٹے تھے اور وہی بعد از آں اسرائیل کے بارہ قبیلے کہلائے۔ یہ قبیلے مقدّس زمین کے حصول کے لئے آپس میں لڑ پڑے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ Joshua نے اُن کو دو جماعتوں میں تقسیم کردیا اور اُنھیں منقسم فلسطین میں بسایا۔ آخری جب Saul نے اُن کو ایک ساتھ ملایا تو حضرتِ سلیمانؑ نے اُن کو خود مختاری سے سرفراز کیا۔ لیکن اُن کی اندرونی رسہ کشی سے وہ دوبارہ الگ الگ ہوگئے۔ اس طرح سے اُنھوں نے دو قبیلوں کو کھودیا جبکہ باقی ماندہ دس قبیلے مختلف بادشاہوں کے غلام بن گئے۔ نتیجے کے طور پر وہ مختلف علاقوں میں بکھر گئے۔ اُن میں سے کچھ دیگر قوموں کے ساتھ گھل مل گئے اور یوں اُنھوں نے اپنی شناخت ہی کھودی۔ اِن میں سے چند بچے کھچے لوگ ہی ایسے تھے جو کہ فلسطین میں رہ گئے۔ اِس طرح سے دیگر دس قبیلوں کی تقدیر ایک سربستہ راز بن گئی۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں اسرائیلیوں کو ایذا رسانی کے سبب مصر اور Babylon

کی طرف بھاگنا پڑا۔ بعد از آں اُن میں سے اکثر گرفتار کیے گئے اور قیدی بنائے گئے۔ یہودیوں کی ایذا رسانی کا یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ اُنھیں یا تو مار دیا گیا یا پھر قیدی بنایا گیا یا پھر اُنھیں بھاگنا پڑا۔ ہند یونانی بادشاہوں کے دورِ حکومت میں اکثر یہودی جو کہ مختلف فنون میں ماہر کاریگر تھے، افغانستان Bactria، گلگت اور چترال کے پہاڑی علاقوں کی طرف نقلِ مکانی کر گئے جس کی وجہ سے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں میں اس طرح کھو گئے جیسے اُن کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ وہ جن علاقوں میں آباد ہوئے وہاں تک پہنچنے کے لئے اُنہوں نے لمبی لمبی مسافتیں طے کیں۔ اِس ضمن میں پکی شہادتیں یہ بھی ہیں کہ یہ لوگ کشمیر کے مختلف مقامات تک بھی پہنچ گئے اور اکثر ہزارا میں آباد ہوئے۔ اس بارے میں بھی ایسے مستند شواہد موجود ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ یہودی قبیلے ہزارا میں آباد ہوئے اور وہاں کے کاروباری حلقوں اور دیگر صنعتوں کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ ہزارا کشمیر کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ وسطِ ایشیاء کے ممالک میں یہودیوں کی موجودگی کے بارے میں کئی مصنفوں کی یہ مستند رائے ہے کہ وہ شاہراہِ ابریشم کے آس پاس مغرب، ایران، افغانستان اور کاشغر کے ممالک میں بکھرتے گئے اور یہاں سے ہوتے ہوئے وہ وادیٔ کشمیر پہنچ گئے اور یوں وہیں پر آباد ہو گئے۔ اُنھوں نے کچھ مدت تک یہودی طرزِ زندگی کی رِوایات کو جاری رکھا لیکن بعد از آں وہ پہلے بودھ مت اور اُس کے بعد شیومت اور آخر میں اِسلام کو اپنا مذہب اختیار کر گئے۔

ایران میں یہودی۔ تقریباً ۵۳۹ قبل مسیح میں Babylonians کی شکست Cyrus اعظم کے ہاتھوں ہوئی۔ یہودیوں نے اس شکست کو قبول کیا کیونکہ اُنھیں Babylonians کے ہاتھوں زبردست تکالیف اُٹھانی پڑی تھیں جنہوں نے یروشلم میں مندر کو جلا ڈالا۔ اُس زمانے میں اُن میں سے اکثر لوگوں کو غلام بنا کر Babylon لایا گیا تھا اور وہاں اُنھیں زرعی سرگرمیوں کو انجام دینے کے لئے بندھوا مزدوری پر مامور کیا گیا

تھا۔ سائیرس اعظم نے اُنھیں نہ صرف غلامی سے آزادی دلائی بلکہ اُنھیں فلسطین میں دوبارہ بسنے کی بھی اجازت دی۔ اُس نے انہیں اپنی مملکت قائم کرنے اور یروشلم میں مندر دوبارہ تعمیر کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ آزادی اور بلند مرتبہ پانے کے بعد اُن میں سے اکثر ایران میں آباد ہوئے اور وہاں پر صاحبِ ثروت تجارت پیشہ لوگوں کی حیثیت سے آباد ہوئے۔ اِس کے بعد اُنھوں نے مشرق کی جانب رُخ کرنا شروع کیا اور وہاں سے قریب قریب وسطِ ایشیاء تک چلے گئے۔ لیکن اِس کے باوجود اُن کی نظر میں یروشلم پر لگی رہیں کیونکہ وہ اس کو اپنا روحانی مرکز مانتے تھے جہاں پرمنا ہم نے جو دیا کو ایک ریاست کی طرح قائم کیا تھا۔ کیونکہ وہ خود کو بہت ہی طاقتور مانتا تھا جبکہ اس کے باوجود ایرانیوں نے اُسے قریب ۴۸۵ قبل مسیح میں تخت سے اُتار دیا۔ یہاں پر یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ یہودیوں نے سائرس اعظم کو اپنا نجات دہندہ مان لیا ہے اور اُن کا تذکرہ اپنی تحریروں میں ایک دیوتا کے طور پر کیا ہے۔ بہرحال، اِس کے باوجود یہودی ایران کے Zorostrains پر اثر انداز نہیں ہوئے بلکہ وہ اس کے برعکس غیر ملکی عقیدت مندوں سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اِس طرح سے یہاں ایک ملا جلا مذہبی اور اخلاقی ضابطۂ حیات معرضِ وجود میں آیا جو جوڈا اور Zoroastrian خیال کا ایک مِلا جلا خوش حال ردِ عمل تھا، اسی زمانے میں ایرانی آرٹ اور طرزِ تعمیر فلسطین میں داخل ہوا اور یہودی اور پادری طبقہ Ezra کی تعلیم و تربیت سے متاثر ہو کر اُن میں توہم پرستی کا عنصر پیدا کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس طبقے نے نئے زمانے اور بیرونی خیالات و احساسات کو پنپنے پر قدغن لگا دی یہاں تک کہ اُنہیں ایرانی عورتوں کو چھوڑنے پر بھی مجبور کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے فلسطین کے یہودی دیگر علاقوں کے یہودیوں سے الگ ہو گئے۔

افغانستان میں یہودی:

بیکٹریان (Bactrian) اور Scythian وہ پہلے دو قبیلے تھے جو اُس علاقے میں

آباد ہوئے جس کو آج افغانستان کہا جاتا ہے۔ اس ملک کے لوگوں کو پٹھان، پستون یا پختون کہا جاتا ہے اور اِن کا وجود پُر اسرار اسطوری رِوایات میں گم گشتہ ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ افغانستان ایک بہت ہی اہم ملک تھا جہاں زمانۂ قدیم سے شاہراہ ابریشم چین کو روم سے ہوتے ہوئے ایران کشمیر اور وسطِ ایشیا کو ملاتی تھی۔ اصل میں لفظ افغان آرمینی لفظ اگوان سے نِکلا ہے جس کے معنی ہیں پہاڑوں کو سر کرنے والے۔ یہ حقیقت افغانوں اور آرمینیا کے قابض مِصری لوگوں کے ایک باہمی تاریخی رِشتے کا پتہ دیتی ہے۔

افغانستان کے قبائل میں ہمیں ایسے قبیلوں کے ناموں کا پتہ چلتا ہے جن کے روابط ایرانیوں کے ساتھ زمانۂ ماقبل تاریخ سے ہونے کا پتہ چلتا ہے لیکن جب اسکندرِ اعظم کے حملے کے دوران یونانی افغانستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہوئے تو اُنھوں نے خطّے میں اپنی سلطنت بھی قائم کی۔ اس زمانے میں تقریباً ستھر اسرائیلی پادری افغانستان کے کچھ اہم علاقوں میں آباد ہوئے۔ یہ حقیقت اِس بات سے بھی زیادہ واضح ہوتی ہے کہ یہودی پیغمبروں میں سے چند ایک یہاں بالک میں دفن ہیں۔ نامور سیاح ابنِ بطوطہ نے وہاں پر Ezekiel کے مقبرے کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ یہودیوں کا دوسرا پیغمبر Samuel اُس سڑک کے کنارے پر دفن ہے جو کہ خراساں سے ہمدان کو جاتی ہے۔ جبکہ ایک اور یہودی پیغمبر افغانستان میں باجور کے نزدیک رنگ برنگ مقام پر دفن بتایا جاتا ہے۔

یہ بات دِلچسپی سے خالی نہیں کہ افغانی آج بھی اپنے ساتھ اپنے قبیلے کا نام جوڑتے ہیں اور اُنہیں اپنے قبیلے کی پہچان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اِن میں سے سب سے زیادہ مشہور قبیلے اموئی زائی، امازائی، داؤد زائی، ابراہیم زائی، شیمون زائی، یوسف زائی، ایوب خیل، یحیٰ خیل، یعقوب خیل، یونس خیل اور زکریا خیل ہیں۔ پشتو زبان میں زائی بیٹے یا مناسبت کو کہا جاتا ہے۔ اس طرح اس سے اُن کی مناسبت یہودی

پیغمبروں کے ساتھ بھی ہو جاتی ہے۔ اِن سبھی قبیلوں کو اپنے آباؤ اجداد کا شجرہ نسب اپنے ساتھ تحریر کیا ہوا ہے اِن کا یہ شجرۂ نسب حضرتِ یعقوبؑ تک ملتا ہے۔ افغان اپنے آپ کو بنی اسرائیل یا اسرائیل کی آل مانتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُنھوں نے Nebuchadnezzar دورِ حکومت میں گھور اور بامیان ہجرت کی ہے اور ۶۳۳ء میں وہ خالد بن ولید کی کوششوں کی بدولت مشرف بہ اسلام ہوئے۔ کچھ افغانی اپنا شجرۂ نسب کُش کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں جو کہ حضرت نوحؑ کا پوتا تھا اور موسوی قانون کو اپنا سماجی نصب العین مانتے ہیں۔

ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ آریاؤں کی طرح یہودی بھی اصل میں ہندوستان سے ہیں اور ہندوستان میں آباد ہونے کے بعد اِن لوگوں نے مغرب کی طرف نقلِ وطن کیا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہودی قوم کی غیر معمولی موجودگی کی وجہ سے ہی ہندوؤں میں ذات پات کے نظام کی بنیاد پڑی ہے جہاں برہمن لوگ کبھی بھی دیگر لوگوں کے ساتھ گھل مل جانا پسند نہیں کرتے اور نہ ہی کسی اور کو اپنی ذات میں شامل ہونے کی اِجازت دیتے ہیں۔ بہر حال، اس بات سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ زمانہ قدیم میں شمال مغربی بھارت اور مشرقی وسطیٰ کے درمیان آوا جاہی رہی ہے۔ یہاں تک کہ آج بھی ایسے کئی یہودی معاہدے بھارت کے مغربی ساحل کے حوالے سے بمبئی کوچین، کیرالہ، تامل ناڈو منی پور، میزورم، اُترپردیش اور آندھرا پردیش میں موجود ہیں۔ کیرالہ میں تو یہودی دو حصوں میں منقسم ہیں۔ ایک حصے کو سفید یہودیوں جبکہ دوسرے حصے کو کالے یہودیوں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دونوں جماعتیں آپس میں کوئی میل وجول نہیں رکھتی یہاں تک کہ دونوں جماعتیں آپس میں ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور دونوں خود کو جوڑا اِلزم کے اصلی ماننے والوں میں سبقت لینے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ یہ لوگ کیرالہ میں دو ہزار سال قبل آئے ہیں اور بادشاہ وقت نے اُن کے حق میں اُس زمانے میں

جاگیریں عطا کیں۔ اُن کے ایک سردار جوزف ربان کو Srinadan Moplah کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔

حالیہ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ برما، ناگالینڈ اور کشمیر میں بنی اسرائیل قوم کی موجودگی کے آثار موجود ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں حضرت میر عالم بادشاہ جو کہ گنٹی باغ گاندربل میں رہ رہے پشتون قبیلے کا سردار ہے، نے واشگاف کیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُس کا کہنا ہے کہ اُنہوں نے افغانستان سے ہجرت کی ہے جہاں پر کہ بنی اسرائیل قوم کے دیگر قبائیل آباد ہیں۔ جو ایک زمانے میں حضرت موسیٰؑ کے ماننے والے تھے اور بعد از آں اُنھوں نے اِسلام قبول کیا۔ اِس سے پہلے بھی وہ ایک ملاقات کے دوران ہم سے یوں مخاطب ہوئے:

"ہم میں سے اکثر لوگ سوات سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم حضرتِ یعقوبؑ کی نسل سے ہیں۔ اس وجہ سے ہمیں بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ ہم حضرتِ یعقوبؑ کے نسل سے ہیں جس کا والد اسحاقؑ تھا اور جس کا باپ ابراہیمؑ تھا۔ اس طرح سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ہم بنی اسرائیل قوم سے ہیں نہ کہ خراب نسل سے۔ یعقوب کے بارہ بیٹے تھے اور اُن ہی کی بدولت بارہ قبیلے معرضِ وجود میں آئے جو بعد میں مختلف قوموں میں پھیل چکے ہیں۔ ہم تو پہلے بودھ تھے اور اُس سے پہلے بنی اسرائیل تھے۔ ہم وہ یہودی ہیں جنہوں نے موسیٰؑ کو من سلویٰ نام کا جنتی کھانا لینے سے انکار کیا تھا۔ اس لئے ہم نے موسیٰؑ کو چھوڑ دیا اور خانہ بدشوں کی طرح مشرق کی طرف چل پڑے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہودیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگنا پڑا۔ ترک بھی ہمارے بھائی ہیں اس لئے کہ وہ بھی وہی اسرائیلی ہیں جنہوں نے موسیٰؑ کو ماننے سے اِنکار کیا۔ میں نے پہلے بھی وضاحت کی کہ کئی صدیاں پہلے ہم گلگت اور چترال سے ہوتے ہوئے کشمیر آئے۔"

ہم جانتے ہیں کہ ایک مسلمان قبیلہ جو "بودو" کہلاتا ہے یوسمرگ کشمیر میں موجود ہے اور وہ قبیلہ خود کو بنی اسرائیل کے ساتھ منسوب کرتا ہے۔ ہمیں یہ بھی پتہ چلا ہے کہ کئی سالوں کی کوششوں کے بعد ایک کشمیری گاؤں کے باشندے جو کہ خود کو اسرائیلی کہتے تھے قانون کی رُو سے اسرائیل ہجرت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بہر حال اُن کے اسرائیل پہنچنے کے فوراً بعد اُنھیں عام لوگوں کے بارے میں غیر واقف رکھا گیا۔"

ہمیں بتایا گیا کہ پہلے جو دو قبیلے ملک بدر کئے گئے اور افغانستان بھیجے گئے وہ GAD اور REUBEN تھے۔ یہ واقعہ تب ہوا جب ۳۸۸ قبل مسیح میں ASHURNAZIRPA آسٹریا پر حکومت کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ نقلِ مکانی کا واقعہ آٹھویں صدی قبل مسیح کی آخری دہائی میں پیش آیا ہوگا۔ اوپر ذکر کئے گئے دو قبیلوں میں سے RABBINATES ہزارا اور کشمیر تک چلے گئے جبکہ "GADDITES" قبیلہ مستقل طور افغانستان میں سکونت پذیر رہا۔ GADDITES کی نسل کو دورِ حاضر میں GADDI-RANI کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دیگر شواہد کے مطابق یہودیوں کا افغانستان ملک بدر ہونا ۵۳۹ قبل مسیح تک ایک منظم طریقے پر جاری رہا۔ یہ وقت NEBUCHADNEZZAR کے دورِ حکومت کا زمانہ تھا۔ یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ NEBUCHADNEZZAR کو کشمیر میں باکھن سور کے نام سے جانا جاتا ہے اور اِس نام کے ساتھ یہاں کئی کہانیاں منسوب ہیں۔ کشمیریوں میں اُس آدمی کو طنزاً باکھن سور کہا جاتا ہے جو بدمعاش اور چھیل چھبیلا ہو۔

وہ اسرائیلی قبیلے جن پر مقدمے چلائے گئے تھے وہ خود پہاڑی علاقوں اور وادی کشمیر۔ ہزارا، گلگت اور چترال میں بسنے لگے۔ اِن میں سے اکثر لوگوں نے وقت وقت پر اپنا مذہب تبدیل کیا اور آخر میں بدھ مت، شومت اور اسلام کے پیروکار بن گئے۔ کئی محققوں کی رائے ہے کہ اُن کے چہرے چال وچلن اور وضع قطع سے پتہ چلتا ہے کہ وہ قدیم اسرائیلی قوم کے لوگ ہیں۔ عیسائی مشنریوں کا ماننا ہے کہ کشمیری بنی اسرائیل نسل کے لوگ

ہیں۔ اِس پسِ منظر میں دوسری خاص بات یہ ہے کہ یہاں یہودی ادب یادوں کی موجودگی کے بارے میں بھی شہادت پائی گئی ہے۔ اُنیسویں صدی میں وادیٔ کشمیر میں بندوبستِ آراضی کا کام انجام دینے والے دوسرے قلمکار کا بیان ہے کہ کشمیریوں کی اکثریت سامی قوم سے تعلق رکھتی ہے یہاں کی عورتیں چہرے کی بناوٹ کے اعتبار سے یہودی عورتوں جیسی لگتی ہیں۔ اِن حقائق کے پسِ منظر میں ایسا لگتا ہے کہ کشمیری اصل میں اسرائیل کے گم گشتہ قبیلے کی آخری نسل کے لوگوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہیں۔

کشمیر کو زمانۂ قدیم سے دھرتی پر جنّت مانا جاتا ہے یہاں تک کہ یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ ایسے بے شمار مریض جو کہ بخار اور دردِ معدہ میں مبتلا تھے، یہاں کے چشموں کا پانی پینے سے شفایاب ہوئے ہیں۔ اللہ نے اس سرزمین کو بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں اور اس وجہ سے کشمیر کو سرزمینِ جنت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مغرب کی مذہبی کتابوں میں اس سرزمین کو سعادت مندی کی سرزمین کا نام دیا گیا ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی صفت ہے کہ کئی پیغمبروں اور اولیائے کرام نے جیتے جی یہاں کا دورہ کیا ہے۔ کشمیری اپنے وطن کو کشیر کہتے ہیں۔ لفظ کشیر کا مطلب ہے کشمیری لوگوں کے رہنے کی سرزمین اور کوشر کا مطلب ہے حلال گوشت کھانے والے لوگ۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اُن کے سارے تیرتھ استھان وادی میں موجود ہیں۔ کشمیری کو باغِ سلیمان کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے جس کو حضرتِ سلیمان نے کئی سال قبل مسیح میں آباد کیا۔

صوفی اپنی کتاب ''کشیر'' میں رقم طراز ہے کہ کشمیر کو یہ خطاب حضرتِ میر سید علی ہمدانیؒ نے دیا ہے اور یوں کشمیر میں اسرائیلوں کی بود و باش کی تصدیق ہوتی ہے۔

اسکندر اعظم کے حملے سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے یہودی قبیلوں کی دوسری جماعت ہمالیہ کی وادیوں میں پھیل گئی وہ افغانستان سے ہوتے ہوئے کشمیر اور تبت تک پہنچ گئے۔ اِن لوگوں نے اپنے ساتھ اپنے مذاہب کے تبرکات بھی ساتھ لائے۔ توراۃ کا ایک

قدیم نسخہ جو کہ چمڑے پر لکھا گیا تھا اور جس کی لمبائی ۴۸ فٹ تھی کشمیر میں پایا گیا ہے۔ کیڑد پادری اپنی "مغلیہ سلطنت کی تاریخ" نام کی کتاب میں رقم طراز ہے کہ کشمیری اسرائیلی قوم کی نسل سے ہیں۔

جارج مور نے ۱۸۶۱ء میں The Lost Tribes نام کی کتاب میں لکھا ہے کہ عیسائی مشنریوں نے کشمیریوں کی ابتدائی نسل کے بارے میں جو تحقیق کی ہے اُس کے مطابق اسرائیل کے گم گشتہ قبائل نے تبّت اور کشمیر کے راستے ہندوستان نقلِ مکانی کی ہے۔ ڈاکٹر کیتھ کی رائے ہے کہ کشمیر کے باشندے لمبے قد کے، قوی اور جسیم جسمانی ساخت کے لوگ ہیں۔ یہاں کی عورتوں کی خوبصورتی اور وضع قطع یہودی عورتوں کے ساتھ ملتی جلتی ہے۔ جارج فوسٹر بنگال سے انگلستان تک کے سفر کے بارے میں اپنے خطوط میں رقم طراز ہے:۔

اپنے ہی وطن میں کشمیریوں کو پہلی نظر میں دیکھنے پر میں نے اُن کے لباس اُن کے وضع قطع اور داڑھی کی شکل کو دیکھ کر اندزہ لگایا کہ میں یہودیوں کے ملک میں آ گیا ہوں۔"

مرحوم عبدالاحد آزاد نے جو کہ کشمیری زبان و ادب کے نامور شاعر اور محقق گزرے ہیں اپنی کتاب "کشمیری زبان اور شاعری" میں لکھا ہے کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہودی مصر سے کشمیر آج سے دو ہزار سال قبل ملکِ شام سے آئے ہیں اور اُن ہی لوگوں نے یہاں کی سرزمین کو "کشیر" نام دیا ہے جس کے معنی ہیں شام جیسا۔

کش قبیلہ:

کش یا کس سام کا بیٹا اور نوحؑ کا پوتا تھا۔ وہ کش یا کش قبیلے کا بانی تھا جو کہ مشرق میں آباد تھا۔ اس قبیلے نے بغداد کے نزدیک ایک گاؤں کی بنیاد ڈالی۔ اس قبیلے نے دریاؤں پہاڑوں، شہروں اور ملکوں کا نام اپنے قبیلے کے بزرگوں کے نام پر کُش یا کش رکھے۔ مسوپوٹامیا میں اس قبیلے نے ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ایران میں ہشار پور کے

نزدیک ایک گاؤں کی بنیاد بھی ان ہی لوگوں نے ڈالی۔ اس قبیلے نے بعدازآں وسطِ ایشیا کی طرف رُخ کیا اور وہاں کئی بستیاں آباد کیں۔ وسطِ ایشیا میں موجود مرد ''نام کا ایک گاؤں کاش موہرا، بخارا میں کاش بند نام کا گاؤں اور سمرقند کا شامیا نام کا گاؤں اِن ہی لوگوں نے آباد کیا۔ اِن لوگوں نے افغانستان کا رُخ کر کے وہاں کاشکار کاش ہل، کاشک اور کشیو نام کی بستیاں بسائیں۔ اس کے علاوہ ہندوکش کے پہاڑ بھی اِن ہی کے ناموں سے منسوب ہیں۔ ان لوگوں نے جنوب کے پہاڑی سلسلوں میں بھی ایک نئی بستی آباد کی جس کا نام کاش مور ہے۔

بھارت میں مغلیہ سلطنت کے بانی کار بابر نے شہرہ آفاق کتاب ''تزکِ بابری'' میں لکھا ہے کہ لفظ کشمیر کا بنیادی ماخذ کاش یا کش قبیلہ ہے جنہوں نے وادی کو بسایا ہے۔ یہ قبیلہ اُس خطے میں آباد ہوا جس کو آج کشمیر کے ضلع ڈوڈہ کشتوار کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ پنچال......کو پار کرتے ہوئے وادیٔ کشمیر میں پھیل گئے۔ پلوامہ ضلع کا کشوار۔ اننت ناگ کا چشمہ کاش ناگ اسی قبیلے کے ناموں سے منسوب ہیں۔ وادی میں ان قبیلوں کی رہنمائی کشپا نے کی ہے۔ ایک پرانی روایت ہے کہ کشمیر نام کا لفظ اِن ہی کے نام سے ماخوذ ہے۔ بہر حال اس حقیقت سے کسی کو اِنکار نہیں ہو سکتا کہ کُش یا کوش قبیلے نے وادی میں آزادی سے اپنی مملکت کی بنیاد ڈالی۔ تاریخ میں اس قبیلے سے جڑے کچھ بادشاہوں جیسے اُتپیل کش اور ہرنیا کش راجاؤں کا بھی تذکرہ ہے۔ ہرنیا کش کو ''کتھا سرت ساگر'' جو کہ کشمیر کی قدیم سنسکرت زبان کا ایک اہم ادبی کارنامہ ہے میں پریوں کی ایک کہانی کا ہیرو تسلیم کیا گیا ہے۔ تاریخ میں یہ بھی درج ہے کہ لنکا کشا اُس کا باپ تھا اور وہ کشمیر کا ایک راجا ہو گزرا ہے۔ اس کے علاوہ نہ صرف کُش یا کش نام کا قبیلہ وادی میں آباد ہوا بلکہ تاریخی شہادتوں کے مطابق دیگر اِسرائیلی قبیلے بھی وادی کشمیر میں پھیل گئے۔ وہ قبیلے جن کا ذکر Old Testament بائبل میں کیا گیا ہے اور وہ قبیلے جنہوں نے کشمیر میں اپنے ساتھ

اپنے ناموں کو بھی جوڑے رکھا۔ اُن کا ذکر بھی دیگر کتابوں میں ملتا ہے۔

یہودیوں کا طرۂ امتیاز:

کئی دانشوروں کا کہنا ہے کہ کشمیری اپنے مُردوں کی قبریں یہودی قبروں کے طرز پر تیار کرتے ہیں۔ اس طرح کی قبروں کو موسائی قبریں کہا جاتا ہے اور یہ مشرق سے مغرب کی طرف بنائی جاتی ہے۔ کشمیر کے گجر مسلمان اپنے آپ کو بنی اسرائیل مانتے ہیں۔ اُن کا لباس اور بالوں کا طرز یہودی طرز سے ملتا ہے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ کشمیری کشتی بانجیوں کا چپّو دِل کی شکل کے طرز کا ہوتا ہے اور ایسے چپو آج بھی یہاں رائج ہیں۔ ایسے چپو فلسطین اور کشمیر کے سِوا دُنیا بھر میں کہیں بھی رائج نہیں ہیں۔

کشمیر کا پرانا طرزِ تعمیر بھی اس بات کا گواہ ہے کیونکہ اِس طرزِ تعمیر میں بنائی جانے والی سیڑھیاں ہمیشہ مغرب کی جانب ہوتی ہیں اور اِس طرز کی سیڑھیاں نہ تو پرانے ہندو مسلمان یا بودھ طرزِ تعمیر میں پائی جاتی ہیں۔

عیش مقام میں حضرت زین الدین ریشیؒ کی زیارت گاہ میں ایک ایسا ڈنڈا موجود ہے جس کو حضرتِ موسیٰؑ کا عصائے شریف کہا جاتا ہے۔

مورّخوں کا کہنا ہے کہ جن حالات میں موسیٰؑ کا انتقال ہوا وہ ایک سربستہ راز ہے۔ اس حوالے سے بائبل میں بھی کوئی تذکرہ نہیں ہے، ماسوائے اِس بات کے کہ اُنھیں بیتھ پور جو کہ مشرق میں ایک دُور دراز علاقے میں واقع ہے کہ نزدیک مآب کی زمین میں دفن کیا گیا۔ اسی پسِ منظر میں ایک اور خاص بات یہ کہی گئی ہے کہ جب موسیٰؑ ایک سو بیس برس کا تھا تب خداوندِ قدوس نے اُنھیں مآب کی سرزمین میں بتیو کی پہاڑی پر جانے کا حکم دیا اور وہیں دارِ فانی سے کوچ کرنے کا حکم بھی سنایا جہاں پر کہ اُس کا بھائی ہارون مدفون ہے۔

راجوری کدل، سرینگر کشمیر میں ایک بزرگ صوفی سید حسین بلادرویؒ کا مقبرہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بزرگ تقریباً ۱۴۷۷ء میں وارد کشمیر ہوئے اور ۱۴۸۲ء میں اس دارِ فانی

سے کوچ کر گئے۔ اس مقبرے میں دو متبرک تبرکات محفوظ ہیں جن میں سے ایک تبرک پیغمبر اسلام حضرتِ محمدؐ کے پائے مبارک کے نشانات سے منسوب ہے۔ ان تبرّکات کو ایک دھات کے صندوق میں رکھا گیا ہے۔ مشہور محقق ایم۔اے پنڈت کا کہنا ہے کہ یہ پائے مبارک کے نشانات اُن مبارک پاؤں کے نشانات سے ملتا ہے جنہیں روضہ بل خانیار سرینگر کشمیر میں Yuzu-Asaph کی زیارت گاہ میں رکھا گیا ہے۔ اُن کے مطابق دوسرا تبرّک ایک کالے رنگ کی ٹوپی ہے جسے حضرت علیؓ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مذکورہ جگہ پر جس صوفی بزرگ کو دفن کیا گیا ہے اُن کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہاں بلادِ روم یا ملکِ روم سے یہاں تشریف لائے تھے۔ اس مقبرے کے عقب میں ایک قبر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک یہودی پیغمبر کی قبر ہے۔ اور اس پر کنندہ کی گئی عبارت اس طرح ہے۔

سرینگر شہر کے نزدیک شالیمار باغ سے تقریباً دو کلومیٹر دور ایک چھوٹا سا گاؤں واقع ہے۔ کلہن کی راج ترنگنی میں اس جگہ کا نام شار داہڑ وانا یا چھ صوفی بزرگوں کا جنگل لکھا گیا ہے۔ یہ چھ صوفی بزرگ کون تھے؟ اِن صوفی سنتوں کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ بہر حال، مقامی روایت کے مطابق اِن چھ صوفی سنتوں میں ایک بزرگ کو ہارون کہا جاتا ہے۔ یہ حضرت موسیٰؑ کا بھائی تھا اسی مناسبت سے اِس گاؤں کو ہارون یا ہاروان کہا جاتا ہے۔ اِتفاق سے یہ ایک تعجب کی بات کہ آرون کو مسلمان ہارون کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

فلسطین میں ہار پہاڑ کو آرون پہاڑ کے نام سے دریافت کیا گیا ہے جس پر آرون کی قبر موجود ہے۔ یہ نہایت ہی شوق آفریں بات ہے کہ کشمیر میں ہارون مقام پر اِن کا مقبرہ ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ایک ہی آدمی کا مقبرہ دو جگہوں پر ہو؟ یہودیوں کی قابلِ احترام تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اپنوں سے اور گھر سے بہت دور داعیٔ اَجل کو لبیک کہہ گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہودیوں میں ایک

رسم یہ ہے کہ وہ مرے ہوئے اِنسان کی ہڈیوں کو جمع کر کے ایک اُستخوان دان میں رکھ دیتے تھے۔ یہ مہر بند اُستخوان دان یہودی قبیلہ اس سفر کے دوران اپنے ساتھ لے کے گئے۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آرون کی ہڈیاں اُس کے قبیلے کے لوگ جلا وطنی کے ایام کے دوران اپنے ساتھ لے آئے اور اُنھیں کشمیر میں دفنا دیا۔

اس تاریخی مقام پر کئی ڈھانچے موجود ہیں جن میں کنکروں سے بنائی گئی دیواریں ہیں اور ٹائیلوں سے بنائے گئے فٹ پاتھ موجود ہیں۔ دیواریں مکمل طور پر کیچڑ سے تعمیر کی گئی ہیں۔ لیکن چھوٹے چھوٹے کنکر اس قدر ہوشیاری کے ساتھ جوڑ دیئے گئے ہیں کہ دو ہزار سال گزرنے کے باوجود یہ سبھی دیواریں دیکھنے میں حد سے زیادہ صاف وشفاف اور خوبصورت دِکھائی دیتی ہیں۔ یہ ایک مخصوص قسم کی تکنیک سے تیار کی گئی دیواریں ہیں اور اس تکنیک کو عقیق نما جامدانی کہا جاتا ہے اور یہ تکنیک کشمیر اور شام میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس آثارِ قدیمہ کی جگہ کو قومی تاریخی مقام قرار دیا گیا ہے۔ یہاں پر یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ تاریخی مقام پہاڑی کے دامن سے اوپر تک ڈھلان کے اُوپر چبوتروں سے ترتیب دیا گیا ہے اِن چبوتروں کی اونچائی پر ایک صحن کی نہایت ہی عجیب پختہ فٹ پاتھ موجود ہے جسے انیٹوں کی ٹائیلوں سے سجایا گیا ہے جن پر طرح طرح کے پھولوں، پرندوں، جانوروں اور لوگوں کی تصویریں بنائی گئی ہیں۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ اِن لوگوں کا وضع قطع وسطِ ایشیا کے لوگوں سے ملتا جلتا ہے۔ ہر ٹائیل پر خروشتی گنتی کی مہر ڈالی گئی ہے اِن میں سے کوئی بھی ٹائیل بدھ مت کے ساتھ کسی رشتے کو ظاہر نہیں کرتی۔ ایسا لگتا ہے کہ آر، سی، کاک نے جس جگہ کو کھدوا کر دریافت کیا ہے اُس جگہ کو بدھ مت سے وابستہ جگہ ماننے میں اُس سے چوک ہوئی ہے۔ لیکن جتنے بھی آکار ان ٹائیلوں پر دیکھنے کو ملتے ہیں اُن سے اِن کا قریبی رِشتہ ایران اور شام سے لگتا ہے اِن ٹائیلوں میں کسی بھی ٹائیل پر ہندوؤں کے

کسی دیوتا یا کسی بودھی ستاوا کی تصویر موجود نہیں ہے۔ حقیقت میں اس جگہ یہودی مندر کے نشانات دکھائی دیتے ہیں اور یہاں پر مشرق سے مغرب کی طرف یہودی قبریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ سب سے بڑا چبوترہ آرون کی قبر کا کی ایک خستہ حال جگہ سی دِکھائی دیتی ہے۔ یہ مراقبے کی کوٹھری کے نزدیک واقع ہے۔

یہودی بستیاں :۔ کشمیر میں آباد ہونے کے سبب یہودیوں نے یہاں کئی گاؤں اور قصبے بنائے جن میں سے کچھ ابھی بھی موجود ہیں۔ یہودیوں کا کشمیر میں متوطن ہونا کئی صدیوں تک جاری رہا اور اُنہوں نے یہاں مقامی رسم ورواج اور مذہبی روایات کو اپنانا جاری رکھا۔ اِس کے بعد ایک موقع ایسا آیا جب اُنہوں نے یہ سلسلہ ترک کیا اور وہ ہر سال صرف ایک یا دو یہودیوں کو کشمیر وارِد ہونے کی اِجازت دیتے تھے۔

اسلئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ توراۃ اور زبور میں جن کئی قبیلوں اور جگہوں کا نام دیا گیا ہے وہ اب بھی کشمیر میں موجود ہوں۔ یہودی لوگوں نے اِن چیزوں کو اپنے ساتھ بنائے رکھا اور اِنہیں اپنے معمولاتِ زندگی میں شامل رکھا یعنی روزانہ کی عبادات، پڑھنے لکھنے اور کھانے پینے کے قوانین کو اپنے معمولات میں شامل رکھا اور یہ چیزیں کا شرُوت کے نام سے جاننے لگیں۔ یہودی لوگ اپنی مذہبی مجالس میں مردوں اور خواتین کے الگ الگ رہنے پر سخت زور دیتے تھے۔ وہ مذہبی تقاریب میں گانے بجانے کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے، یہی طریقۂ کار کشمیریوں میں بھی رائج ہے جو اپنی روزمرہ کی زندگی میں لکھنے پڑھنے، روزانہ کی عبادات، کھانے پینے کے قانون اور مذہبی تقاریب میں مردوں اور عورتوں کے الگ الگ رہنے پر خاص طور سے زور دیتے ہیں۔ وہ کبھی بھی دینی اجتماعوں میں موسیقی کے آلات کو بجائے کی اِجازت نہیں دیتے ہیں۔

.........☆☆☆.........

عبدالغنی شیخ لداخی

سیاچن گلیشئر ......تاریخ کے آئینے میں

اپریل ۱۹۸۴ء میں ہندوستان نے سیاچن گلیشئر کے پاس کوہ سلتودو کے دو دَرے ۱۸۴۳۰ فٹ بلند سیالا اور ۱۸۲۰۰ فٹ بلافون لا پر ہیلی کاپٹروں سے فوج اتاری۔ پاکستان نے ان کے متوازی ۱۷۰۰۰ سے ۱۸۰۰۰ فٹ بلند دو چوٹیوں پر اپنی فوج اتاری۔ پہلی مرتبہ سیاچن گلیشئر عالمی سطح پر نمایاں طور منظر عام پر آیا۔ سیالا تقریباً دو کلومیٹر لمبا ہے۔ لا، لداخی اور بلتی میں دَرے کو کہتے ہیں۔ ہندوستان نے سیالا کے مشرقی کنارے پر مورچے بنائے جبکہ پاکستان نے اس کے مغربی کنارے پر چوکیاں بنائیں۔ یہ فریقین کی فوجوں میں معرکہ آرائی کا پیش خیمہ تھا۔ جہاں لڑائی سے جانی نقصانات ہوئے، وہاں بلندی کڑاکے کی سردی اور برف و باد نے بڑی جانیں لیں۔ ۲۱ سال بعد ۲۰۰۵ء میں فائر بندی ہوئی، توپیں خاموش ہیں لیکن بلندی اور خراب موسم بدستور جانیں لے رہے ہیں۔

سیاچن کی پہچان دنیا کے بلند ترین محاذ جنگ کے طور ہوتی ہے۔ عسکری تاریخ میں ایسی جنگ کی کوئی مثال نہیں ملتی جب دو ملکوں نے قطبین کے بعد دنیا کے ایک انتہائی دشوار گزار اور مشکل خطے کا آپسی جنگ کے لئے انتخاب کیا ہو جس کو Third Pole یا تیسرا قطب کہا جاتا ہے۔

تاریخ صرف ایک مشہور جرنیل ہنی بل کا نام لیتی ہے، جس نے ۲۲۱ سال قبل مسیح ۹۰ ہزار پیدال، ۱۲ ہزار گھوڑ سوار اور ۳۷ ہاتھیوں کے ساتھ روم پر حملہ کرنے کے لئے برف و باد میں کوہ الپس عبور کیا۔ اس کے تقریباً آدھے فوجی اور لگ بھگ سارے ہاتھی مر گئے۔ لیکن سیاچن پر چھوٹے پیمانے پر سہی، برسوں سے یہ تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔

دونوں ملکوں نے سرکاری طور سیاچن پر ہوئے جانی نقصانات کے اعداد و شمار اجرا نہیں کئے ہیں۔ ٹائمز آف انڈیا کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۷ء کے درمیان سیاچن پر اندازاً ۲۰۰۰ ہندوستانی فوجیوں کی جانیں چلی گئیں جن میں زیادہ تر موسم اور بلندی سے مر گئے۔ اخبار کے مطابق ۱۹۹۹ء تک پاکستان کے ۱۳۰۰ فوجی کام آئے۔ مالی اخراجات غیر معمولی طور بھاری ہیں۔ صرف ہندوستان روزانہ تین سے ساڑھے تین کروڑ روپے صرف کر رہا ہے۔

محاذ جنگ بننے سے سیاچن عمومی طور گمنام تھا۔ حتیٰ کہ پچھلی صدی کے شروع میں اس کے ہمسایہ علاقہ نوبراہ کے بہت کم لوگ اس سے واقف تھے۔ سیاچن گلیشیئر کی ایک اوّلین محقق خاتون فینی بولاک ورک لین رقم طراز ہے۔ ''میں نے لوگوں سے سنا کہ لوگوں کو سیاچن گلیشیئر سے متعلق بہت کم علم ہے۔'' فینی نے ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء میں سیاچن کا سروے کیا تھا۔ ان کوہ پیمائی کی مہمات میں اس کا شوہر ڈاکٹر ولیم ہنٹر ورک مین اس کے ساتھ تھا۔

سیاچن محاذ شمال میں کانوے سیڈل سے لے کر جنوب میں چولونگ لا پھیلا ہوا ہے اور پورے محاذ جنگ پر فوجی چوکیوں اور مورچوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ درمیان میں گلیشر حائل ہیں اس لئے تقریباً ہر چوکی پر الگ لڑائیاں ہوئی ہیں۔ کانوے سیڈل (Convay Saddle) ایک انگریز کوہ پیما لارڈ مارٹن کانوے کے نام پر پڑا ہے۔ وہ بلتورو گلیشیئر کے آخری سرے پر واقع گھوڑے کے زین نما اس پہاڑی سے گزرا تھا بلتورو کنگری

کو سر کرنے کی کوشش کی تھی۔ بلتور کنگری کو گولڈن تھروون Golden Throne بھی کہتے ہیں۔

ہندوستان کے ایک اعلیٰ فوجی افسر لیفٹیننٹ جرنیل ایم، ایل چھبیر نے سیاچن گلیشیئر سے متعلق کہا ہے۔

''انٹارکٹیکا (Antarc tica) سیاچن گلیشیئر کے مقابلے میں ایک تفریحی مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔''

پاکستانی جرنیل کے ایم، عارف نے سیاچن گلیشیئر کے ضمن میں لکھا ہے:

''یہ وہ علاقہ ہے جہاں فاصلوں کو کلومیٹر اور گزوں کے بجائے دنوں اور گھنٹوں میں ناپا جاتا ہے۔ سردی سے جانیں تلف یا مفلوج ہو جاتی ہیں۔ چلتے وقت ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا پڑتا ہے۔ یہاں زندگی ور موت کا درمیانی فاصلہ بہت کم ہے۔''

سیاچن گلیشیئر ۷۶ اعشاریہ ۴ کلومیٹر لمبا اور ۲ سے ۷ کلومیٹر چوڑا ہے۔ سیاچن کی وجہ تسمیہ کے پیچھے ایک جنگلی گلاب سیا ہے۔ یہ خود رو پھول خاص کر سیاچن گلیشیئر کے جنوب مشرق میں بکثرت اگتا ہے۔ سیا لداخی اور بلتی زبانوں میں گلاب یا جنگلی گلاب کو کہتے ہیں۔ چن کا مطلب اگنے والی جگہ ہے۔ سیا عام طور پر ۸۰۰۰ سے ۱۵۰۰۰ فٹ کی بلندی پر پہاڑ کے پہلو میں اگتا ہے۔ یہ گلابی، پیلے اور سفید رنگ کے ہوتے ہیں۔ سیاچن پر زیادہ تر گلابی رنگ کے سیا پائے جاتے ہیں۔ نوبراہ وادی سے Base Camp (انتظامی کیمپ) پر پہنچنے سے پہلے سڑک کے کنارے سیا نظر آتے ہیں۔ عام طور پر اس سخت جان پھول کے علاوہ یہاں اور کوئی روئیدگی نظر نہیں آتی تاہم The Exploration of the siachan or Rose Glacier کی مصنفہ فینی بولاک ورک مین لکھتی ہے:

''سیاچن کے نشیبی اطراف میں اگر کوئی بلا نشو و نما پائے Eddwesis کوہستان الپ کا ایک پودا، جس پر سفید پھول پیدا ہوتے ہیں) اور الپائن کی دوسری چھوٹی

نباتات پائیں تو وہ خوش نصیب ہے جبکہ بالائی ۳۰ میلوں کے راستے پر صرف برفانی گلاب (سیا) پروان چڑھتا ہے۔"

سیاچن گلیشیئر پاکستان، چین سرحد پر واقع درہ ۱۸۵۲۰ فٹ بلند ترکستان' سے شروع ہوتا ہے۔ جہاں سے گلیشیئر جنوب مشرق کی طرف زینگ رولما نامی مقام تک پھیلا ہوا ہے۔ زینگ رولما دریائے سیاچن کا منبع ہے جو وادیٔ نوبراہ میں لقچونگ نام کے گاؤں کے موڑ پر دریائے شیوق میں جاملتا ہے۔ سیاچن دریا کو دریائے نوبراہ بھی کہتے ہیں۔

سیاچن گلیشیئر سلسلہ ہائے قراقرم کے مشرقی حصے میں واقع ہے۔ کوہ قراقرم ۲۰۰ میل لمبا ہے۔ اس سلسلہ ہائے کوہ میں ۳۰۰ چوٹیاں ہیں جن میں ۲۸۲۶۵ فٹ بلند دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے۔ٹو شامل ہے۔ بلتستان کے لوگ کے۔ٹو کو چھوغوری یا عظیم پہاڑ کہتے ہیں۔ قطبین کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ بڑے گلیشیئر قراقرم سلسلہ ہائے کوہ میں ہیں۔ آج سے سوا سو سال پہلے صرف چند چوٹیوں کے بارے میں لوگوں کو علم تھا۔

لداخ میں نوبراہ وادی کا واشی نامی گاؤں سیاچن گلیشیئر سے پہلے آخری گاؤں ہے۔ یہ سیاچن سے لگ بھگ ۴۰ کلومیٹر دور ہے۔ اس گاؤں میں چند ہی گھرانے ہیں۔ اس سے پہلے برما گونبو نامی گاؤں آتا ہے۔ اس گاؤں میں ۲۵ کنبے بستے ہیں۔ یہاں لداخی بودھ تیرتھ یاترا پر آتے ہیں۔ گونبو اور واشی کے درمیان ۸ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ گونبو کے پیچھے ۷ کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے سیاچن کے آر پار ٹونگسکیت اور نیونگسکیت گاؤں ہیں۔ جن دنوں سیاچن پر لڑائیاں ہوتی تھیں ان گاؤں کے لوگ توپوں کی گرج سنتے تھے اور رات کو گلیشیئر پر آگ کی لپیٹیں دیکھ سکتے تھے۔

لیہہ سے سیاچن ۲۸۸ کلومیٹر دور ہے۔ بلتستان کے بڑے شہر سکردو سے ۲۲۴ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ سیاچن گلیشیئر سے ۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر بلتستان میں کندوس اور مالتورو کی سر سبز وادیاں ہیں جہاں متعدد چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔ سیاچن

گلیشیئر سے پہلے وادی سلتورو کا آخری گاؤں گونما اور وادی کندوس کا آخری گاؤں کرمانی ہے۔ ان سے آگے گلیشیئر شروع ہوتا ہے۔

سیاچن گلیشیئر چھوٹے بڑے متعدد گلیشیئروں سے گھرا ہوا ہے۔ شمال کی طرف پہلا گلیشیئر کندوس ہے جو تقریباً ۳۰ کلومیٹر لمبا اور ڈھائی کلومیٹر چوڑا ہے۔ دوسرا گلیشیر بالتورو ہے جو قریباً ۴۰ کلومیٹر لمبا اور ۱ سے ۲ کلومیٹر چوڑا ہے۔ ایک اور گلیشیر بلافون ہے جو تقریباً ۲۰ کلومیٹر لمبا اور ۲ سے ۳ کلومیٹر چوڑا ہے۔

بلافون بلتی زبان میں تتلی کو کہتے ہیں۔ درہ بلافون کے دونوں پہلو تتلی کے پر کے مشابہہ ہیں اور بلافون گلیشیئر تتلی کا دھڑ جیسا لگتا ہے۔ اس ضمن میں فینی بولاک مین لکھتی ہے کہ بلافون کا نام رسالتورو کے چند گنے چنے لوگوں کی شاعرانہ تخیل آرائی ہو سکتی ہے جو فی زمانہ ان لوگوں میں پائی نہیں جاتی ہے۔

بالتورو گلیشیئر کے قرب و جوار میں ایسی ۱۹ چوٹیاں ہیں جن کی بلندی سطحِ سمندر سے ۲۵ ہزار فٹ بلند ہیں۔ ۱۵ میل کے دائرے میں ۲۶ ہزار فٹ سے بلند ۶ چوٹیاں ہیں۔

سیاچن اور دوسرے گلیشیئروں کے محاذ پر اکثر چوکیاں ۱۸۰۰۰ فٹ بلند ہیں۔ بعض چوکیاں اکیس ہزار فٹ کی بلندیوں پر قائم کی گئی ہیں۔

موسمِ گرما میں بھی سیاچن پر درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے ۱۰ سے ۱۵ ڈگری سینٹی گریڈ نیچے رہتا ہے۔ اس لئے یہ سارا سال برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ سردیوں میں منفی ۲۰ درجے سے ۵۷ درجے تک گرتا ہے اور ساڑے پندرہ فٹ گہری برف پڑتی ہے۔ آکسیجن کی بڑی کمی ہے۔ اس لئے یہاں انسان گوناگوں بیماریوں کا شکار رہتا ہے۔ سانس کی تکلیف Hypoxia اور پھیپھڑوں میں پانی بھرنے کا مرض Pulmonary Odema کا شکار ہوتا ہے۔ Frostbite یا برف سے ہاتھ، پیر اور بدن پر ورم پڑنے اور پھوڑا نکلنے، تھکن، بے چینی اور ہاتھ پاؤں پھٹنے کی شکایت عام رہتی ہے۔ مرنے کے بعد لاش کچھ

دیر پڑی رہے تو اکڑ جاتی ہے۔ ایک سنگین خطرہ اس کی کھائیاں ہیں۔ ان کا شگاف چند اِنچوں سے لے کر کئی فٹ بڑا ہے۔ کچھ شگاف بہت بڑا ہوتے ہیں کوہ پیما ان سے بچنے کے لئے بہت لمبا چکر کاٹتے تھے۔ کئی دفعہ شگاف پر برف کی ہلکی تہہ ہوتی ہے جس سے دھوکا لگتا ہے۔ کھائیاں ایک دو فٹ سے لے کر سینکڑوں فٹ گہری ہیں۔ اگر کوئی گہری کھائی میں گر جائے تو لاش کا ملنا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ گلیشیئر پر ایک کلومیٹر کا راستہ طے کرنے میں دو سے تین دن لگتے ہیں۔ برفانی ہوائیں فی گھنٹہ ۱۰۰ سے ۱۵۰ میل کی رفتار سے چلتی ہیں اور اپنی راہ میں آنے والے آدمیوں اور چیزوں کو دور پھینک دیتی ہیں۔

سیاچن گلیشر کی تاریخ اور ماضی کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ کبھی اس کے راستے بلتستان اور چینی ترکستان کے درمیان لوگوں کی آمد رفت تھی۔ یہ آمد رفت کندوس گلیشیئر، کوہ سلتورو کے شمالی درے سیالا اور سیاچن گلیشیئر کے شمال مغربی کنارے پر واقع "ترکستان" کے راستے سترھویں صدی تک جاری رہی۔

کرنل محمد ذاکر، جو بلتستان سے تعلق رکھتا ہے، اپنی کتاب "سیاچن گلیشیئر...... دنیا کا بلند ترین محاذِ جنگ، میں لکھتا ہے:

"قریباً ۱۸۰۰ء سے پہلے تک بلافون اور سیاچن میں اس قدر بڑے گلیشیئر نہ تھے۔ اس زمانے میں ان گلیشروں پر آمد و رفت کے لئے پیدل چلنے والوں، گھوڑوں اور یاک وغیرہ کے لئے راستے موجود تھے۔ بلافون گلیشیئر پر علی برانگسا (آرام کرنے کی جگہ) اور سیاچن پر سامیر برانگسا اور تیرم شہر جیسی جگہوں کا وجود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ماضی بعید میں یہاں پر انسانی آبادیاں موجود تھیں اور سیاچن گلیشیئر سے تیرم شہر اور تیرم شہر سے تاریخی درہ قراقرم تک بھی راستے کی موجودگی کے شواہد موجود ہیں..... بلتستان کی طرف سے قدیم زمانے میں سیاچن میں انسانی آبادیاں موجود تھیں۔"

مصنف کے مطابق علی برانگسا نامی جگہ وادی سلتورو کے مشہور شکاری علی سے

منسوب ہے۔

مذکورہ بیان میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ سیاچن گلیشیئر کے پڑوس صحرائے گوبی میں لگ بھگ ایک ہزار سال پہلے تک بڑی بڑی بستیاں تھیں۔ ان کی تعداد ڈھائی سو سے تین سو تک بتائی جاتی ہے۔ ان بستیوں کے لوگ اسلام اور بدھ مت کے پیرو کار تھے۔ جغرافیائی محرکات جیسے آب و ہوا میں تبدیلی، دریاؤں کا رخ بدلنے، پانی کم ہونے اور چشمے سوکھنے سے نخلستان ریگستان میں جذب ہوئے، پھر ریت کے بگولے اٹھے اور بستیاں زیرزمین دب گئیں۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے شروع میں یورپیوں نے ان مقامات کی کھدائی کی اور زیرِ زمین نکالے ہوئے نوادارات یورپ منتقل کیئے گئے جہاں انہیں عجائب گھروں وغیرہ میں رکھا گیا۔ ہمارا رشتہ دار صابر ملک ایک یورپی کے ہمراہ ایسی ایک مہم میں گوبی ریگستان گیا تھا۔ میری کم سنی میں جب وہ حیات تھا تو ہمیں اپنی روداد سناتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ٹنوں ریت کے نیچے قطار میں موجود انسانی جسم کے پنجر سے ایسا لگتا تھا کہ ریت کے طوفان نے ان کو اچانک اپنی لپیٹ میں لیا۔ ان پنجروں کے سامنے مذہبی موسیقی کے آلات تھے۔ یہ غالباً ایک بودھ مٹھ تھا۔ زیرِ زمین سونا بھی برآمد ہوا تھا۔ صابر ملک کو مہم کے سربراہ نے ایک جیبی گھڑی تحفہ میں دی تھی جس پر اس کا نام نقش تھا۔ اب اس گھڑی کا خول بچا ہے۔ صابر ملک کی بیٹی نے مجھے دیا۔ اس پر کسی یورپی کا نام لکھا ہوا ہے۔

بلتستان میں روایت ہے کہ میر سید علی ہمدانیؒ کے بلتستان میں قیام کے بعد چودھویں صدی کے آخری ربع میں سلتورو سے کندوس گلیشیئر، سیالا، سیاچن گلیشیئر اور بلتستان سے ہوتے ہوئے آپ یارقند (چینی ترکستان) تشریف لے گئے۔ میر سید علی ہمدانیؒ نے پہلے پہل بلتستان کے لوگوں کو اسلام سے روشناس کیا اور بہت سارے لوگوں نے ان کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔

بعد میں دو برادر مبلغین سیّد علی طوسی اور سیّد ناصر طوسی سمیت دوسرے مبلغین اسی راستے سے بلتستان آئے۔

فینی بولوک ورک مین لکھتی ہے کہ میلوں تک پھیلے گلیشیئروں کے درمیان تیرم شہر واقع ہے۔ تیرم ترکی لفظ ہے۔ جس کے لفظی معنی قابل کاشت زمین ہیں۔ یہ نخلستان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ تیرم شہر کا گلیشیئر ۱۷ میل لمبا اور ڈیڑھ سے دو میل چوڑا ہے۔ فینی نے بلتیوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس قدیم شہر میں یارقندی (ترکی) آباد تھے اور یہاں وہ بلتیوں کے ساتھ پولو کھیلتے تھے۔ اس کے پڑوس میں گیہادی نال بلتیوں کا گاؤں تھا۔ یارقندی یہاں مویشی لوٹنے آتے تھے۔ تب گیہادی میں گنجان آبادی تھی۔ ایک مرتبہ یارقندیوں نے گاؤں میں کام کررہی ایک بلتی عورت کو اغوا کیا۔ پہاڑ سے آئے ایک برفانی طوفان سے یہ شہر تباہ ہوگیا۔

گیہاری وہی مقام ہے جہاں ۱۷/اپریل ۲۰۱۲ء کو ۱۲۰ سے زائد پاکستانی فوجی برفانی تودوں کے نیچے دب گئے تھے۔ یہ سانحہ صبح پانچ کر پینتالیس منٹ پر پیش آیا تھا۔ یہاں پہاڑ کے دامن میں بٹالین ہیڈکوارٹر تھا اور بڑے ہتھیار رکھے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پانچ میل کے رقبے میں گلیشیئر ٹوٹ کر نیچے آیا تھا اور فوجی اس کی زد میں آئے تھے۔

فینی اور اس کے جماعت نے ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء کی گرمیوں میں اپنی مہموں کے دوران تیرم شہر، علی برانگسا اور شمالی کیمپ پر پتھروں سے بنی ۸ پناہ گاہیں اور (Cairns) پتھروں سے بعض گاؤدم شکل کی یادگار) اور پتھروں کا بنا ایک دائرہ دیکھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ماضی میں خطے کے لوگ اسی راستے سیاچن اور بلافون سے ترکستان اور نوبراہ جاتے تھے۔

ڈاکٹر ٹی۔ جی۔ لونگ سٹاف کے مطابق بلتی مسافر بلتستان سے نوبراہ جانے کے لئے بلافون درے کو بطور قریبی راستہ (Short Cut) استعمال کرتے تھے۔ لونگ

سٹاف نے ۱۹۰۹ء میں سیاچن کا مختصر سروے کیا تھا۔فینی نے لونگ سٹاف کے بیان کو صحیح بتایا ہے۔

کرنل گوڈوین آسٹین کا بھی خیال ہے کہ نقشہ کے مطابق بلتستان کے لوگ غالباً سالتورو سے یارقند جاتے تھے۔گوڈوین آسٹین نے کے۔ٹو دریافت کیا تھا۔

ایک بلتی لیڈر اور قلم کار فدا محمد ناشاد کی ملاقات گونما گاؤں میں لگ بھگ سو سالہ ایک عمر رسیدہ بزرگ محمد ابراہیم سے ہوئی۔وہ سیاچن سے دو دفعہ لداخ گیا تھا۔پہلی مرتبہ غالباً ۱۹۲۹ء اور دوسری مرتبہ ۱۹۳۳ء میں سیاچن کو عبور کر کے ۱۸۲۰۰ فٹ بلند چولونگ لا کے راستے نوبراہ کے وارث گاؤں پہنچا تھا اور وہاں سے لیہہ روانہ ہوا تھا۔

کپتان ہنری سٹریچی پہلا یورپی تھا جس نے پہلے پہل اکتوبر ۱۸۴۸ء میں سیاچن کا لمبا گلیشیر دیکھا۔وہ اس پر دو میل چلا۔

۱۸۴۷ء میں برطانیہ ہند کے گورنر جنرل لارڈ ہارڈینگ نے ہنری سٹریچی سمیت دو اہل کار میجر الیکزنڈر کننگھم اور ڈاکٹر تھامس تھامسن کو سروے اور تحقیقی کام کے لئے لداخ بھیجا۔خفیہ طور انہیں جاسوسی کا کام بھی سونپا۔گورنر جنرل نے اسے پہلے مئی ۱۸۴۷ء میں تبتی سرحدی کمیشن قائم کیا تھا۔

مشن کی تکمیل کے بعد تینوں انگریز افسروں نے اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کیا۔کننگھم نے Ladakh: Physical, Statistical & Historical مطبوعہ (۱۸۵۳ء) کے نام سے لداخ سے متعلق ایک تحقیقی اور علمی کتاب لکھی جو ایک حوالہ جاتی تصنیف کے طور ایک اچھا ماخذ مانی جاتی ہے۔ڈاکٹر تھامس تھامسن نے Western Himalaya & Tibet (۱۸۵۲ء) کے نام سے لداخ کے پیڑوں، جڑی بوٹیوں اور جھاڑیوں پر ایک کتاب تصنیف کی۔خطے سے متعلق سٹریچی کی رپورٹ بھی شائع ہوئی۔

ڈاکٹر ٹی، جی لونگ سٹاف پہلا یورپی محقق کوہ پیما تھا جس نے سیاچن گلیشیر کا سروے کیا۔ وہ ۱۹۰۹ء میں بولافون درہ عبور کر کے سیاچن گلیشر پہنچا اور بڑے بڑے برفانی تودوں اور کھائیوں سے ہوتا ہوا ویمو گلیشر کے دہانے پر پہنچا۔ وہاں سے سیاچن گیا۔ لونگ سٹاف نے دیکھا کہ سیاچن مزید شمال کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ لونگ سٹاف نے اس کا طاس دیکھا۔ انہوں نے سیاچن پر صرف ڈیڑھ دو دن گزارے۔ اپنے سفر کے دوران لونگ سٹاف ایک مرتبہ ایک گہری برفانی کھائی میں گرا اور دوسری مرتبہ ایک برفانی تودے میں پھنس گیا اور بڑی مشکل سے جان بچی۔

امریکی شہری فینی بولاک ورک مین کا اوپر ذکر آیا ہے۔ وہ اور ان کے شوہر ولیم ہنٹر ورک مین منجھے ہوئے کوہ پیما تھے۔ انہوں نے ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء کی گرمیوں میں سیاچن گلیشیر پر تقریباً چار ماہ گزارے۔ نئی چوٹیاں اور درے دریافت کئے۔ ان کی بلندیوں کی پیمائش کی۔ ان پر چڑھے اور ان کے نام رکھے۔ ان میں کئی نام آج بھی مستعمل ہیں۔ خاص کر سیالا اور اندرا کول زبان زدِ عوام ہیں۔ اسی طرح Silver Throne اور ترکستان لا بھی عام مروّج ہیں۔ یہ نام بھی ان کے رکھے تھے۔

فینی نے سی، گرانٹ پیٹر کین کی خدمات حاصل کیں، جو سروے کا اچھا تجربہ رکھتا تھا اور اس ضمن میں رایل جیوگرافیکل سوسائٹی کا ڈپلوما یافتہ تھا۔ اس کی مدد کے لئے سروے آف انڈیا کا ایک ملازم سرجن سنگھ کو ساتھ لیا۔

فینی کی مہم کی روداد پہلے جیوگرافیکل جرنل میں چھپی بعد میں یہ کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب نایاب تھی۔ راقم الحروف کی استدعا پر امریکہ میں مقیم ایک دوست نے اس کی فوٹو کاپی بھیجی جس سے ماخوذ چند اقتباسات یہاں زیرِ نظر مضمون میں پیش کئے جاتے ہیں۔

سیاچن گلیشیر کے سروے سے پہلے مصنّفہ نے پانچ مہمات میں حصہ لیا اور آٹھ

مرتبہ کوہ پیمائی کی۔میں نے اپنی کتاب "لدرخ...... محققوں اور سیاحوں کی نظر میں (مطبوعہ ۲۰۱۱ء) میں فینی اور ولیم کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے، جو تقریباً دو صفحات پر محیط ہیں، جس کے لئے میں نے مذکورہ کتاب کے علاوہ دو اور کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔میں اپنی کتاب کی جزئیات کو یہاں نقل کرتا ہوں جن سے فینی اور اس کے شوہر ولیم کی زندگی کا پسِ منظر اور مہم جویانہ سرگرمیوں کی جانکاری ہوتی ہے۔

"امریکی میاں بیوی فینی بولوک ورک مین اور ولیم ایچ ورک میں ۱۸۹۸ء کی گرمیوں میں لیہہ آئے جہاں سے وہ نوبراہ اور مشرقی ترکستان کی سرحد تک گئے۔کوہ پیمائی کی پھر زنسکار روانہ ہوئے۔۱۸۹۹ء میں دیوسائی سے سکردو اور شگر چلے گئے۔تب سے ۱۹۱۲ء تک دونوں میاں بیوی نے خطے میں ۵ مہمات میں حصہ لیا اور آٹھ مرتبہ کوہ پیمائی کی۔ آٹھ ضخیم کتابوں میں انہوں نے ان کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ان سے پہلے کرنل گوڈوین آسٹین، کرنل ینگ ہاسبنڈ اور سر مارٹن کونوے نے قراقرم میں دشت نوردی اور کوہ پیمائی کی تھی۔

۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء میں فینی ورک مین اور ولیم ورک مین نے شمالی بلتستان میں ۳۰ میل لمبا چوگولونگما گلیشیئر دریافت کیا۔فینی نے ۲۲۵۶۸ فٹ بلند گونگما چوٹی سر کی اور ولیم ۲۳۳۹۲ Pyramid چوٹی پر چڑھا۔۱۹۰۴ء میں فینی نے لداخ میں کرگل کے پاس نن کن کی ایک چوٹی سر کی اور اس کو ۲۳۳۰۰ فٹ بلند پایا۔سیون ہیڈین نے ولیم اور فینی کے ان یخ بستہ پہاڑوں کی دریافت کو دنیا کے لئے ایک اہم واقعہ قرار دیا ہے۔

دونوں میاں بیوی کی اہم ترین دریافت سیاچن یا گل گلاب گلیشیئر ہے۔۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء کی مہمات میں انہوں نے یہ کارنامہ سرانجام دیا۔فینی نے اسے "عظیم گل گلاب یا سیاچن کی فتح"، اور دنیا کا طویل ترین "قطبی گلیشیئر" کہا ہے۔

کسی کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ ۴۸ میل لمبا گلِ گلاب گل گلیشیئر ۲۷

سال بعد دنیا کا بلند ترین میدان جنگل میں تبدیل ہوگا۔ فینی نے سیاچن پر اپنی دوسری کتاب Two Summer in the Ice Wilds of Eastern Kara Koram میں ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء کے سیاچن کی مہم کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس میں ۱۴۱ خوبصورت تصویریں ہیں۔ ایک تصویر میں فینی لگ بھگ ۲۱ ہزار فٹ بلند چوٹی پر اسکرٹ اور جیکٹ میں ملبوس اخبار پڑھ رہی ہے۔ جس پر "عورتوں کو حق کا ووٹ" کی سرخی جمی ہے۔ فینی کے سامنے اس کی یخ توڑنے کی کلہاڑی برف میں دھنسی ہے ۱۹۱۲ء کی مہم کے دوران فینی اور ولیم نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سیاچن دیکھا۔ ان کے ہمراہ کئی یورپی اور ۶۶ قلی وغیرہ تھے۔ آج سیاچن کا نام ساری دنیا نے سنا ہے۔ ان دنوں بقولِ فینی ورک مین اس کے ہمسائیگی میں رہنے ولاے نوبراہ کے لوگوں کو بھی سیاچن کا بہت کم علم تھا۔

اگست ۱۹۱۱ء فینی اور اس کی ٹیم نے ۲۵ روز سیاچن پر گزارے ۱۹۱۲ء میں وہ ۵/ جون کو سرینگر سے بلتستان کے لئے نکلی سیاچن سے پہلے آخری اہم گاؤں خپلو پہنچی۔ خپلو کا راجا شیر علی خان فوت ہوا تھا اور اس کا بھتیجا ناصر علی خان حکمران بنا تھا۔ راجا نے اپنا ایک معتمد وزیر عبدالکریم کو فینی کی جماعت میں کام کرنے کے لئے دیا۔ بقول فینی وہ بڑا محنتی اور شریف النفس آدمی تھا۔

۲/ جولائی کو وہ آخری گاؤں گونما پہنچے۔ فینی لکھتی ہے کہ ان کے پہنچنے سے پہلے مولویوں نے قلیوں کو تعویز دیا تھا اور ان کے حق میں دعائیں مانگی تھیں جن کے عوض وہ مولویوں کو معاوضہ دیتے تھے۔ تعویز گلے پر باندھتے تھے۔ گونما سے وہ گیہاری آئے۔ نارم گلیشر سے پہلے انہوں نے پہلا کیمپ لگایا۔

۱۹۱۱ء کی مہم کے دوران فینی نے نارم سے آگے ۱۷۰۰۰ فٹ کی بلندی پر پتھروں سے تعمیر کی ہوئی ۸ پناہ گاہیں دیکھی تھیں۔ تاہم کھانا پکانے کے لئے کوئی چولھا چوکا وغیرہ

نہیں دیکھا۔اس سے یہ عیاں تھا کہ ماضی قریب میں یہ پناہ گاہیں استعمال نہیں ہوتی تھیں۔

اب کے ایک بار بردار قلی Cesare Chenoz اپنی بے احتیاطی سے ۸۰ فٹ گہری کھائی میں گر گیا۔اس کو زندہ نکالا گیا اور علی برانگسا لیا گیا جہاں رات کو وہ فوت ہو گیا۔

فینی نے ایک چوٹی کا نام تعویز رکھا۔ ماضی میں مسافر بلتی یہاں یارقندیوں کی جارحیت سے محفوظ رہنے اور بقول فینی موخر الذکر کو نقصان پہنچانے کی نیت سے تعویز چڑھاتے تھے۔

۱۹۱۱ء میں ڈاکٹر ولیم ،ایچ ورک مین نے گلیشیئر کے طاس کا سروے کیا تھا اور سب سے بڑا معاون دریا دریافت کیا۔۱۹۱۲ء کی مہم کے دوران وہ سبھی سیاچن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گئے اور اس کے شمالی اور مشرقی منبعوں تک پہنچے۔وہ وادی سالتورو کی جانب سے بلافون لا عبور کر کے بولوفونڈ گلیشیئر سے ہوتے ہوئے سیاچن گلیشیئر پہنچے تھے۔

فینی لکھتی ہے سیاچن گ گلیشیئر کی لمبائی ۴۶ میل ہے۔(نئے سروے کے مطابق اس کی لمبائی ۴۸ میل ہے۔) ۲۵ میل کے فاصلے پر اس کی چوڑائی ڈھائی سے پونے تین میل ہوتی ہے۔غالباً پہلی مرتبہ انہوں نے دنیا کو سیاچن گلیشیئر کی لمبائی اور چوڑائی سے آگاہ کیا۔

ایک جگہ انہوں نے پتھروں کا بنایا ہوا ایک دائرہ دیکھا،جس کا قطر ۱۲ فٹ تھا۔یہ Linches سے ڈھکا ہوا تھا اور لکھا ہے کہ کسی نے انہیں برسوں سے نہیں چھوا ہے۔دائرہ کے اندر کیل (Ibex) کے بڑے بڑے سینگ تھے۔فینی لکھتی ہے کہ یہ مقامی لوگوں کا بنایا ہوا لگتا ہے۔

ٹیم نے کئی مقامات پر لومڑی اور دوسرے جانوروں کے پیر کے نشانات دیکھے۔ انسانی قدموں کی آواز سے وہاں رام چکور اڑے۔انہیں بھورے رنگ کے بہت سے

چھوٹے پرندے نظر آئے۔ فینی نے اٹلی میں الپس پر ایسے پرندے دیکھے تھے۔ گائیڈ نے انہیں برفانی پرندہ بتایا۔

۱۹۱۱ء میں اسسے آگے انہوں نے دو جھیلیں دیکھتی تھیں۔ جہاں انہوں نے ۱۶۲۰۰ فٹ کی بلندی پر کیمپ لگایا تھا۔ یہاں فینی نے بڑے بڑے کیلوں کو گھاس چرتے دیکھا تھا۔

علی برانگسا سے تین کوّے ان کے کیمپ کے ساتھ اڑے اور آخر تک ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ وہ ان کوّوں کو اپنے لئے نیک شگون سمجھتے تھے۔ فینی لکھتی ہے۔ یہ کوے بڑے اور اچھے خاصے تھے۔ ۲۰ ہزار فٹ کی بلندی پر بھی ان پر ناسازگار آب وہوا کا بُرا اثر نہیں پڑا۔ ایک جگہ انہوں نے دو Cairns دیکھے جو تقریباً ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔

سیاچن میں فینی نے ایک جگہ اپنے ایک کیمپ پر Cairns دیکھے۔ وہ سوچتی ہے اس الگ تھلگ مقام پر Cairns کا ہونا یہ بتاتا ہے کہ بلتستان یا نوبراہ سے مسافر ترکستان جانے کے لئے راستے کی تلاش میں اس مقام تک پہنچے ہوں گے اور سامنے برفانی پہاڑ دیکھ کر لوٹے ہوں گے۔ فینی کے خیال میں اس قیاس آرائی کا اطلاق تیرم شہر کے پتھروں سے بنے دائرے پر بھی ہوتا ہے۔

آگے چل کر انہوں نے دو مخروطی برفانی چوٹیاں دیکھیں۔ ان کو فینی نے Silver Throne (چاندی کا تخت) اور Lower Silver Thrones (نشیبی چاندی کا تخت) کے نام دیئے۔

مہم کے ارکان نے اس سفر کے دوران ننگی چٹانیں اور چھوٹی جھیلیں نہیں دیکھیں جن کی سیاچن گلیشر پر بہتات ہیں۔ اس بات کو لے کر قلیوں نے آہ وزاری کی۔

مصنفہ نے ملکہ میری سے اجازت لے کر ایک چوٹی کا نام Queen Mary Peak رکھا۔ اس کی بلندی ۲۴۳۵۰ فٹ تھی۔ ۲۳۲۷۰ فٹ بلند چوٹی کا نام وائسرائے سے منسوب کیا اور Mount Harding رکھا۔ فینی نے اس سے قبل پاس پاس واقع تین

چوٹیوں کا نام شاہ جارج پنجم کی گروپ کی کے نام سے موسوم کیا تھا۔اس سلسلے میں انگریز بادشاہ جارج پنجم سے باقاعدہ اجازت حاصل کی تھی۔فینی نے ایک چوٹی کا ذکر کیا ہے جہاں سے شاہ جارج پنجم کی گروپ کی چوٹیاں اور گاشیر برم نمایاں طور نظر آتے تھے۔

پیٹر کین نے نشیبی سیاچن سے نوبراہ تک نقشہ کشی کی تھی۔فینی لکھتی ہے" خاص دھیان دینے کے باوجود ہمیں وہ Cairn نظر نہیں آیا جس کا ان کے خاکہ میں ذکر ہے"۔

فینی رقم طراز ہے۔" گونما سے آتا ہوا ایک قلی گلیشائی دریا میں گرا تھا۔اس کے ساتھ ایک صندوق تھا۔جس میں ایک تھیلے میں سکے اور دوسرے میں میرے ذاتی کپڑے تھے۔وہ اس صندوق کو چھوڑ کر آیا۔ایک روز بعد گائیڈ اور چند قلی لینے گئے۔بہت تلاش کے بعد انہوں نے چھ فٹ پانی کے نیچے دو تھیلے دیکھے۔ایک قلی نے غوطہ مار کر انہیں نکالا۔تاہم بہت سارے سکے اور میرے کپڑے نالے میں نیچے بہہ گئے تھے۔چند قلی صبح صبح کئی روز سکوں کی تلاش میں نکلتے۔میں نے سنا کہ ان کی محنت بر آتی"۔

آگے وہ لکھتی ہے۔" جوں جوں دن گزرتے گئے۔ہم سب بلندیوں کی وجہ سے کم کھانا کھانے لگے۔رات کو نیند کم آنے کی شکایت بھی رہتی تھی۔ہم نے ماسوائے تین چار روز، چار ہفتے ۱۶۶۰۰ فٹ سے زیادہ بلندی پر سفر کیا تھا۔اکثر ۱۷۰۰۰ فٹ سے زیادہ اونچائی پر سفر کیا۔ہمارے ساتھ ۶۶ قلی تھے۔

۲۱ اگست کو تین کوّے آگے اڑتے ہوئے پرانے برفانی کیمپ کی طرف اترے"۔

اس کے بعد کوّوں کا ذکر نہیں ہے۔اب سفر کے کم دن بچے تھے۔

فینی کی پارٹی کو یخ پر چلتے ہوئے اکثر کھائیوں سے پالا پڑا۔کبھی ایک بڑی کھائی کی وجہ سے سیدھے راستے سے ہٹ کر لمبا چکر لگانا پڑتا تھا۔ایک چٹان لئے فینی نے کالی سیاہی سے اپنا نام مخفف حروف میں F.B.W لکھوایا۔اس کے ساتھ ایک ڈھلوان چوٹی پر ایک Cairn تعمیر کیا۔

وہ لکھتی ہے: ''ایک روز صبح ساڑے چھ بجے خیمے میں میرے نیچے گلیشیئر ہلنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ یخ بیخ و بن سے اکھڑ رہا ہے۔ اس کے فوراً بعد پونا گھنٹہ تک برف کے تودے گرنے سے گڑگڑاہٹ کی آواز آتی رہی۔ تھوڑے سے وقفے کے لئے لیکن بڑے زور سے میں آگے پیچھے جھولنے لگا۔''

فینی کو سرینگر میں زلزلہ کا تجربہ ہوا تھا اور بے ساختہ کہا تھا۔ ''کاش! میں خیمے میں ہوتی تو اتنی کوفت نہیں ہوتی۔''

وادی سلتورو میں یہ زلزلہ زیادہ شدّت کا تھا۔ جس سے بہت سارے مکانات ڈھ گئے تھے اور مویشی مر گئے تھے۔ وادی کندوبس میں دو دن گرد و غبار سے اندھیرا چھایا رہا۔ دوپہر کو دوسری جگہ پہنچنے پر ایک اونچی چٹان سے لگاتار بڑے بڑے پتھر گڑگڑاہٹ کے ساتھ لڑھکنے لگے۔ جہاں یہ گرتے، وہاں گرد و غبار کے بادل اٹھتے تھے۔ رات کے دس بجے تک یہ صورت حال رہی۔

فینی رقم طراز ہے ''۱۹۱۱ء میں مہم کی ٹیم ۲۰ اگست سے ۱۵ ستمبر تک سیاچن گلیشیئر پر رہی ۱۹۱۲ء میں جولائی اور اگست کے دو پورے مہینے گلیشیئر پر گزارے۔ دونوں سال موسم اچھا رہا۔ اسی دوران ہندوستان میں جنوب مغربی مون سون ہلکا رہا۔ لیکن کشمیر میں بڑی خشک سالی رہی۔ نچلو میں جولائی اور اگست کے دوران تقریباً بالکل بارش نہیں پڑی اور مشرقی قراقرم میں دونوں سال موسم سازگار رہا۔''

فینی بولاک ورک مین کی سیاچن مہم کے ۲۲ سال بعد ۱۹۳۴ء میں G.O.Dryen Furth کی بین الاقوامی کوہ پیا مہم نے بلتورو گلیشیئر کی جانب سے سیا کنگری کو سر کیا۔

تقسیمِ ملک کے بعد ۱۹۵۷ء سے ۱۹۸۴ء تک بیس سے زائد غیر ملکی کوہ پیماؤں نے حکومتِ پاکستان کی اجازت سے سیاچن گلیشیئر کے علاقے میں قراقرم درہ کے جنوب میں واقع مشہور چوٹیوں کو سر کیا یا ان چوٹیوں پر پہنچنے کی کوشش کی۔ اس اجمال کی

تفصیل یہ ہے:

۱۹۵۷ء میں برطانوی امپیریل کالج کی جماعت نے Eric Shipton کی قیادت میں بلافون لا کو عبور کے سیاچن گلیشیئر، تیرم شہر گلیشیئر اور کے۔۱۲ چوٹیوں کا مطالعاتی دورہ کیا۔

۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۲ء میں دو آسٹریلوی کوہ پیما جماعتوں نے سیا کنگری کو سر کیا۔ ان دو سالوں میں پاکستان جاپان سولترو مہم سمیت تین جاپانی کوہ پیما جماعتیں سیاچن گلیشیئر علاقے میں گئیں۔ پاک۔ جاپان مشترکہ مہم نے سلتورو کنگری کو پہلی دفعہ سر کیا۔

۱۹۷۵ء میں Swiss Alres Tour نے سیا کنگری اور ۱۹۷۸ء میں مغربی جرمنی کی گلیشیئر ٹریکینگ پارٹی نے بلافون، سیاچن اور کندوس کی ٹریکینگ کی۔

۱۹۷۹ء میں جاپان کی تین ٹیموں نے سیاچن علاقے میں کئی چوٹیاں سر کیں۔

۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۱ء میں امریکی، مغربی جرمنی اور جاپانی کوہ پیما ٹیموں نے علاقے کا دورہ کیا۔ امریکی سکیٹینگ اور ٹریکینگ ٹیم نے بلافون لا اور بولوفونڈ گلیشر پر سکیٹینگ اور ٹریکینگ کی۔ جاپان کوبے یونیورسٹی کی ٹریکینگ پارٹی نے بلافون اور بولوفونڈ گلیشر کی ٹریکینگ کی۔

اپریل ۱۹۸۴ء میں حکومتِ پاکستان نے جاپان ہری سا کی یونیورسٹی کی کوہ پیما جماعت کو ۷۳۸۵ میٹر بلند ریمو چوٹی کو سر کرنے کی اجازت دی تھی۔ اسی سال اسٹرین آکاریکس ایکسپیڈیشن کو یکم جون سے ۷۴۶۸ میٹر بلند کے۔۱۲ چوٹی سر کرنے کی اجازت دی تھی۔ لیکن اپریل میں بلافون اور سیالا پر ہندوستانی فوج کی موجودگی سے مذکورہ مہمات سرانجام نہیں دے پائیں۔

ان واردات کے اسباب اور عوامل سمجھنے کے لئے ہمیں چند سال پیچھے مڑنا ہوگا اور حالات کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ ۱۹۷۰ء میں ہندوستان کے High ALtitude (HAWS)

Warfare School کے افسر کرنل نریندر کمار نے کوہ پیمائی کے ایک جریدہ میں سیاچن علاقہ میں پاکستانی حکومت کی اجازت پر آئی ایک کوہ پیامہم سے متعلق پڑھا۔ چنانچہ ۱۹۷۸ء میں کرنل نریندر کمار کی قیادت میں ایک کوہ پیا ٹیم سیاچن گلیشر پہنچی۔ اس ٹیم میں ستبدن کلون نام کا ایک شرپا کوہ پیا بھی تھا جس کو غالباً بطور گائیڈ لیا گیا تھا۔ ٹیم اگست سے اکتوبر تک علاقے میں رہی۔ اخباری رپورٹ کے مطابق اس نے ۲۴۶۳۱ ہزار فٹ بلند تریم کنگری سمیت کئی چوٹیاں سر کیں اور گلیشر کی پیمائش کی۔ اس مہم کی روداد ۱۹۷۹-۸۰ کے ہمالین جرنل اور illustrated weakly of India کے ۲۳۔۳۱ مئی ۱۹۷۹ء کے شمارے میں چھپی۔ ٹائمز آف انڈیا کی ایک خبر کے مطابق پاکستانیوں نے علاقے میں ہندوستانی برانڈ کے سگریٹ کا مروڑا ہوا ایک خالی پیکٹ دیکھا۔

اس سے پہلے پاکستان اپنے نقشے میں پورے سیاچن اور قرب و جوار کے گلیشیروں کو اپنا علاقہ دکھاتا رہا تھا۔ جسے ہندوستان نے Cartographic Aggresson نقشہ کشی کی جارحیت، سے محمول کیا۔

امریکہ نے بھی ۱۹۸۰ء کی دہائی میں اپنے نقشوں میں سیاچن گلیشر کو پاکستان کی قلمرو میں دکھایا تھا۔

ستمبر ۱۹۸۰ء میں کرنل نریندر کمار کی قیادت میں ۱۴، افسروں اور ۴۰ جوانوں پر مشتمل ایک جماعت سیاچن علاقے میں پہنچی۔ یہ افسر اور جوان ہائی الٹی ٹیوڈ وار فیر سکول کے تربیت یافتہ تھے۔ یہ جماعت سیا اور سالتورو کنگری تک گئی۔ کرنل نریندر کمار نے ہمالین جرنل میں لکھا تھا کہ اس کوہ پیا جماعت کو فضائیہ کی مدد حاصل تھی۔

ہندوستان نے الزام لگایا کہ ۱۹۸۰ء میں تیرم کنگری کی مہم پر جانے والی ٹیم کی ٹوہ میں پاکستان کے ایک سپر جیٹ نے چار مرتبہ پرواز کی۔

اسی سال ستمبر میں بریگیڈیر کے۔ این۔ تھپڑانی کی سرکردگی میں ایک ہندوستانی

کوہ پیما ٹیم نے سیاچن علاقے میں ۲۴۳۹۰ فٹ بلند Apsarsas چوٹی سر کی۔

پاکستانی میڈیا (ذرائع ابلاغ) کے مطابق مئی ۱۹۸۱ء میں چند ہندوستانی فوجی اور سول افراد وادی سلتورو میں گونما اور چولونگ گاؤں تک آئے تھے۔ سکردو کے سپرانٹنڈنٹ پولیس نے اگست ۱۹۸۱ء میں ان علاقوں کا دورہ کیا اور مقامی لوگوں سے ہندوستانی فوجیوں کے چھوڑے ہوئے لداخ سکاؤٹس کے جوانوں کی ٹوپی کے بیج (Hadge) اور کچھ ہندوستانی کرنسی نوٹ حاصل کئے۔

۱۹ر مارچ ۱۹۸۲ء کو پاکستانی وزارت خارجہ نے اسلام آباد میں ہندوستانی سفارت خانہ اور دہلی میں وزارتِ خارجہ کو تحریری طور الزام لگایا کہ ہندوستان نے سرحدی خلاف ورزیاں کی ہیں۔

اسی اثناء میں ٹائم میگزین کے مطابق پاکستانی حکومت نے لندن کی ایک فرم کو کوہ پیمائی کے ملبوسات کے لئے حکم دیا۔ یہ فرم ہندوستان کو بھی ایسے ملبوسات فراہم کرتی تھی۔ ہندوستان کو خدشہ ہوا کہ پاکستان سیاچن علاقے میں اپنی پوزیشن مضبوط بنا رہا ہے جبکہ ہندوستان بھی سیاچن پر اپنا حق جتا رہا تھا۔

اگست ۱۹۸۳ء میں سیاچن گلیشر کے علاقے میں لداخ سکاؤٹس کے جوانوں کے ایک دستے کا پاکستانی فوج کے ایک گشتی دستے سے تقریباً آمنا سامنا ہو، تاہم گولیوں کا تبادلہ نہیں ہوا۔

یہ وارداتیں سیاچن کے لئے دونوں ملکوں کے درمیان تصادم اور ایک پیچیدہ تنازعہ کا پیش خیمہ تھی۔ چنانچہ اپریل ۱۹۸۴ء میں ہندوستان نے "آپریشن میگھ دوت" کے نام سے بولوفون لا اور سیالا پر لداخ سکاؤٹس اور کماؤں رجمنٹ کے جوان اتارے۔ پاکستان کے مطابق جب اس کی فضائیہ کے ایک ہیلی کاپٹر نے ان دروں کے اوپر پرواز کی تو اس پر گولیاں چلائیں۔

ہندوستان نے سیالا پر ۱۶؍اپریل ۱۹۸۴ء کو اور بیلافون لا پر اس کے دو روز بعد ۱۸ اپریل کو اپنی فوجیں اتاری تھیں جبکہ پاکستان کا کہنا ہے کہ ان دونوں دروں پر ۱۵؍اپریل کو فوجیں اتاریں۔

ایک خاتون صحافی Myria Macdonald نے اپنی کتاب Height of Madness میں لکھا ہے کہ ہندوستان کا مقصد سیاچن پر دعویٰ کرنا، طاقت کا مظاہرہ اور سردیوں سے پہلے لوٹنا تھا۔ پاکستان نے یہ سوچا کہ ہندوستان کا مقصد اس سے بڑا ہوگا۔

تب سے سیاچن اور اس کے قرب و جوار کے گلیشیئروں پر کوہ پیمائی اور ٹریکنگ بند ہوئی ہے۔ پیٹر ہلادی نے اپنی کتاب Rimo Mountain of silk Rout (مطبوعہ ۱۹۸۸ء) میں لکھا ہے کہ ۱۹۸۸ء میں ہند۔ امریکہ ایک مشترکہ کوہ پیما جماعت کو پاکستانی چوکی سے فائرنگ کی وجہ سے اپنی مہم کو ادھورا چھوڑنا پڑا۔

سیاچن گلیشیئر پر مورچہ بندی کے بعد دونوں ملکوں کی مشکلات شروع ہوئیں۔ ۱۹۸۴ء تک سکردو کے فوجی ہیڈ کوارٹر سے ۶۵ میل چلپو تک صرف چھوٹی گاڑیوں اور ٹریکٹر ٹرالیوں کے لئے ایک کچی سڑک موجود تھی۔ چلپو سے ۶۰ سے ۷۰ میل دور سلتورو پہاڑی سلسلے کے مختلف دروں تک پہنچنے میں آٹھ نو روز لگتے تھے۔ رسل و رسائل کی ان مشکلات کے پیش نظر چوکیوں اور پیکٹوں کو رسد، کمک، ہتھیار اور گولہ بارود لے جانا کارے دارد والا معاملہ تھا۔

پاکستانی فوجی افسر کرنل محمد ذاکر نے اپنی کتاب "سیاچن گلیشیئر دنیا کا بلند ترین محاذ جنگ" (مطبوعہ ستمبر ۱۹۹۰ء) میں لکھا ہے:-

"ایک باربردار قلی Base Camp (انتظامی کیمپ) سے اگلی چوکی تک بشمول اپنی خوراک زیادہ سے زیادہ ۱۵ کلوگرام وزن اٹھا کر مسلسل ۵ دن گلیشیئر پر چل کر پوسٹ پہنچتا ہے۔ پورے دس دنوں میں ایک پورٹر صرف ۱ کلوگرام وزن اگلی پوسٹ پر پہنچا سکتا

ہے۔ ۱۰ سے ۱۵ فیصد پورٹر بیمار ہوتے تھے۔ ایک پوسٹ پر سال بھر کے لئے تقریباً تین ہزار کلوگرام راشن، ایمونشن وغیرہ مطلوب تھے۔ سولہ ہزار فٹ کی بلندی تک عام ہیلی کاپٹر زیادہ سے زیادہ سو کلوگرام سامان لے سکتا ہے۔ جبکہ ہر پوسٹ پر جلنے والے تیل کے چولھوں کے لئے ہر دو دن بعد ۱۵ کلوگرام وزنی ایک جیری کین مٹی کے تیل کی ضرورت ہوتی ہے۔"

ایک جوان کی مشکلات سے متعلق وہ لکھتا ہے:

"ان بلندیوں پر ایک صحت منداور توانا جوان مشکل سے ۱۵ کلوگرام وزن اٹھا سکتا ہے۔ اس وزن کے ساتھ ہموار سطح پر بھی چلتے ہوئے ہر دس بارہ قدم کے بعد پندرہ بیس سیکنڈ کیلئے رکنا پڑتا ہے۔ پندرہ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر بھوک نہیں لگتی۔ زیادہ مشقت کی وجہ سے انسان آہستہ آہستہ کمزور سے کمزور تر ہوتا جاتا ہے۔"

آگے وہ لکھتا ہے:

"اِگلو (برفانی خیمہ) کی برف وقفے وقفے سے صاف کرنی پڑتی ہے۔ بصورتِ دیگر اگلو برف میں دب جاتی ہے۔ اندر پانی آجاتا ہے۔ سلیپنگ بیگ اور میٹرس گیلے ہو جاتے ہیں۔ سنتری کی ڈیوٹی بڑی سخت ہوتی ہے۔ تیز ہوائیں اڑتی ہوئی برف چہرے اور آنکھوں پر منجمد ہوتی ہیں۔ ایسے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔"

اسی طرح ایک ریٹائرڈ ہندوستانی فوجی افسر بریگیڈیئر راجیو ولیمز اپنی کتاب The Long Road to Siachan (۲۰۱۰ء) میں سیاچن پر معرکہ آرائی کی مشکلات کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

"ہتھیاروں کو گرمانا پڑتا ہے۔ سردی اور گرمی سے بندوق کی نالی کا منہ ٹوٹ جاتا ہے۔ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے میزائل تیزی سے چلتا ہے اور ہدف پر نہیں لگتا ہے۔ مارٹر یخ پگھلنے اور ملنے سے گولے رینج (حد نشانہ) سے آگے گرتے ہیں۔ یہی صورت حال توپ کے ساتھ بھی درپیش ہے۔ پلیٹ فارم پختہ نہ ہونے کے سبب نشانہ چوک جاتا ہے۔"

لداخ سکاؤٹس کے جوان بتاتے ہیں کہ چار پانچ گولے داغنے کے بعد مارٹر برف میں دھنس جاتے تھے۔ انہوں نے چاول اور آٹے کی بوریوں پر مارٹر رکھ کر گولے داغے تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ برف وباد کی وجہ سے تنبو اور ہٹس کی جگہیں بدلنی پڑتی ہیں۔

رسل ورسائل کی مشکلات کا بریگیڈیئر ولیمز یوں ذکر کرتا ہے:

''اے، ایم۔ آئی ہیلی کاپٹر سولہ ہزار فٹ کی بلندی تک اڑان بھرتا ہے اس سے زیادہ بلندی پر ہلکا چیتا ہیلی کاپٹر جا سکتا ہے۔ یہ بیک وقت دو جوانوں کو لے سکتا ہے جبکہ اونچی چوکی پر ایک ہی جوان کو معہ اس کے ہتھیار لیا جا سکتا ہے۔ اس کے روک سیک یا بیگ کے لئے دوسری اڑان بھرتا ہے۔...... ۱۰۵ ملی میٹر توپ کے کل پُرزے کھول کر اوپر لئے جاتے ہیں اور اوپر جوڑا جاتا ہے...... ایم۔ آئی۔ ۲۶ ہیلی کاپٹر زیادہ سامان اور آدمی اٹھاتا ہے اور بیس کیمپ تک ہی جاتا ہے۔ اے این ۳۲ ہیلی کاپٹر گلیشیئروں کے ڈروپینگ زون پر سامان پھینکتا ہے۔''

بریگیڈیئر ولیمز نے ۱۹۸۵ء میں سیاچن کی لڑائی میں حصہ لیا تھا تب وہ میجر تھا۔ وہ سیاچن کے محاذ پر انسانی فضلہ، غلاظت، گلی سڑی سبزیوں وغیرہ کی سنگینی کا تذکرہ کرتا ہے۔ جو ماحول کی آلودگی کے علاوہ گلیشیئر میں کثافت پیدا کر رہے ہیں اور جوانوں کی صحت پر اثر انداز ہو رہے ہیں نیز دیکھنے میں بھی برا لگتے ہیں۔ انہوں نے ایک کیمیاوی مادے کا ذکر کیا ہے جو فضلے کو کھاد میں تبدیل کرتا ہے۔

یہی عوامل ہیں جن سے دونوں ملکوں کو سیاچن پر روزانہ کروڑوں روپے خرچ کرنا پڑ رہا ہے۔ بریگیڈیئر ویلمز نے ایک افسر، ایک جونیئر افسر اور سات جوانوں پر مشتمل ایک دستے کا ذکر کیا ہے۔ جس کو پاکستان کی ۲۱۱۰۳ فٹ بلند دیکھ بال چوکی (O.P.) کی ٹوہ لینے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ اس چھوٹے سے گشتی دستے کو بٹالین ہیڈکوارٹر، کمار، سے ایک بلند چوکی 'صنم' تک لانے کے لئے ہیلی کاپٹر نے ۳۵ مرتبہ پرواز بھری جبکہ چیتا

ہیلی کاپٹر نے ان کی خوراک پہنچانے کے لئے اڑان بھری۔ بلندی اور آکسیجن کی کمی کی وجہ سے ہوا میں ایک ہیلی کاپٹر صرف ایک جوان اور اس کا ہتھیار لے سکتا ہے۔ دوسرا ہیلی کاپٹر دو جوانوں کے فاضل کپڑے لیتا ہے۔ دو جوانوں کو چوکی تک لینے کے لئے ایک ہیلی کاپٹر کو کم سے کم تین یا چار مرتبہ اڑان بھرنا پڑتا ہے۔ ایک اور ہیلی کاپٹر ان کا راشن اور دوسری ضروریات لینا ہے۔ بریگیڈیئر ولیمز لکھتا ہے کہ یہ جاننا باعث دلچسپ ہوگا کہ ہیلی کاپٹر کی ہر اڑان پر خزانۂ عامرہ ہے ۳۵ ہزار روپے کا بوجھ پڑتا ہے جو ۱۹۸۷ء میں ایک بڑی رقم تھی۔

دیکھ بھال چوکی کی طرف جاتے ہوئے گشتی دستے کے سارے جوان اور افسر مارے گئے۔ لیفٹیننٹ راجیو پانڈے ان کی قیادت کر رہا تھا۔ پاکستان فوج نے اس چوکی کا نام، قائد مشاہدہ چوکی، رکھا تھا۔ بعد میں آپریشن راجیو پانڈے کے نام سے قائد چوکی پر حملہ کیا۔ ایک میجر کی سرکردگی میں ۵۰ جوانوں نے اس میں حصہ لیا۔ تین دن اور تین رات کی سخت لڑائی کے بعد اس پر قبضہ کیا۔ قائد چوکی کو تسخیر کرنے سے پہلے ہیلی کاپٹروں نے دس دنوں کے دوران ۲۰۰ مرتبہ پرواز کی، قائد مشاہدہ چوکی، پر بمشکل ایک اگلو اور دو مورچوں کے لئے جگہ تھی اور اس پر چار جوان اور ایک جے۔ سی۔ او تعینات تھا۔ جب ہمارے جوان چوٹی پر پہنچے تو صرف دو زخمی جوانوں نے مزاحمت کی اور دست بدست لڑائی میں مارے گئے۔ نائب صوبیدار بانا سنگھ کو، پرم ویر چکر، سے نوازا گیا جس نے آخری مرحلے پر قیادت کی تھی۔ چوکی کا نام بدل کر بانا دیکھ بال چوکی رکھا۔ پاکستان حکومت نے قائد چوکی کے کمانڈر نائب صوبیدار عطا محمد کو بعد از مرگ، ستارہ جرأت عطا کیا۔ گلیشیئر کی لڑائی عام لڑائیوں سے قدرے مختلف ہوتی ہے فریقین کے فوجی ہر چوٹی پر اپنا جھنڈا گاڑنے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ لداخ سکاوٹ کے ایک جوان نے مجھے بتایا۔ ایک روز ان کی چوکی کے سامنے کی چوکی پر کئی ہیلی کاپٹر اترے۔ ان میں ایک ہیلی کاپٹر ان کی

پوسٹ پراتر اا اور پائلٹ نے باہر آکر اطلاع دی کہ گلیشیئر کے ایک طرف سے دشمن کے سپاہی ایک چوٹی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ پلاٹون کو فوری طور اس طرف جانے کا حکم ملا، لداخ سکاؤٹس، کے صوبیدار عبدالقادر کی سرکردگی میں پلاٹون روانہ ہوا۔ شام کے چھ بجے تھے۔ فروری کی ۲۱ تاریخ اور سن ۱۹۸۵ء تھا۔ منفی ۳۲ ڈگری میں برف کے جھکڑ سہتے اور کھائیوں سے بچتے ہوئے ۱۲ گھنٹے چلنے کے بعد صبح کے پانچ بجے ان کا پاکستانی فوجی دستہ سے سامنا ہوا جنہوں نے مارٹروں اور مشین گنوئی سے فائر کیے۔ سکاؤٹس کے جوانوں نے ایک ٹیلے نما یخ کی آڑ میں پناہ لی اور کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔

بعد میں ۱۸ ہزار فٹ کی بلندی پر لداخ سکاؤٹس کے جوانوں نے پاکستانی دستہ کی پیش قدمی روک لی اور جوابی حملہ کر کے پسپا کیا۔ سکاؤٹس کے ایک جوان چھرنگ موتوپ کو، اشوک چکرا، اور صوبیدار عبدالقادر کو 'سینا میڈل' سے نوازا گیا۔ کئی اور جوانوں کو میڈل ملے۔

کئی مرتبہ دشمن کی پیش قدمی روکنے یا چوٹی تک پہنچنے کے لئے فریقین کو کئی اطراف سے گولہ باری کی ضرورت پڑتی ہے۔ بریگیڈیئر راجیو ولیمز رقم طراز ہے:

عام طور پر ایک توپ سے ایک منٹ میں ایک سے دو گولے داغے جاتے ہیں۔ بیس کیمپ پر ۱۳۰ میلی میٹر ایک توپ سے ہر منٹ تقریباً ۴ سے ۵ گولے داغے جا رہے تھے۔ توپ کی نالی اتنی گرم ہوگئی کہ یہ پھٹ گئی اور توپچی ہلاک ہوئے۔ ولیمز لکھتا ہے کہ یہ جاننا باعثِ دلچسپ ہوگا کہ ہیلی کاپٹر کی ہر اڑان پر خزانہ عامرہ ہے ۳۵ ہزار روپے کا بوجھ پڑتا ہے جو ۱۹۸۷ء میں ایک بڑی رقم تھی۔

سیاچن کی صورتِ حال نے دونوں ملکوں کو رسل و رسائل میں بہتری لانے کے لئے مجبور کیا۔ ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۶ء کے دوران پاکستان کی جانب بلافون، گیانگ، چولونگ اور کندوس کی وادیوں میں گلیشیروں کے دہانوں تک چھوٹی چھوٹی گاڑیوں کی آمد رفت کے

لئے سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ اس کے دو سال بعد ۱۹۸۸ء میں سڑکوں کو چوڑا بنایا گیا۔ جس سے ڈیڑھ ٹن وزنی گاڑیاں گلیشیروں کے دہانے تک جانے کے قابل ہوئیں۔ سنہ ۱۹۹۰ء میں ہلکی گاڑیاں اگلی چوکیوں سے چند میل کے فاصلے تک آنے جانے لگیں۔ تب سے سڑکوں کو اور توسیع دی گئی ہے۔ اسی طرح ہندوستان نے بھی بیس کیمپ تک پختہ سڑک بنائی ہے۔ کہتے ہیں بلتستان کی طرف سے اگلی چوکیوں تک رسائی مقابلتاً آسان ہے۔ لداخ کی وادی نوبراہ کی طرف سے بیس کیمپ سے گلیشیر تک پہنچنے کے لئے یکے بعد دیگرے چار کیمپ پڑتے ہیں چوتھے کیمپ تک پہنچتے ہوئے لگ بھگ دس گھنٹے لگتے ہیں۔ آخری کیمپ سے چوٹی تک چڑھنے میں تین ساڑے تین گھنٹے لگتے ہیں۔ بیس کیمپ سے گلیشیر کی چوٹی تک ۷۰ کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ برف اور یخ بیس کیمپ سے ہی شروع ہوتے ہیں۔ انسان دنیا سے کٹ جاتا ہے اور ایک ایسی دنیا میں پہنچتا ہے جہاں چاروں طرف برف ہی برف ہے۔ ایسے ماحول میں انسان بوریت ہی محسوس نہیں کرتا بلکہ نفسیاتی کوفت (depression) کا بھی شکار ہوتا ہے۔ اسی لئے سیاچن کے محاذ پر کسی جوان کو تین یا چار مہینے سے زیادہ نہیں رکھا جاتا ہے۔ کسی کسی بلند چوکی سے صرف چار ہفتے کے بعد منتقل کیا جاتا ہے۔ سیاچن گلیشیر کی جنگ کا ایک مثبت پہلو بھی ہے۔ ہزاروں لوگوں کو روزگار فراہم ہوا ہے۔ لداخ میں فوجی ساز و سامان (رسد) وغیرہ کے نقل و حمل کے لئے ہزاروں لوگوں نے ٹرک خریدے ہیں جن سے مالی طور مالکان کو فائدہ پہنچا ہے اور ڈرائیوروں کو روزگار ملا ہے۔ مشقت خیز اور صبر آزما کام کے پیشِ نظر بار بردار قلیوں کو جگہ کی نوعیت کے مطابق ماہانہ ۲۵ ہزار روپے سے ۳۵ ہزار روپے کا مشاہرہ ملتا ہے۔

بلتستان میں گلیشیروں کے نزدیک بلافون اور کندوس وادیوں کے گاؤں کے لوگوں کو بڑا فائدہ ملا ہے۔ اپریل سنہ ۱۹۸۴ء تک یہ بلتستان کے دوسرے علاقوں سے لگ بھگ کٹے ہوئے تھے زندگی کی ضروریات کی چیزیں جیسے کپڑا، چائے، مٹی کا تیل، نمک

وغیرہ خریدنے کے لئے دشوار گزار پہاڑی تنگ راستوں سے ۳۰ میل دور چیلو جانا پڑتا تھا، جہاں دریائے شیوق، دریائے کندوس اور دوسرے چھوٹے بڑے ندی نالے پڑتے تھے جنہیں پار کرنا تکلیف دہ اور جان جوکھوں کا کام تھا۔ اب ان گاؤں کا پختہ سڑک سے رابطہ قائم ہوا ہے۔ ان گاؤں کے لوگ پہلے بڑے غریب تھے۔ یہاں کاشت کاری کے لئے زمین محدود ہے اور سال میں ایک ہی فصل ملتی ہے۔ بلتستان کے دوسرے علاقوں کی طرح میوے پیدا نہیں ہوتے۔ اس لئے یہ لوگ محنت مزدوری کے لئے سکردو جاتے تھے۔ اب ان کو اپنے علاقے میں وسیلہ معاش نکلا ہے۔ سکردو اور چیلو سے بھی لوگ کام کرنے کے لئے اب سولتورو اور کندوس آتے ہیں۔

۱۹۶۲ء کی ہند، چین لڑائی کے بعد ہندوستان نے ملک کے دفاع کے لئے پہاڑی اور گلیشائی لڑائی کی ٹریننگ کی طرف دھیان دیا اور پہاڑی ڈویژن بنایا لیکن سیاچن نے نئے تجربات اور ضروریات سے آگاہ کیا۔ سیاچن کے بیس کیمپ میں Siachan Battle School قائم کیا جہاں گلیشیئر پر رہنے، چلنے، چڑھنے اور لڑنے کے گُر سکھائے جاتے ہیں۔ جوانوں کو روک سیک اٹھا کر یخ کی عمودی دیوار پر چڑھنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے لئے یخ کاٹنے کی کلہاڑی اور گنڈے کا ہونا لازمی ہے۔ یخ کے شگاف سے ہر لمحہ کھائی میں گرنے کا اندیشہ رہتا ہے فوجی پانچ سے چھ کے گروپ میں ایک دوسرے سے رسی سے باندھے چلتے ہیں تاکہ کسی کے گرنے کی صورت میں اس سے سہارا دے کر نکالا جاسکے۔ کھائی پار کرنے کیلئے اس پر سیڑھی ڈالی جاتی ہے۔ ٹریننگ کے دوران جوانوں کو اِگلو میں رکھا جاتا ہے تاکہ چوکی پر اِگلو میں رہنے کی عادت پڑے۔

سونمرگ کے High Altitude Warfare School میں بھی ٹریننگ دی جاتی ہے اور Sledge (برف گاڑی) پر بھاری سامان ڈال کر انہیں چلانا اور Ski سکھائی جاتی ہے۔

گلیشیئر پر زندہ رہنے کی ٹریننگ سب سے مشکل ہے۔ ایک سپاہی کو برف کی

کھائی میں ڈالا جاتا ہے اور کم سے کم پانچ منٹ رکھا جاتا ہے۔ سپاہی سردی سے منجمد سا محسوس کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ اب مرا، اب مرا۔ پھر ایک ہفتہ کے لئے پیٹھ پر اشن اٹھائے زوجیلا کے پاس مچوئی، کولوہو اور دوسرے گلیشیئروں پر چلنا ہوتا ہے۔ بقا کے لئے نفسیاتی طور بردباری، حوصلہ اور استقامت کی تربیت ضروری ہے۔ اس کے بعد بیس کیمپ پر مزید لمبی ٹریننگ کی ضرورت نہیں پرتی ہے۔

ایک سپاہی کی کٹ (Kit) میں عمر عیار کی زنبیل کی طرح بلندی اور گلیشیئر پر کام آنے والے ۱۲۰ چھوٹے بڑے آلات اور چیزیں ہوتی ہیں جن میں دو قسموں کے آکسیجن کینٹنسر، تین قسموں کی یخ کی کلہاڑیاں، تین قسموں کے نقاب، چار قسموں کی رسیاں، پانچ قسموں کے اٹھاؤ اور دوسرے خیمے، چھ قسموں کے دستانے، چھ قسموں کی جرابیں، سات قسموں کے جاکیٹ اور پاجامے اور پنتیس قسموں کی کھونٹیاں اور یکے وغیرہ شامل ہیں۔ ۱۹۸۹ء سے دونوں ملکوں کے درمیان سیاچن گلیشیئر کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے بات چیت ہوئی ہے۔ فریقین نے مختلف تجویزیں رکھی ہیں لیکن کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا ہے۔

فلیگ میٹنگوں میں ہندوستان نے NJ۹۸۰۴۲۰ پوئنٹ سے آگے کوہِ سلتورو پر دونوں فوجوں کی پوزیشنوں کی بنیاد پر لائن آف کنٹرول کی نشان دہی پر زور دیا۔ جبکہ پاکستان نے یہ مطالبہ کیا کہ سب سے پہلے دونوں ملکوں کی فوجوں کو ۱۹۷۲ء سے پہلے کی پوزیشنوں پر لوٹنا چاہیئے اور پھر لائن آف کنٹرول کی نشان دہی کی بات کی جاسکتی ہے۔ جسے ہندوستان نے قبول نہیں کیا۔

شملہ معاہدہ کے تحت ۱۹۷۲ء سے جنگ بندی لائن آف کنٹرول میں بدل گئی۔

سیکریٹریوں کی سطح کی میٹنگ میں ہندوستان نے سیاچن کو No Man's Land قرار دینے کی تجویز رکھی جو پاکستان کو منظور نہیں تھا۔ ایک مرحلے پر ہندستان نے سیاچن کو Demilitarized Zone یعنی مکمل طور فوجیں ہٹانے کی تجویز پیش کی۔ پاکستان نے

اسے قبول نہیں کیا۔ پاکستان کے مطابق اس فارمولا کے تحت پاکستان کی فوج چپلو سے آگے نہیں جاسکتی تھی۔

ایک امریکی تجزیہ کار Robert Wirsing نے ۱۹۸۹ء میں The Siachan Dispute کے عنوان سے راولپنڈی میں دونوں ملکوں کے درمیان سیاچن پر ہوئی پانچویں دور کی بات چیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے مطابق ہندوستان نے ذیل کی چھ تجاویز پیش کی تھیں:۔

۱۔ پاکستان نقشہ کشی کی جارحیت بند کردے۔

۲۔ سیاچن گلیشئر پر غیر فوجی علاقے کا تعین کرے۔

۳۔ موجودہ پوزیشن پر نقشوں کا تبادلہ۔

۴۔ زمینی حقائق کی بنیاد پر پوئنٹ NJ۹۸۴۲ سے شمال کی طرف چین کی سرحد تک سرحدی حد بندی۔

۵۔ مستقبل میں بطورِ آخری راستہ فوجی کارروائی کے لئے وجوہات کا تعین۔

۶۔ فریقین کی باہمی قبولیت کی بنیاد پر فوجوں کی دوبارہ تعیناتی۔

پاکستان نے دو تجاویز رکھیں۔

۱۔ ۱۹۷۱ء سے پہلے کی جنگ بندی کے مقامات پر دونوں ملکوں کی فوجوں کی واپسی۔

۲۔ اسی کے مطابق سرحدوں کی حد بندی

اگرچہ دونوں میں اختلافات تھے تاہم پاکستان کے خارجہ سیکریٹری ہمایوں خان نے اعلان کیا تھا کہ سیاچن پر فریقین میں تصفیہ ہوا ہے اور اخباری خبر کے مطابق ہندوستان کے خارجہ سیکریٹری ایس۔ کے۔ سنگھ نے اس کی تصدیق کی تھی۔ لیکن ہندوستان کی وزارتِ خارجہ نے فوری طور اسی روز اس کی تردید کی۔

نومبر ۱۹۹۲ء میں نئی دہلی میں منعقدہ میٹنگ میں ایک اور مرتبہ سیاچن کا مسئلہ حل ہوتا ہوا نظر آرہا تھا۔ فریقین نے غالباً یہ مان لیا تھا کہ فوجیں اپنی پوزیشنوں سے ہٹ جائیں گی اور ایک مشترکہ کمیشن بعد میں سرحدوں کی نشان دہی کرے گا لیکن اس پر عمل نہیں ہوا اور معاملہ ۲ سال سے جوں کا توں لٹکا ہے۔

ہندوستان کے دفاعی ادارہ کا کہنا ہے کہ سیاچن گلیشیئر پر ہندوستان کی فوجی پوزیشن بہتر ہے۔ اس لئے اس کو اسے دستبردار نہیں ہونا چاہئے۔ ہندوستان اس تشویش کا بھی اظہار کرتا ہے کہ کہیں ۱۹۹۹ء کی طرح پاکستان کرگل کی طرح دراندازی سے سیاچن کی برفانی چوٹیوں پر قبضہ نہ کرے۔ پاکستان ہندوستان پر الزام لگاتا ہے کہ اس نے اس پر ایک فضول جنگ تھوپی ہے۔

دونوں حکومتیں اپنے موقف پر قائم ہیں۔ گیھاری کے سانحہ کے بعد پاکستان کے بری فوج کے سربراہ جرنیل پرویز کیانی نے بیان دیا تھا کہ دونوں ملکوں کو سیاچن کا مسئلہ حل کرنا چاہیئے لیکن اس کے فوراً بعد حکومت پاکستان نے اس ضمن میں اپنے موقف میں کسی تبدیلی سے انکار کیا ہے۔

کئی دفعہ دفاعی تجزیہ کاروں اور صحافیوں نے لکھا کہ جنگی اور دفاعی نقطۂ نظر سے سیاچن گلیشیئر کی کوئی اہمیت نہیں۔ ایک صحافی ارون چکو نے ۲ جولائی ۱۹۸۹ء کے انڈین ایکسپریس کی اشاعت میں ایک سینئر فوجی افسر کا حوالہ دیتا ہوا لکھا ہے:

"۱۹۸۴ء میں فوجی ملازمت سے ریٹائر ہونے والے چند اعلی سینئر افسروں نے صرف اپنی ذاتی حیثیت منوانے اور کچھ کر دکھانے کے شوق میں ہندوستانی حکومت کو سیاچن گلیشیئر میں فوجی کاروائی کا مشورہ دیا تھا۔ اصل میں ایسی فوجی کارروائی کا قطعاً کوئی جواز نہیں تھا۔"

واشنگٹن میں تعینات جنوبی ایشیا کے ایک معروف تجزیہ کار Stephen

Cohen نے سیاچن کی جنگ کو دو گنجوں کے درمیان ایک کنگھا کے لئے لڑائی بتایا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ ''سیاچن فوجی زاویہ نگاہ سے اہم نہیں ہے۔ ہندوستانی اور پاکستانی فوجیں وہاں محض نفسیاتی وجوہات پر موجود ہیں اور ایک دوسرے کی قوتِ ارادی کو آزما رہی ہیں۔''

Myria Macdonald اپنی کتاب Height of Madness (دیوانگی کی انتہا) مطبوعہ ۲۰۰۷ء میں لکھتی ہے کہ سیاچن گلیشیئر کی جنگ میں کوئی تُک نہیں ہے جو اس کی کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ وہ پہلے دہلی میں رائٹرز کی افسر اعلیٰ رہی تھی اور بعد میں بی۔بی۔سی کی نامہ نگار کے طور پاکستان اور ہندوستان کے دونوں اطراف سے سیاچن گلیشیئر اور اس پر تعینات فوجوں کی پوزیشن دیکھی تھی اور ان سے بات کی تھی۔

مائیریا میکڈونلڈ گلیشیئر پر جوانوں کو جسمانی طور کمزور، دھوپ کی وجہ سے چہرہ سیاہ برف سے بدن ورم زدہ اور نفسیاتی طور مضطرب پاتی ہے اور لکھتی ہے کہ موسم دونوں کا مشترکہ دشمن ہے جو لڑائی سے زیادہ جان لیتا ہے۔

مائریا سیاچن گلیشیئر پر بلندی کی وجہ سے سوچنے اور مربوط جملے لکھنے سے قاصر محسوس کرتی ہے اور لکھتی ہے کہ بلندی سے حافظہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک ہی واقعہ کے جوانوں کے چشم دید بیان میں فرق پایا جاتا ہے۔

وہ لکھتی ہے سیاچن سے بھوت پریت کے وجود پر یقین آجاتا ہے۔ وہاں موجود افراد وہاں آنے والے اُن سپاہیوں کی بدروحوں کے لئے ایک خالی بستر چھوڑتے یں، جو وہاں مرے ہیں۔

مائیریا کہتی ہے کہ امن کی کسی بھی پہل کا خیر مقدم کرنا چاہیئے اور فوجیوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دیوانگی کی ان بلندیوں سے نیچے اتر آنا چاہیئے۔

ٹائمز آف انڈیا میں ۲۱ر جولائی ۲۰۱۲ء کو ایک صحافی کانتی باجپائی نے ایک کالم میں لکھا ہے:

"جنگی لحاظ سے دنیا میں سیاچن کے لئے کدو کاوش فضول اور بیکار ہے۔ صرف ہندوستان اور پاکستان ہی اس پر سالانہ سینکڑوں کروڑ روپے اور انسانی جانیں ضائع کر سکتے ہیں۔ وزیرِ اعظم کو فوج کو صاف صاف کہنا چاہیئے کہ جنگل نقطۂ نظر سے یہ بالکل واہیات ہے اور اس بے ہودگی پر جوانوں کی جان کا بلیدان بند کرنا چاہیئے۔"

سیاچن گلیشیئر کے تنازعے کو گریٹ گیم کی روشنی میں پرکھنے کی ضرورت ہے جس نے روسی اور برطانوی ہند کو جنگ کے دہانے پر لا یا۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں روس کی توسیع پسند پالیسی سے برطانوی ہند کو بڑی تشویش ہوئی۔ سینٹرل ایشیاء کی آزاد اور خود مختار ریاستوں پر قابض ہونے کے بعد روس پامیر پہنچا جہاں سے برصغیر ہند کی سرحد قریب تھی۔ برطانوی ہند کی حکومت نے پامیر چینی یا مشرقی ترکستان اور تبّت جاسوس، سفارت کار اور سروے کرنے والے لیجئے تاکہ روس کی توسیع پسند پالیسی سے برِ صغیر کو محفوظ رکھے۔ تاریخ میں اس کو گریٹ گیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی سلسلے میں ۱۸۶۲ء میں برطانوی ہند کے خفیہ محکمے کا ایک افسر ٹی۔ جی۔ منٹگمری لداخ آیا اور ۱۸۶۵ء میں اس کی نگرانی میں لداخ اور چینی ترکستان کے درمیان پہاڑی سرحدوں کا سروے ہوا۔ اس نے ۱۸۶۹ء میں لیہہ سے ایک پنجابی منشی محمد حمید کو جاسوسی اور خفیہ طور سروے کرنے کے لئے آلات کے ساتھ چینی ترکستان بھیجا۔ ۱۸۷۳ء میں پنڈت نین سنگھ کو اسی مقصد کے لئے لیہہ سے تبت کی راجِ دھانی لہاسہ روانہ کیا۔ ان سے پہلے ایک انگریز ولیم جالنسن نے چینی ترکستان کا دورہ کیا تھا۔

انگریز افسر ڈوگلس فورسیتھ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۳ء میں سفارتی مشن اور جاسوسی پر چینی ترکستان روانہ ہوا۔ ۱۸۷۳ء میں اس کے ہمراہ متعدد سول اور فوجی افسران اور ارکانِ عملہ تھا۔ اسی سال روسی فوجی متحدہ ہندوستان کی سرحد کے قریب پامیر تک پہنچی تھی۔ فورسیتھ نے حکومت کو رپوٹ دی کہ روس پامیر پر حملہ کرے گا اور پارا کھیلی اور

ایلش کومان دروں کواپنے قبضے میں لے گا جس سے چترال، گلگت اور پاسین کو خطرہ ہوگا۔ پنجاب پہنچنے سے پہلے روسی فوج کولداخ سے گزرنا پڑے گا۔

ایک اور انگریز J.Biddulaph نے فورسیتھ کے خدشے کی توثیق کی۔

لداخ میں تعینات انگریز جوئنٹ کمشنر اور ایک انگریز افسر ہیورڈ نے حکومت کو رپورٹ دی کہ لیہہ کے شمال مشرق میں واقع ۱۸۰۰۰ فٹ بلند درہ چنگ لونگ حملہ آوروں کو لداخ آنے کے لئے چور دروازہ کا کام دے گا۔ اس لئے اس درہ پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

لیہہ میں تعینات دو برٹش جوائنٹ کمشنر نے ایلی آس (Ney Elias) اور کپتان ایچ رمزے نے حکومت کو مشورہ دیا کہ قراقرم سے شہید ولہ تک راستہ نہیں بنانا چاہیئے تا کہ قراقرم یا چنگ چھنمو سے لداخ آنے کے راستے روسی جارحیت کے خلاف رکاوٹ بنیں۔ ان کی یہ دلیل تھی کہ راستہ بنانے کی صورت میں حملہ آور کو نقل وحرکت میں آسانی ہوگی۔ شہید ولہ لیہہ سے ۱۷۰ میل کے فاصلے پر لیہہ۔ چینی ترکستان کے تجارتی راستے پر واقع ہے۔

Ney Elias نے شہید ولہ اور کیون لین کے درمیان No Man;s Land پر قبضہ کرنے کا مشورہ دیا۔ تاہم ایک اور انگریز افسر سر ہنری رالنسن نے لکھا کہ قراقرم درے کو عبور کر کے حملہ کرنا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔

۱۸۸۵ء میں پھر روسی فوج کی پیش قدمی کی اطلاع ملی۔ خفیہ رپورٹ کے مطابق اس کی منزل لیہہ تھی۔ برطانوی ہند حکومت نے یکے بعد دیگرے جاسوسی مہمات بھیجیں۔ ۱۸۸۸ء ینگ ہاسبنڈ، ۱۸۹۱۔۹۲ء میں بوور ۱۹۲۱ء میں لارڈ ڈینمور اور ۱۸۹۶ء میں ریلے اور ملکولم کو صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے پامیر، تبت اور سینٹرل ایشیا روانہ کئے۔ ان میں اکثر فوجی افسر تھے۔

اس تمہید کا ماحصل یہ ہے کہ گریٹ گیم کے کسی کھلاڑی نے سیاچن گلیشیئر کی

دفاعی افادیت کا تذکرہ تو درکنار، اس کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔ سیاچن گلیشر زوجی لا نہیں ہے جو سردیوں میں لداخ اور کشمیر کے درمیان ناقابلِ عبور دیوار کا کام دیتا ہے اور پرندہ تک پر نہیں مار سکتا۔ گرمیوں میں بھی یہ ایک اہم دفاعی لائن ہے۔

۱۹۴۸ء میں پاکستان کی حمایت پر گلگت سکاؤٹس کرگل کے راستے لیہہ سے ۱۲ میل دور ایک گاؤں ترتوک پہنچے اور دوسرے راستے سے وادی نوبراہ کے گاؤں ہونزیری تک پہنچے۔ انہیں اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر دشوار گزار سیاچن گلیشر عبور کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے علاوہ لداخ کی طرف پیش قدمی کرنے کے کئی اور بھی راستے تھے۔

بلتستان کی طرف سے کرگل اور دراس کے درمیان لیہہ۔ سرینگر قومی شاہراہ کوئی مقامات پر منقطع کیا جاسکتا ہے لیکن پاکستان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے۔ ہندوستان کو مادی، عددی اور فوجی ساز و سامان کے لحاظ سے پاکستان پر برتری حاصل ہے۔ ۱۹۶۵ء کی لڑائی میں بلتستان نے ۳۸۸ مربع میل علاقہ کھویا۔

البتہ اگر چین کا کوئی خطرہ ہے تو ان ہی راستوں سے ہے جن کا اندیشہ گریٹ گیم کے کھلاڑیوں نے کیا ہے۔

کچھ تجزیہ کاروں نے کہا ہے کہ سیاچن پر تسلط رکھنے سے شاہراہ قراقرم پر دباؤ رکھا جاسکتا ہے۔ وہ یہ نظر انداز کرتے ہیں کہ شاہراہِ قراقرم سیاچن گلیشیئر سے لگ بھگ ۲۴۰ کلومیٹر دور ہے۔

فی الحال سیاچن کا تنازعہ لٹکا ہوا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کب حل ہوگا۔ وہ دن برصغیر کے لئے بڑا نیک شگون ہوگا جب گلِ گلاب کا یہ برفانی کوہستان امن کا گہوارہ بنے جس کے رنگ برنگ گلاب کے پھولوں کو دیکھ کر کبھی مسافروں اور مہم جوؤں کا دل کھِل اٹھتا تھا۔

............☆☆☆............
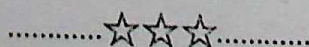
بشیر بھدرواہی

مملکتِ بھدرواہ

"مملکتِ بھدرواہ" ایک پہاڑی ریاست ہونے کی وجہ سے جموں اور کانگڑہ جیسی ہمالیائی ریاستوں میں زمانۂ قدیم سے ہی ایک منفرد اور الگ شناخت رکھتی تھی اور اِس کی ذیلی وادیاں (بھلیس، کیلاڑ، کھسال اور مرمت وغیرہ) بلند و بالا پہاڑی سلسلوں میں گھری رہنے کی وجہ سے اندرونی طور پر تہذیب و تمدّن، زبان اور اپنے رہنے سہنے کے طور طریقوں میں بڑی حد تک تفاوت رکھتی تھیں۔ ایک قدیم شاہراہ کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے، جو ایک طرف اس وادی کو پنجاب، دہلی، امرت سر، بسوہلی اور چمبہ کے علاقوں سے ملاتی تھی تو دوسری طرف نڈوت، بھیلہ جنگلواڑ اور ٹھاٹھری کے علاقہ جات کو مملکتِ کشتواڑ اور وہاں سے وادیٔ کشمیر کے ساتھ ملاتے ہوئے صدیوں تک ایک اہم سیاسی اور تجارتی رابطے کا ذریعہ بنی رہی۔ اِس قدیم مملکت کی دُور افتادہ وادیوں میں حسین ترین وادی "وادیٔ بھدرواہ" ہے جسے عرفِ عام میں "چھوٹا کشمیر" بھی کہا جاتا ہے۔ پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ بھدرواہ کا قدیم راجواڑہ شاہی بہ شمول وادیٔ بھدرواہ، بھلیسہ اور کیلاڑ علاقہ بھلیس سے لے کر رام بن، بٹوت اور مرمت گلیان (کھسال) تک پھیلا ہوا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اِس ریاست کے کچھ حصّے اِس سے الگ کیئے جاتے

رہے اور اِس کا رقبہ سکڑتا گیا۔ موجودہ ڈوڈہ تحصیل کا علاقہ ۱۹۰۹ء لغایت ۱۹۵۲ء، رام بن تحصیل ہی کا ایک حصّہ تھا۔

انگریزوں اور سِکھوں کے درمیان جنگ کے خاتمے کے بعد بیعہ نامۂ امرتسر (۱۸۴۶ء) کے تحت مملکتِ بھدرواہ بھی وادیٔ کشمیر کے ساتھ ساتھ مہاراجہ گلاب سنگھ کی سلطنت میں شامل کی گئی اور صوبہ جموں کے ایک حصّے کے طور پر اِس کا نظم ونسق چلتا رہا۔ جموں سلطنت میں مکمل ادغام کے بعد یہ علاقہ سالہا سال تک ڈوگرہ راجوں مہاراجوں کے تحت جاگیر کی حیثیت میں رہا اور اِس جاگیر پر اُن کا مکمل طور پر ذاتی اِقتدار قائم رہا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے دورِ اقتدار میں کچھ عرصہ یہ علاقہ اُن کی جاگیر کے طور رہنے کے بعد ۱۹۳۰ء میں بہ شمول علاقہ کھسال، بھلیس اور ٹھاٹھری وغیرہ ضلع اُدھم پور کا ایک حصّہ بنایا گیا اور اس کی خودمختارانہ حیثیت ختم ہوگئی۔ اِس ادغام سے پہلے اِس جاگیر کا کل رقبہ پانچ سوتینتیس (۵۳۳) مربع میل تھا جو (۱۹۳۱ء) میں کم ہوکر صرف دوسوتیرہ (۲۱۳) مربع میل رہ گیا۔

بھدرواہ جاگیر کی آبادی

۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق بھدرواہ جاگیر کی کل آبادی ۳۷۵۱۲ نفوس پر مشتمل تھی جس پر ۱۴۴۰ مسلمان، ۲۹۱۳۱ ہندو اور ایک بودھ شامل تھے۔

۱۹۲۱ء میں اِس جاگیر کی کُل آبادی ۳۷۶۱۴ تھی جس میں ۲۲۵۶۲ ہندو، ۱۵۰۴۰ مسلمان، ایک عیسائی اور نو سکھ شامل تھے۔

۱۹۳۱ء میں بھدرواہ جاگیر کو ضلع اُدھم پور میں مدغم کردیا گیا جس وجہ سے اُس سال کے شماریات دستیاب نہیں ہوسکے، البتہ ضلع اُدھم پور کی آبادی ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۰۵۱۳۶ تھی جو ۱۹۲۱ء میں ۲۰۷۶۴۱ اور ۱۹۳۱ء میں ۲۷۳۶۸۴ ہوگئی۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے تحت بھدرواہ تحصیل کا کُل رقبہ ۵۲۶ مربع کلومیٹر دِکھایا

گیا ہے، جب کہ اِس میں ۲۷۶ گاؤں اور ۹۹۸۵ گھرانے آباد تھے۔ تحصیل کی کل آبادی ۶۱۷۸۳ نفوس پر مشتمل تھی جن میں ۳۲۳۱۳ مرد تھے اور ۲۹۴۷۰ خواتین شامل تھیں۔ یاد رہے کہ ۱۹۰۱ء میں بھدرواہ میں دیہات کی تعداد ۱۳۲۳ تھی جو ۱۹۲۳ء میں ۳۰۹ تک جا پہنچی۔

۱۹۸۱ء میں تحصیلِ بھدرواہ (بہ شمول بھلیس اور ٹھاٹھری) کی مجموعی آبادی ۱۰۲۶۲۶ افراد پر مشتمل تھی جن میں ۵۲۷۲۸ مرد تھے اور ۴۹۸۷۸ خواتین تھیں۔ اِس کی کُل دیہاتی آبادی ۹۶۵۵۱ تھی جس میں مردوں کی آبادی ۴۹۶۳۹ تھی اور خواتین کی آبادی ۴۶۹۱۲ تھی۔ شہری سطح پر اِس کی کُل آبادی ۶۰۷۵ تھی جس میں مردوں کی تعداد ۳۱۰۹ تھی اور خواتین کی ۲۹۶۶۔ اُسی سال کی مردم شماری کے مطابق یہ تحصیل ۲۷۷ مواضعات اور ایک قصبے پر مشتمل تھی۔

مذہبی لحاظ سے تحصیل کی آبادی یہ تھی:

مسلم: ۵۴۴۳۶ ہندو: ۴۸۱۴۹ سکھ: ۴۱ میزان: ۱۰۲۶۲۵

وادیٔ بھدرواہ کی قدیم راجدھانی

مملکت بھدرواہ کی قدیم راجدھانی ڈونگا نگر اور اودھا نگر موضع سرتنگل، علاقہ اٹھکھار کے نزدیک واقع تھی، جو موجودہ قصبہ بھدرواہ کے جنوب کی طرف تقریباً اڑھائی کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ قدیم زمانے میں ڈونگا نگر ایک بارونق شہر تھا جو ایک اندازے کے مطابق آٹھویں صدی میں ایک طوفانِ عظیم کی نذر ہوگیا۔ موضع سرتنگل کے نزدیک نالہ ہالون کے کنارے ایک مقام "گرٹھ" کے نام سے ابھی تک مشہور ہے، جہاں موسم گرما میں مقامی اور ضلع بھر کے لوگ اور سکولوں کے طالب علم سیر و تفریح کے لئے آتے ہیں اور یہاں کے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اِس کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ ہی بھدرواہ، بنی، بسوہلی روڈ گزرتی ہے۔

گڑھ سے مراد "قلعہ" ہے۔ غالباً یہاں پر بھی کوئی قلعہ موجود تھا۔ کچھ عرصہ پہلے ایک کھدائی کے دوران اِس مقام پر پرانی عمارات کے کھنڈرات ملنے کی بات بھی عام ہوگئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ پرانے راجاؤں کے محلات اِسی مقام پر واقع تھے۔ وادیٔ بھدرواہ کے کلیدی مقامات پر قلعے تعمیر کئے گئے تھے، جن میں مذکورہ قلعہ کے علاوہ اٹال گڑھ، تیلی گڈھ اور موجودہ قلعہ شامل ہیں۔ اوّل الذکر قلعے بہت پہلے امتدادِ زمانہ کی نذر ہو چکے ہیں جبکہ قصبۂ بھدرواہ کے مغرب کی طرف کوہِ کیلاش کے نشیبی حصّے میں بڑی اُونچائی پر ایک تاریخی قلعہ گھنے جنگلات کے پسِ منظر میں وادیٔ بھدرواہ کے حسن و جمال کو دوبالا کرتے ہوئے اب بھی موجود ہے۔

محلِ وقوع

بھدرواہ کی قدیم مملکت کو جنوب میں واقع چھتر دھار کے درّے کا پہاڑی سلسلہ بلاور اور بسوہلی سے علاحدہ کرتا ہے جس میں کوہِ کیلاش کے درمیان واقع کیلاش کنڈ (جھیل) بھی ہے۔ اِسی پہاڑی سلسلہ کے مغرب بعید میں واقع دودھیٹر نامی دھار اس وادی کو چنہنی اور اُدھم پور کے علاقوں سے الگ کرتی ہے۔ جب کہ اِس کے شمال میں دریائے چناب اور شمال مشرق کی اطراف میں بہنے والی ندی کالنی (جو کئی نالوں کے معاونوں سے یہ نام پاتی ہے) بالترتیب اس کی حدود کا تعین بھدرواہ، ڈوڈہ اور بھدرواہ کشتواڑ کے درمیان کرتے ہیں۔ مشرق کی طرف ڈگانی دھار اِس مملکت کو چمبہ سے علاحدہ کرتی ہے۔

وادیٔ بھدرواہ کے چاروں طرف ہالہ کے ہوئے فلک بوس پہاڑ اور دیو قامت چٹانیں جہاں ایک طرف اس کو ہزاروں سال سے اِردگرد کے راجواڑوں کی جانب سے بار بار ہونے والے حملوں سے بچاتی رہی ہیں، وہاں دوسری طرف جنگلات سے گھرے ہوئے یہ پہاڑ قدرتی صناع کاری کے کمال کا مظہر ہوتے ہوئے

سیاحوں کی دلچسپی کا باعث بنتے آئے ہیں۔ اہلِ شوق اور فطرتی حسن کے شیدائی اِن خوبصورت اور رنگا رنگ معطر پھولوں کے حسن و رعنائی سے اپنے ذوقِ جمال کی تسکین کرتے ہیں۔ یہی پہاڑ اپنے سینوں پر سے رواں دواں پانی کے خزانوں کی نعمتِ خداداد کو بڑی فراخدلی سے بل کھاتے ہوئے ندی نالوں اور نہروں کے ذریعہ کے قرب و جوار میں پھیلے ہوئے زینہ بند کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں اور اُن کو سرسبز و شاداب بنا کر نہ صرف وادی کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں بلکہ یہاں دھان کی مجموعی پیداوار بڑھا کر لوگوں کی خوشحالی کی باعث بھی بنتے ہیں۔ اِس قدیم وادی کے جنگلات کی لکڑی کی برآمدگی کی بدولت صدیوں سے ریاستی خزانے کا بیشتر حصّہ پُر ہوتا رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہاں کی اجتماعی ترقی کے لئے مختلف حکومتوں نے کبھی بھی سنجیدگی سے دھیان نہ دیا۔

بھدرواہ قدیم تذکروں اور سفرناموں میں:

بھدروکاش (بھدرواہ) کی حسین وادی ہمیشہ بیرونی سیاحوں، انگریز پادریوں، تذکرہ نگاروں اور چند ایک مورخین کے لئے اپنے فطری حسن و جمال اور قدیم تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی ورثے کی رنگارنگی کی وجہ سے دلچسپی کا باعث بنی رہی ہے۔ اس کی سیاحت کرنے اور اِس کے کچھ کچھ سیاسی، جغرافیائی، تمدنی اور اقتصادی حالات لکھنے کا شرف جن اصحاب کو حاصل ہوا ہے اُن میں تاریخِ کشمیر کے ایک عظیم مورخ پنڈت کلہن، مشہور انگریز سیاح جی۔ ٹی۔ وائن، یورپی نژاد سیاح فریڈرک ڈریو، ریاست چمبہ کے دو انگریز پادری ووگل اور ہیچی سن، یورپی تذکرہ نگارہ چارس ایلی سن بیٹس اور کچھ ریاستی اور مقامی مورخین اور تذکرہ نگار شامل ہیں۔ اِن کے علاوہ مولوی حشمت اللہ خاں لکھنوی نے بھی اپنی تاریخ میں بھدرواہ سے متعلق کچھ اہم حوالے دیئے ہیں۔

ان سب سیاحوں نے اِس قدیم راجواڑہ شاہی کے قدرتی نظاروں، قابلِ رشک اور متنوع تہذیب وتمدن، رنگارنگ ثقافت، گھنے اور شاداب جنگلوں، پیدوار کی بہتات 'قسم قسم کے پھولوں' پُر کیف فضاؤں' دلکش اور حسین مرغزاروں اور چراگاہوں کے گُن گائے ہیں اور اِس کو شمالی ہندوستان کی ساری ریاستوں میں ایک ممتاز راجواڑہ قرار دیا ہے۔ حالانکہ کچھ مورخین اِتفاقیہ طور پر سرکاری' فوجی یا سیاسی نوعیت کے مسائل کی تحقیق کے سلسلہ میں اِس وادی کا رُخ کرتے رہے۔ اُن کے سفرنامے یہاں کی تاریخ کے مستند ماخذ اور جغرافیہ اور ارضیات پر معتبر اور قابلِ قدر کارنامے ہیں۔

بھدرواہ کی وادی زمانۂ قدیم میں برفانی تودوں اور طوفانوں کی مسلسل زد میں رہی ہے۔ اِس کی خارجی سطح کی بناوٹ اُسی عمل کا نتیجہ ہے۔ لاتعداد گول اور نوک دار گرینائٹ کے چمکدار چٹانی پتھروں کی پُر حجم لمبی لمبی اور تہہ در تہہ قطاروں سے آراستہ اور پیراستہ وادی کی سطح سے بھی اِس حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ طوفان اِس کی ارضیات میں بسا اوقات تبدیلیاں لاتے رہے ہیں۔

"یہ وادی جنوب مشرق میں علاقہ بھیجہ سے' شمال مغرب میں موضع درنگہ تک تقریباً چھ میل لمبے اور ایک میل چوڑے رقبے کا احاطہ کئے ہوئے ہے' جو بتدریج تین ڈگری ڈھلوانی صورت میں ہے۔ یہ چاروں طرف ایسے پہاڑی ڈھلوانوں سے گھری ہوئی ہے' جو دیودار کائل کے گھنے جنگلوں سے ڈھکے ہوئی ہیں۔ اِس وادی کے گردونواح میں واقع پہاڑوں کے ایسے خشک قطعاتِ ارض موجود ہیں جن پر جنگل نہیں ہیں اور ان کی محلقہ گھاٹیوں پر دیہاتی لوگ بسیرا کئے ہوئے ہیں۔ سپاٹ خطّوں میں مکی' راجماش' دالیں' سرسوں اور جو کی کاشت کی جاتی ہے جب کہ زینہ نمار میں، دھان کے سارے کھیت' جو ایک دوسرے کے اُوپر زینوں کی شکل میں بنائے گئے ہیں'

تین منصوبہ بند نہروں کے سلسلوں سے سیراب کئے جاتے تھے جو چوروٹ، مونہا اور نیروج کے نام سے موسوم ہیں۔"[1]

آب پاشی کے اِس قدیم نظام میں کہیں کہیں سطح زمین پر بکھرے ہوئے پتھر رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ وادی کے بیشتر حصہ میں نیم دائروں میں منقسم خوبصورت قسم کی ڈھلتی ہوئی ہمواریاں اور زینہ دار کھیت ہیں جن کی شادابی اور حسن بھری ہریالی موسمِ گرما میں اور فصلوں کی دلکش زردی، موسمِ خزاں میں دعوتِ نظارہ دیتی ہیں۔ موسمِ سرما میں تو اِن زینہ در زینہ بنائے ہوئے سوکھے کھیتوں کی سفید اور شفاف برف ایک عجیب و غریب قسم کا منظر پیش کرتی ہے۔ وادی کی ڈھلوانی سطح کا اندازہ نیرو نالہ کے طاس یا اس کے پانی کے بہاؤ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے، جو جنوبی حصّے سے نکل کر شمال مغرب کی طرف بہتا ہے۔ وادیٔ بھدرواہ، درنگہ کے مقام پر اپنی وُسعتوں کو سمیٹ لیتی ہے جہاں سے نالہ نیرو اور اُس کی معاون ندیاں یکجا ہو کر اس تنگ سی گھاٹی میں سے اپنی خوبصورت گزرگاہ بنا لیتی ہیں۔ درنگہ کی گھاٹی کو "بھدرواہ کا صدر دروازہ" بھی کہا گیا ہے۔ یہاں سے ہی ضلع کے صدر مقام اور اِس کے مختلف مقامات کے علاوہ علاقہ بٹوت کو جوڑتی ہوئی ایک پکی سڑک گزرتی ہے جو مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت سے پہلے ایک پیدل راستہ تھا۔

بھدرواہ طبعی اور ارضیاتی تبدیلیوں کے تناظر میں:

راقم کے خیال میں موجود وادیٔ بھدرواہ کے طبعی خدوخال، زمین کی بالائی ہموار اور ڈھلوانی سطح، کھیتوں کی مخروطی اور نیم دائروں میں زینہ دار بناوٹ، دریاؤں اور ندی نالوں کی گزرگاہوں کا شمال مشرق کی طرف جھکاؤ، درنگہ گھاٹی کی طرف جاتے ہوئے وادی کے مغربی اور کچھ مشرقی حصہ میں پھیلی ہوئی زمین کی زرخیزی، نالہ

---

[1]: ہمالین ریسی پیلٹیز، ڈاکٹر پریتم کرشن کول، ص: ۱۲۲

نیرو کا نشیبی طاس اور ایسے ہی کئی جغرافیائی اور ارضیاتی پہلوؤں سے تعلق رکھنے والے مشاہدات اس حقیقت کی طرف صاف طور پر اشارہ کرتے ہیں کہ قدیم شہر ڈونگا نگر یعنی آج کل کے موضع سرتنگل سے نیچے ڈھلوانی قطعاتِ ارض سے لے کر موجودہ موضع کرساڑی اور موضع کھروٹی کے بالائی حصّوں تک کسی زمانے میں وادیٔ کشمیر کی طرح ہی ایک بہت بڑی جھیل تھی، جس کا پانی مختلف اوقات یا زمانوں میں برفانی تودوں اور زبردست طوفانوں کے دباؤ سے درنگہ گھاٹی کے قریب سے خارج ہوتا گیا اور بڑی مدت کے بعد یہ جھیل ایک خوبصورت اور زرخیز وادی میں تبدیل ہو گئی۔ پانی کے بہاؤ اور اِس کے اخراج میں آتش فشانی محرکات یا داخلی تبدیلیوں کا بھی عمل دخل رہا ہوگا۔ قرینِ قیاس ہے کہ علاقہ کیلاڑ، بہ شمول علاقہ طروٗن بھی اِسی بڑی جھیل کا ایک حصّہ رہا ہو اور وادی سے پانی کے اخراج کے ساتھ ساتھ اِس کا پانی بھی گلکندر (متصل موجودہ پُل ڈوڈہ) کی گھاٹی سے ایسے ہی عوامل کے تحت خارج ہو کر دریائے چناب میں جا گرا ہو۔ اِن علاقوں کی زرخیزی اور گرینائٹ پتھروں کی بناوٹ بھی اس مفروضے کی تائید کرتی ہے۔

پروفیسر اُتم سنگھ نے اپنے ایک اہم مقالے "جغرافیکل سروے آف بھدرواہ" میں اِس بارے میں یوں لکھا ہے:

"بھدرواہ کا جغرافیہ اپنی بناوٹ کے لحاظ سے بڑی دلچسپی کا حامل ہے کیونکہ اِس کی یہ بناوٹ داخلی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے۔ وہ جگہیں، جہاں اُونچے پہاڑ نمودار ہوئے ہیں اور جن سے وادی چاروں طرف سے گھری ہوئی ہے، سب کے سب ٹیتھائز سمندر کے نیچے تھے اور بعد میں اندرونی تہہ دار چٹانوں کی حرکیات یا اِن کے شکست و ریخت جیسے عوامل کی وجہ سے یہ وادی پیر پنچال کے پہاڑی سلسلوں کے ساتھ عین بیچ میں نمودار ہوئی۔

نالہ نیرو، نالہ ہلدن (جن کا موجودہ سنگم موضع مونڈا کے مقام پر ہے)، نالہ پونجہ، نالہ چنوت اور نالہ چکہ وغیرہ نے اپنی موجودہ گزرگاہوں کی شکل سالہا سال کے دوران ہونے والی طبعی اور ارضیاتی تبدیلیوں کے بعد ہی اختیار کی ہوگی، جب کہ نالہ نیرو نے اپنا طاس وادی کے مشرقی کنارے سے نکال لیا ہوگا جس سے وادی کے مغربی حصّوں کی زرخیزی محفوظ رہی۔ اِسی دوران نئے نمودار شدہ ٹیلوں اور چھوٹے چھوٹے پہاڑوں ور پہاڑیوں اور بالائی حصّوں پر جنگلات اُگتے رہے۔ اِس بات میں بھی شک نہیں ہے کہ زمانہ قدیم کے طوفان کی طرح ہی، جس نے ڈونگانگر کی راجدھانی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا، سال ۱۹۲۸ء میں آئے ہوئے ایک طوفانِ عظیم نے کچھ ایسے ہی عوامل کے تحت نالہ پونجہ کے درمیان میں اپنی راہ نکال کر وادی کے وسطی حصّے میں نئے سرے سے بسائے ہوئے قصبے کو کافی مالی اور جانی نقصان پہنچایا اور اِس کی ہیئت ہی بدل ڈالی۔

ماہرین ارضیات کے خیال میں بھی ''آٹھ ہزار سال قبل مسیح میں وادیٔ جہلم اور وادیٔ چناب زیرِ آب تھیں۔''[1] اِس تحریر سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر وادیٔ چناب بھی کسی زمانے میں زیرِ آب تھی تو یقیناً پانی کی سطح موجودہ قصبہ ڈوڈہ سے کہیں اُوپر رہی ہوگی اور اِس لحاظ سے وادیٔ چناب اور وادیٔ بھدرواہ ساری کی ساری ایک ہی جھیل تھی۔ دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جب وادیٔ چناب والی جھیل کے پانی کا اخراج ہوا تو ساتھ ساتھ بھدرواہ جھیل کے پانی کا بھی آہستہ آہستہ اخراج ہوتا گیا ہوگا اور جھیل کی سطح نیچے آگئی ہوگی اور بھدرواہ کی موجودہ وادی ہلکی ہلکی ڈھلوانی شکل میں زمین کے زرخیز قطعات کے ساتھ نمودار ہوئی ہوگی۔ اِس بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت تو خیر ہمیشہ باقی رہے گی۔

۱: فدا محمد حسنین، بحوالہ ''تصویر ضلع ڈوڈہ'' ص: ۷

طبقات الارض کے ماہرین کی رائے میں بھی اِس وادی میں زمانہ قدیم میں وقتاً فوقتاً بہت سی داخلی اور خارجی ارضیاتی تبدیلیاں رُونما ہوتی رہی ہیں جن کی وجہ سے یہ وادی فلک بوس پہاڑوں کے درمیان موجود حالت یا صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ڈاکٹر پریتم کرشن کول نے بھدرواہ کالج کے میگزین ''شاہین'' میں چھپے ایک مقالے ''جیالوجیکل اورِیجن آف بھدرواہ'' یعنی ''بھدرواہ کی ارضیاتی تشکیل کی ابتداء'' میں ایک بڑے ہی اہم موضوع کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے' جس کے بارے میں ۱۹۷۱ء تک کم ہی توجہ دی گئی تھی۔وہ لکھتے ہیں:

''بھدرواہ کے طبعی خدوخال اِس بات کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ یہاں کا کوہستانی سلسلہ یعنی ''کیلاش'' اور ''آشاپتی'' کی ساری رینج ایک بڑے آتش فشانی عمل کی زد میں رہی ہے۔داخلی تبدیلیوں کے دباؤ اور آتش فشانی عمل سے ''آشاپتی اور کیلاش'' کے بالائی حصّوں میں جو بڑے بڑے دہانے (جوالامکھ) رونما ہوئے ہیں وہ کسی زمانے میں آتشیں مادے کے ساتھ ساتھ لاوا اُگل کر پھیلا دیتے تھے اور خود وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹھنڈا ہونے پر اُنہوں نے جھیلوں کی شکل اختیار کی جن میں سے ایک طرف کیلاش کنڈ (جھیل) اور اُس کے جنوبی حصّے میں واقع قریبی جھیلیں چاروں طرف سے شاندار اُونچی چٹانوں سے گھری ہوئی ہیں جو اکثر برف سے ڈھکی رہتی ہیں اور کیلاش جھیل سردیوں میں میں برف سے پُر ہونے کے بعد یخ بستہ ہو جاتی ہے۔''

اِن کوہستانی جھیلوں کا پانی دریاؤں ندی نالوں کی صورت میں بہہ کر نہ صرف وادی بھدرواہ کو سرسبز و شاداب بناتا ہے بلکہ یہاں کے کھیتوں میں دھان وغیرہ کی فصل کی فراوانی کا باعث بھی بنتا آیا ہے۔دوسری طرف اِن پہاڑی سلسلوں سے نکلنے والے دریا اور ندی نالے بسنت گڑھ، اودھم پور اور جموں کے علاقوں کو سیراب کرتے ہیں اور

ساتھ ہی ضلع کٹھوعہ وغیرہ کی طرف جانے والے دریا بہت بڑے علاقے کی شادابی کا باعث بنتے ہیں۔

وادی بھدرواہ میں پائے جانے والے پتھروں کی بناوٹ کے جائزے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کی چٹانیں مسلسل آتش فشانی عمل، داخلی اور خارجی دباؤ کی وجہ سے بنی ہیں۔ اِس ارضیاتی اور طبعی تغیر کی ایک اور مثال ہمیں وادی کے مختلف حصوں میں پائے جانے والے مٹی کے ٹیلوں اور چھوٹی بڑی پہاڑیوں کی بناوٹ سے بھی ملتی ہے، جن کے نشیب وفراز میں بکھرے پڑے آتشیں چٹانوں سے نکلے ہوئے گول گول سفید بھورے اور شفاف قسم کے گرینائٹ پتھروں کے انبار وادی کی خوبصورتی اور دلکشی میں اور بھی اضافہ کرتے ہیں۔ ندی نالوں کے کناروں پر بڑے حجم والے پتھروں اور درمیان میں پائے جانے والے چھوٹے بڑے پتھروں کی موجودگی سے ندی نالے مٹی کے کٹاؤ سے محفوظ رہتے ہیں اور ڈھلوانی کھیتوں کے آب پاشی کے نظام کو یقینی اور دیرپا بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ بصورت دیگر اِن ندی نالوں کے پانی کی سطح نیچے آتی رہتی اور ساری زمین بنجر بن جاتی۔ یہ پتھر تعمیراتی کاموں میں اکثر استعمال ہوتے ہیں اور اِن میں پائی جانے والی ریت اِن کاموں کے لئے مفید ترین مانی گئی ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے اور اُس سال کے آس پاس یہ وادی مسلسل زلزلوں کی زد میں تھی، جو کئی کئی روز تک بڑی شدّت سے جاری رہتے تھے جن سے مکانات اور باقی عمارات کو کافی نقصان پہنچا تھا اور مکینوں کو کھلے میدانوں یا ٹیلوں پر پناہ لینا پڑی تھی۔ اب بھی یہاں پر زلزلوں کا سلسلہ جاری وساری ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ وادی زمانۂ قدیم سے ہی داخلی دباؤ اور دیگر قسم کے محرکات کے نتیجے میں زلزلوں کی زد میں رہی ہے۔ یہاں پر حالیہ قیامت خیز زلزلے کا ذکر کرنا

مناسب ہوگا جو وادیٔ کشمیر اور پاکستان آزاد کشمیر کے مختلف مقامات پر ۸/اکتوبر ۲۰۰۵ء کو صبح سوا نو بجے وقوع پذیر ہوا، جس کے جھٹکے بھدرواہ میں بھی محسوس ہوئے۔ اس زلزلے سے اوڑی ٹنگہ ڈار کے علاوہ پاکستان کے بہت سے شہر قصبے اور آزاد کشمیر میں مظفر آباد اور کئی شہر اور قصبے نیست و نابود ہو گئے۔

بھدرواہ کی قدیم اِنتظامی اکائیاں

چارلس ایلی سن بیٹس، جی ٹی وائن اور فریڈرک ڈریو وغیرہ سیاحوں نے بھی مختلف اوقات میں اپنے اپنے سفر ناموں وغیرہ میں مملکت بھدرواہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے جو منجملہ طور پر نئے محققین اور تذکرہ نگاروں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوا ہے۔ چارلس ایلی سن بیٹس نے جی ٹی وائن جیسے مشہور انگریز سیاح کی تحریروں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی مشہور آفاق کتاب ''اے گزیٹیئر آف کشمیر'' میں بھدرواہ کی قدیم تاریخ، یہاں کے جغرافیہ، تمدّن اور فطری حسن کے بارے میں اپنے گراں قدر مشاہدات قلم بند کئے ہیں۔ اُس نے ریاست کے دور دراز علاقوں کا دورہ کر کے وہاں کے دیہات اور قصبوں، لوگوں اور اُن کے رہن سہن، اُن کے پیشوں، تاریخ، جغرافیہ اور اِقتصادیات وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اِس سلسلہ میں اُنہوں نے یہ اہم کام ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۳ء کے بیچ میں مکمل کیا اور ایک گزیٹیئر کی صورت میں شائع کیا۔ چارلس ایلی سن بیٹس کے مطابق راجاؤں کے دورِ حکومت میں بھدرواہ کا قدیم راجواڑہ شاہی، جسے وہ صوبے کا نام دیتا ہے، حسب ذیل پرگنوں یا اِنتظامی اکائیوں یا تھڑوں میں منقسم تھا۔

ا۔ اٹھکھار (بالائی علاقہ)، ۲۔ بھدرروار (بھدرواہ)، ۳۔ گاٹھہ، ۴۔ اُدرانہ (نچلا تھڑہ) ۵۔ کیلاڑ، ۶۔ ہزیرا، ۷۔ ترمارا، ۸۔ بدوتا ۹۔ بارہ سوئی، ۱۰۔ طروَن ۱۱۔ سوار، ۱۲۔ گڈیاڑہ، ۱۳۔ بھیلہ، ۱۴۔ چنتہ، ۱۵۔ بسوتہ ۱۶۔ منوتا، ۱۷۔ پنگل، ۱۸۔ چلی،

3

۱۹ نیلی اور ۲۰۔ جلوطہ[۱]

چارلس ایلی سن بیٹس نے بھدرواہ وادی کی سیاحت ۱۸۷۳ء میں کی۔ وہ اِس وادی کی اہم جغرافیائی معلومات کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''صوبہ بدروار مہاراجہ کشمیر کے علاقوں کی حدود کے جنوب مشرق میں واقع ہے جہاں اِس کی سرحدیں چمبہ کی ریاست سے ملتی ہیں۔ یہ بڑا پہاڑی ضلع ہے۔ دُشوار گزار درّوں کی مشکلات اور دریائے چناب (چندر بھاگا)' جو شمال کی طرف بہتا ہے' کی وجہ سے اِس میں کسی اہم یا عام قسم کی آمدورفت کے راستے یا گزرگاہیں موجود نہیں ہیں۔ ضلع کی بدرویں (ندی نالے) چندر بھاگا کی طرف بہتی ہیں۔ اہم گزرگاہیں، جن میں یہ پانی سمو جاتا ہے کالنئی گڑھ اور کال گڑھ ندیاں ہیں، جن دونوں کا پانی مل کر جنگلواڑ وادی کے نزدیک اِس دریا میں جا گرتا ہے۔ اور نیرو کا (پانی) بھی' جو اُس میں ڈوڈہ کی مخالف سمت میں مل جاتا ہے۔''

''بھدرواہ کی وادیاں اِنتہائی بارآور ہیں جن میں بڑی مقدار میں چاول کی پیداوار ہوتی ہے' جو مقامی لوگوں کی ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔ فاضل چاول یہاں سے کم چاول پیدا کرنے والے اضلاع کو برآمد کیا جاتا ہے۔ اِس ضلع میں پیدا کیا جانے والا تمباکو اچھے قسم کا ہوتا ہے جس کی اچھی مانگ ہے اور کم مقدار میں ہمسایہ منڈیوں میں بھیجا جاتا ہے۔ بھدرواہ میں پیدا ہونے والے میوے اچھی صفات کے میوے وادیٔ کشمیر کے اچھے میوؤں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ شہد کی پیداوار بہت زیادہ ہے اور اس کا ذائقہ خوب تر ہے۔ اس صوبے کی جنوبی سرحد پر واقع پہاڑیوں میں لوہے کی کچی دھات کو پگھلایا جاتا ہے۔''

وائن اِس ضلع کو شاہین یا باز پکڑنے کے لئے ایک مشہور جگہ قرار دیتا

۱: اے گزیٹیر آف کشمیر کلکتہ ۱۸۹۰ء ص ۲۴۲-۲۴۳

ہے۔اُن کو جالوں میں ٹھیک اُسی طرح سے پکڑا جاتا ہے جیسے سکول کے بچے چڑیوں کو پھندوں میں پھانستے ہیں۔اُنہیں زِندہ کبوتروں کے ساتھ لڑایا جاتا ہے۔‘‘

یاد رہے کہ جی ٹی وائن ایک فرنگی[1] سیاح تھا جس نے بھدرواہ کے علاوہ ڈوڈہ کی سیاحت بھی کی اور اِن علاقوں کے حالات اپنے سفر نامے موسوم بہ ’’کشمیر لداخ اسکردو کی سیاحت‘‘ میں قلم بند کر کے ۱۸۹۲ء میں لندن سے پہلی جلد کے طور پر شائع کرائے۔وہ دراصل چنہنی سے روانہ ہو کر دودھارا پہاڑوں کو عبور کر کے وادئ چناب میں داخل ہوا۔یہاں پہنچ کر چناب کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ چلنا اُس کے لئے آسان ہو گیا۔وہ تیسرے روز ڈوڈہ پہنچا اور چوتھے روز دودھارا کے شمالی دامن سے بھدرواہ پہنچ گیا تھا۔وائن دراصل علاقہ مرمت کے راستے ڈوڈہ میں داخل ہوا تھا۔اُس وقت مرمت بھدرواہ میں شامل تھا۔وائن نے اِن علاقوں کی سیاحت ۱۸۳۹ء میں کی تھی۔وہ لکھتا ہے کہ ’’پہلے بھدرواہ جانا بہتر ہے اور پھر ڈوڈہ کی طرف مراجعت۔بھدرواہ۔کے دریا اور چناب کے سنگم سے بھدرواہ تک کا فاصلہ بارہ چودہ میل ہے۔بھدرواہ کے دریا (نیرو) اور چناب کا سنگم پُل ڈوڈہ کے قریب ہے۔آج کل اِن دونوں دریاؤں کے مقامِ اتصال سے بھدرواہ کا فاصلہ ۱۹ ؍ میل ہے۔وائن نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ نیرو کے پار قدیم راستہ تھا۔وائن کو بھدرواہ کے راستہ میں گاؤں کے مناظر دیکھ کر انگلستان یاد آ گیا۔وہ لکھتا ہے۔’’گاؤں کے گرد نسبتاً زیادہ کشادہ رقبہ اور خاردار جھاڑیوں کو دیکھ کر مجھے انگلینڈ کے زرعی اور پہاڑی ضلع کی یاد آئی۔‘‘ چارلس ایلی سن بیٹس، وائن کے حوالے سے بھدرواہ کے بارے میں مزید لکھتا ہے کہ ’’ان وادیوں میں گُر سونامی گھاس کی ایک متبرک قسم بکثرت پائی

---

[1]۔ ’’سفر نامہ وائن اور ضلع ڈوڈہ‘‘ از عشرت کشتواڑی، مشمولہ شیرازہ، ہمارا ادب، کلچرل اکیڈیمی، ۱۹۶۵ء، ص: ۶۹۔ا

جاتی ہے جسے بھیڑوں کے چارے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔اس امر میں شک کی گنجائش ہے کہ آیا اس میں کبھی سُرخ گوندی قسم کے پھل (اسٹرابیری) پیدا بھی ہوتے ہیں یا نہیں؟"

"وادیاں گھنے دیہاتوں اور جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی ہیں اور اس فراخ مُلک کے بالائی حصّوں کو انگلینڈ کے کاشت شدہ اور پہاڑی ضلع کے مصداق قرار دیا گیا ہے۔گھر بھی عام طور پر مٹی اور لکڑی سے بنے ہوئے کم اُونچے اور یک منزلہ ہیں جن کی ہموار چھت پر دُودکشی کے لئے پتھروں کا ایک بڑے سوراخ والا چبوترہ سا بنایا جاتا ہے۔ان میں سے کچھ اچھے مکان دومنزلہ ہیں جن کی چھتیں ڈھلوانی یا محرابی قسم کی ہوتی ہیں لیکن ایسے مکان عام نہیں۔اِس ضلع میں پنجاب کی جیسی بارش ہوتی ہے لیکن مئی مہینے میں گرج چمک کے ساتھ آندھی اور بارش کی بوچھاڑ ہوتی رہتی ہے اور فضائی ہنگامہ بہت دِن تک جاری رہتا ہے۔اِن کی زبان جو ہندوستانی کی ایک بولی ہے، ایک مقام سے دوسرے مقام تک بڑی حد تک تفاوت رکھتی ہے۔"[۱]

چارلس ایلی سن بیٹس نے "اے گزیٹر آف کشمیر" میں مملکت بھدرواہ کے بہت سے دیہات کے بارے میں اہم جغرافیائی معلومات فراہم کی ہیں جن میں سے چند ایک کا ذِکر کرنا قارئین کی دلچسپی کے لئے لازمی ہے۔

۱۔موضع بستی (عرض بلد ۵۶ ۳۲،طول بلد ۴۵ ۷۵)

یہ موضع، بھدرواہ کے جنوب میں تقریباً پانچ میل کی دُوری پر نالہ ہلون کے دائیں کنارے بسوہلی کی طرف جاتے ہوئے راستے پر واقع ہے۔یہ ایک چھوٹا سے گاؤں ہے جو چھ گھروں پہ مشتمل ہے جس کے گرد کاشت کے گئے کھیت کھلواڑ ہیں۔ان گھروں میں زیادہ ہندو اور دو مسلمان گھر ہیں۔ہلونی ندی گاؤں کے اُوپر تقریباً ایک

۱: فوکس آن جموں وکشمیر،اسیر کشتواڑی،ص: ۲۲۷،بحوالہ وائن وغیرہ

میل فاصلے پر ایک پُل کے ذریعے پار کی جاتی ہے۔

۲۔ موضع بھیجہ (عرض بلد ۵۶ء۳۲ طول بلد ۴۸ء۷۵):

یہ گاؤں بھدرواہ کے شمال مشرق میں پدری میں سے گزرتے ہوئے چمبہ کے راستے پر واقع ہے۔ اس کے نچلے حصّے میں نالہ نیرو پر ایک پُل بنا ہے۔

۳۔ چھتر دھار (عرض بلد ۵۳ ۳۲ طول بلد ۴۶ ۷۵):

یہ پہاڑی سلسلہ میں ایک درّہ ہے جو ضلع بسوہلی کو وادیٔ بھدرواہ سے الگ کرتا ہے۔ درّے کا سرا بھدرواہ کے جنوب میں اور بسوہلی کے شمال میں اِکاون میل کی دُوری پر واقع ہے۔ یہ راستہ بڑے اور بلند پہاڑوں کے اُوپر سے ایک تنگ قسم کے پُل سے گزرتا ہے، جس کے مشرق میں ''سونہ بائیں'' اور مغرب میں ''کپلاس'' واقع ہیں۔ سردیوں میں بھیڑ بکریوں اور حمالوں (بوجھ اُٹھانے والے مزدور) کے لئے ناقابلِ گزر بن جاتا ہے۔ تاہم پیدل چلنے والے لوگ ہر موسم میں اِسے پار کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ چڑھائی اور اُترائی اِتنی مشکل نہیں، البتہ شمال کی طرف یہ بہت ڈھلوانی ہے۔[1]

۴۔ چنوت (عرض بلد ۵۹ء۳۲ طول بلد ۴۵ء۷۵)

یہ گاؤں بھدرواہ کے شمال مغرب میں ایک پہاڑی ڈھلوان پر بھدرواہ کے متصل ہی واقع ہے۔

۵۔ چکہ (عرض بلد ۵۹ء۳۲ طول بلد ۴۴ء۷۵)

یہ گاؤں بھدرواہ کے شمال مغرب میں تھوڑی دُوری پر ایک ڈھلوانی پہاڑ پر ہے۔ اس میں تقریباً ۱۲ گھر ہیں، جس کی آبادی ہندو اور مسلم دونوں فرقوں پر مشتمل ہے۔

۶۔ درنگہ (عرض بلد ۱۰ء۳۲ طول بلد ۴۲ء۷۵)

---

[1] بیٹس نے بھدرواہ کا نام ''بدروار'' لکھا ہے۔

یہ گاؤں نالہ نیرو کے بائیں کنارے پر بھدرواہ کے شمال مغرب میں راستے سے تھوڑا اُوپر واقع ہے۔ اِس میں تقریباً تیس گھر ہیں جو سب ہندو (باشندے) ہیں ماسوائے ایک مسلم گھرانہ کے۔ ایک چھوٹی سی ندی سے، جو گاؤں میں سے گزرتی ہے، گھراٹ چلتے ہیں جو عمدہ قسم کے سایہ دار درختوں کے اندر واقع ہیں۔ نالہ نیرد جو تقریباً دو فٹ گہرا ہے، دھیمی روانی سے چلتا ہے جسے ۷۰ فٹ سپین والے اور ۴ فٹ چوڑے پُل پر سے عبور کیا جاتا ہے۔ مسافروں کے لئے سڑک پر ایک دھرم شالہ بھی بنی ہے۔

۷۔ بن گڈ (عرض بلد ۴۰ ۳۳، طول بلد ۴۰ ۷۵)

یہ ندی، جو بھدرواہ کے مغرب میں واقع برفیلے پہاڑ کی ڈھلوانوں سے گزرتی ہے اور شمال کی طرف زرخیز وادی میں سے بہتی ہے، بھالہ گاؤں کے نیچے نالہ نیرو میں اِس کے بائیں کنارے کی جانب سے ملتی ہے۔ یہ ندی عام طور پر پیدل بھی پار کی جاسکتی ہے، تاہم کھلینی اور بھالہ گاؤں کے درمیان اِس پر ایک پُل بھی بنایا گیا ہے جہاں بھدرواہ آنے والی سڑک اِس سے گزرتی ہے۔ ندی کے دائیں کنارے پر سب گاؤں ہندوؤں کی آبادی پر مشتمل ہیں۔

۸۔ ڈوگہ (عرض بلد ۱۰ء ۳۳، طول بلد ۳۹ء ۷۵)

یہ بھدرواہ کا ایک وسیع گاؤں ہے جس میں تیس (۳۰) گھر آباد ہیں جن میں صرف ہندو فرقے کے لوگ بستے ہیں۔ یہ نالہ بن گڈ کے دائیں کنارے وادی کے جنوبی سرے پر پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر واقع ہے۔

۹۔ بھالہ (عرض بلد ۴۰ء ۳۳، طول بلد ۴۰ء ۷۵)

یہ بھدرواہ ڈوڈہ سڑک پر مسلم باشندگان پر مشتمل ایک گاؤں ہے جس میں صرف آٹھ گھر ہیں۔ یہ ایک چھوٹی ندی کے بائیں کنارے پر ہے، جو بن گڈ میں نیرد

نالہ کے متصل ہی جا گرتی ہے۔ بن گڈ ندی کے اُوپر اِس گاؤں کھلینی کے درمیان ایک پل بنایا گیا ہے۔

۱۰۔ اُدرانہ (عرض بلد، طول بلد ۴۵، ۷۵)

ایک بڑا کشادہ گاؤں ہے جو بھدرواہ سے ڈیڑھ میل دوری پر شمال مغرب کی طرف ڈوڈہ بھدرواہ سڑک پر واقع ہے۔ یہ کو میری ندی کے مغربی کنارے کی طرف ہے جس پر ایک عمدہ پُل تعمیر ہوا ہے۔ فریڈرک ڈریو" دی ٹیریٹریز آف جموں اینڈ کشمیر" (کے صفحہ ۱۰۳ تا ۱۰۵) میں بھدرواہ وادی سے متعلق اپنے مشاہدات یوں قلم بند کرتے ہیں۔ "بھدرواہ تقریباً ایک ہموار سطح وادی ہے جس کی چوڑائی ایک میل اور لمبائی تقریباً چار میل ہے۔ وادی کی سطح تقریباً ۳ ڈگری ڈھلوان ہے۔ اِس اُترائی میں زمین چند فٹ پر ایک زینہ بناتی ہے تا کہ یہ سینچائی کے قابل بن سکے۔ یہاں دھان کی فصل کے لئے کافی پانی دستیاب ہے۔ اِس لئے مئی کے مہینے میں لوگ ہل اور بھاری قسم کی کدالی سے زمین کو نرم کر کے دھان کی فصل لگانے کے لئے تیار کرنے میں مصروف تھے۔ مرد اور عورتیں اکھٹے، دس یا بارہ کے گروہوں میں کھیتوں پر کام کرتے تھے۔ کاندھوں سے کاندھا ملا کر وہ دِن بھر محنت کرتے اور اپنے اوقات مل کر خوبصورت گانے اور تیزی سے کام کرنے میں گزار دیتے تھے۔"[۱]

وادی بھدرواہ کا بالائی حصّہ کافی کشادہ ہے تاہم اِس کا نچلا حصّہ یعنی نچلا تھڑہ سے آگے اِتنا تنگ ہوتا جاتا ہے کہ پہاڑی ڈھلوانوں کے درمیان مشکل سے ہی کوئی میدانی جگہ باقی رہ جاتی ہے۔ جو پہاڑیاں اِس کو گھیرے میں لئے ہوئے ہیں اُن کے جنگلات کے لمبے سرے (مینڈھے) اِس وادی کی حدود کا تعین کرتی ہیں۔

موجودہ تحصیل بھدرواہ بہ شمول علاقہ چنتہ بھالڑہ جائی اور کیلاڑ وغیرہ صوبہ

۱: بحوالہ "تصویر ضلع ڈوڈہ"، اسیر کشتواڑی، ص: ۶۶۔۶۷

جموں کی سب تحصیلوں سے خوبصورت ترین تحصیل ہے۔ گھنے اور سرسبز و شاداب جنگلات اور برف پوش پہاڑی سلسلوں سے گھرا ہوا یہ علاقہ بقول نیک چند کوتوال، ''روئے زمین پر ایک ایسے چھوٹے مگر چھپے ہوئے فردوس کے مترادف ہے جو شمال میں بھادھار اور ریوشر و جیسے حسین ترین مرغزاروں کو محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ جب کہ جنوب کی طرف سیوج دھار کے شاندار میدان اور کیلاش متبرک جھیل، مشرق کی طرف سوان بائیں (سونہ بائیں) ... دو گرم چشمے اور مغرب کی طرف مشہور دریا چندر بھاگا (چناب) بہتا ہے اور اس پر طرۂ یہ کہ اِس خطے کے خوبصورت نباتات اور حیوانات ہر اُس شخص کے لئے سحر آفرینی کا ذریعہ بنتے ہیں، جو بھی اِس حسین وادی کا دورہ کرتا ہے ایک برطانوی مشنری مِس مارگریٹ ہاؤسین نے وادئ بھدرواہ کے حُسن کو اپنے ایک انگریزی مقالہ میں اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

''لو'' بھدرواہ ہے۔ میں بس اسٹینڈ کے قریب ایک بڑے چنار کے درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی۔ موسم بہار کی شادابی نے میری پر تجسس نظروں کی ٹکٹکی کو اپنی طرف کھینچا۔ گھنے پتوں سے بُنی ہوئی جالی میں سے مجھے تازہ لگائے ہوئے دھان کے کھیتوں پر نظر پڑی، جو سبز قالین کے زینوں کی طرح دریا کے نچلے کنارے تک غوطہ زن معلوم ہوتے تھے۔ دریا کا ہنگامہ خیز پانی سورج کی روشنی میں شرارے سے برسا رہا تھا۔ ایک بڑے پتھر پر سے ایک پرندہ اُوپر کی طرف اُڑا۔ میں نے اُس کی اُڑان کا تعاقب کیا۔ دریا کے اوپر، اور اُوپر، اور اُوپر جا کر نیلے گنبد کی اوٹ میں وہ ایک چھوٹے سے غیر مرئی ذرّے کی طرح اوجھل ہو گیا۔ پھر وہ غائب ہی ہو گیا۔''

''ماسوائے بادلوں کے چند جھنڈوں کے، جو برفیلی چوٹیوں کے گرد خالص ریشمی گلوبند لگائے معلوم ہوتے تھے باقی آسمان صاف ہو چکا تھا۔ کیلاش ابھی اپنا ضو بار جواہرات سے جڑا ہوا تاج پہنے ہوئے سر اُونچا اُٹھائے ہوئے تھا جو چمکیلی دھوپ

میں اِن کی چمک سے شعلہ بار ہو کر چمکتا دھمکتا تھا۔ یہ ہوشیار دیو قامت پہاڑ اپنی شاندار اُونچائیوں سے نیچے کی طرف وادی کے باشندوں پر نظریں جمائے کھڑے ہیں۔"

عشرت کشتواڑی کے الفاظ میں۔ "بھدرواہ ضلع ڈوڈہ کی جنت نگاہ ہے۔ بے حد دلکش مقام ہے۔ جس کے اِرد گرد سر سبز و شاداب جنگلات میں جانب جنوب پس منظر میں برف پوش پہاڑ ہیں۔ ندی نالوں کی کثرت ہے۔ سرزمین ڈھلوان اور زرخیز ہے۔ شاعروں کے لئے فردوس اور اہلِ نظر کے لئے گوشۂ عافیت ہے۔"[۱]

بھدرواہ کی حسین و جمیل وادی کے بارے میں کئی تذکرہ نویسوں اور مقالہ نگاروں نے اپنی قابلِ رشک تحریروں میں اپنے اپنے انداز میں بہت کچھ لکھا ہے جس کو قلم بند کرنے کے لئے اس کتاب کے صفحات میں گنجائش نہیں۔ البتہ کچھ قلمکاروں کی نوکِ قلم سے نکلے ہوئے فصیح و بلیغ اور قابلِ داد توصیفی پارے یہاں پر اس لئے شامل کئے جارہے ہیں تاکہ یہ امتدادِ زمانہ کے دست بُرد سے محفوظ رہ سکیں۔

مسٹر کیول کرشن گپتا اپنے محسوسات کو یوں الفاظ کا جامع پہناتے ہیں:

"سرسبز و شاداب "وادئ بھدرواہ" کے سلسلہ وار رنگ بدلتے ہوئے مناظر کی بوقلمونیاں بہت ہی سحر آفرین ہیں۔ جنت سے سرگوشیاں کرتی ہوئی برف پوش کپلاس کی پُر وقار بلندی، چیڑ اور دیودار کے درختوں کی سدا بہار تابانی، بل کھاتے ہوئے نالہ نیرو اور اِس کے ساز بجاتے ہوئے معاون نالوں کی دِل فریبی، زینے بناتے ہوئے دھان کے کھیتوں کی خوبصورتی، دورِ شباب واپس لانے والی ہیجان خیز ہلکی اور ٹھنڈی ہوائیں اور اس وسیع اور عریض علاقے کی پُر جمال دُور افتادگی اور قدرت کی طرف سے عطا کی ہوئی بے پناہ اور وافر خوبصورتی کی اِبتدائی اور قدیم

---

[۱]۔ "تاریخ کشتواڑ" از عشرت کشتواڑی

صورت میں موجودگی وغیرہ کی مدح سرائی کرنا ایک کٹھن امر ہے۔اس کے وافر تمدنی ورثے کی شان وشوکت، جو اِس وادی کی لوک کہانیوں اور تہواروں میں نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے، اس کی اضافی تعریف کے مترادف ہے۔ اس انمول خزانے کو ضائع ہونے سے بچانے کی اہم ضرورت ہے۔"

مسٹر کیول کرشن ڈگری کالج بھدرواہ کے الفاظ ہیں:

"بھدرواہ" قدرت کے ایک حقیقی دُرتاب کی طرح بڑے دلکش پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔اس کے نام سے ہی اِس وادی کے دِلفریب حسن کی تصدیق ہوتی ہے۔ بھدرواہ آتے ہوئے جو معجزہ انسان محسوس کرتا ہے وہ یہاں کی آب وہوا اور حُسن ہے...... جوں جوں وادی قریب آتی ہے انسان اِس کی زینہ دار ڈھلوانوں کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔

آنکھوں کے سامنے پہاڑ سیڑھی بنائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، جو انسانی دل ودماغ پر ایک انوکھا تسکین آور تاثر پیدا کرتے ہیں۔ اطراف میں وادی پہاڑوں کے گھیرے میں ہے جو اِس کے قدرتی حسن کی پاسبانی کرتے ہیں۔ پہاڑوں کی سرسبز شادابی حد درجہ فرحت بخش ہے۔ قسم قسم کے جنگلی معطر پھول پہاڑوں پر کھل آتے ہیں اور اس حسن فطرت کا ڈنکا بجاتے ہیں۔ اِن پہاڑوں کا ایک دورہ ایک مردہ دل میں نئی جان ڈال دیتا ہے۔"

نالہ نیرو کے کنارے کنارے چلتے ہوئے ایک آدمی اس کی سطح پر ہلکی لہروں کے ناچ کا اور اس میں اِدھر سے اُدھر تیرتی ہوئی مچھلیوں کے علاوہ درختوں پر نغمہ سرا پرندوں کا لطف اٹھا سکتا ہے۔انسان اپنے دِل میں یہاں ان جانے قسم کا امن وسکوں سرایت کرتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ایک فنکار یا مصور یہاں کے کنوارے حُسن کو اپنی مصوری کی پرتوں پر لا کر اِسے فطری حُسن بخشتا ہے۔ایک سنگ تراش یہاں کی

قدرتی اشیاء اور ماحول کی نقل کر کے اپنے فن پارے میں ڈھال کر اُسے حقیقی رنگ بخشتا ہے، جس کی بدولت اُس کا فن تکمیل کی حدیں چھو لیتا ہے۔ ایک سائنس دان کے لئے بھدرواہ کا حسن ایک للکار اور ایک معمہ ہے کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ اُسے اپنے مختلف رنگ دِکھاتا ہے۔ ایک عام شخص کے لئے بھدرواہ کی خوبصورتی لامتناہی ہے۔ وہ اسے اپنے لئے دنیا کے رنج وغم اور پریشانیوں کے فرار کا موجب گردانتا ہے۔ بہار بھدرواہ کو سبز خلعت پہناتی ہے۔ خزاں اسے سنہری اور پیلا رنگ عطا کرتا ہے، جب کہ موسم سرما اِس کے لئے سفید چادر بُن لیتا ہے۔ گھاس پر چمکتے ہوئے شبنمی قطرے، ستاروں بھرے آسمان اور چمکتے ہوئے برف کے ملائم گالے سبھی مسرت بخش ہیں۔ پرندے اور مویشی بھدرواہ میں اپنا ہی جشن پیش کرتے ہیں۔"[۱]

پروفیسر ٹی۔ این۔ موزہ نے اِس وادی کے حُسن کی دِلفریبی کے بارے میں اپنے تاثرات یوں لکھے ہیں:

"بھدرواہ کی قدرتی خوبصورتی کی شان وعظمت بے نظیر ہے۔ بلند و بالا اور حیرت انگیز پہاڑوں کے درمیان اپنی جائے قرار اِختیار کئے ہوئے بھدرواہ ایک چھوٹی وادی ہے جو چھ میل سے زیادہ علاقے کا احاطہ کئے ہوئے ہے، جس میں بل کھاتے ہوئے نالے اور چکر کاٹتی ہوئی ندیاں گزر کر ڈوڈہ کے مقام پر گرجتے ہوئے اور پُرشکوہ چناب سے مل جاتی ہیں۔ دلکش اور پُرپیچ وتاب دریا، ساکن اور پُرسکون جھیلیں، زینہ دار دھان کے کھیت، سدا بہار جنگلات، رنگارنگ قسم کے خوشبودار پھولوں، سرسبز ہریالی، رسیلے میووں، صاف وشفاف چشموں اور صحت بخش آب و ہوا نے اِس مناظر بھری وادی کو زینت بخشی ہے۔ قدرت بھی اِس وادی پر پورے طور پر فیاض اور مہربان رہی ہے۔ یہ بات بے وجہ نہیں کہ اِسے چھوٹا کشمیر کہا جاتا ہے۔"

پروفیسر اسد اللہ وانی نے بھدرواہ وادی کی یوں تصویر کھینچی ہے:

"یہاں کے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہو کر ایک قادر الکلام شاعر اور ایک مصوّر الفاظ کی آمیزش سے ایک رنگین، دلکش اور سحر ساز تصویر کھینچ کر دوسرے لوگوں کو اس کا فریفتہ بنا سکتا ہے۔ یہاں کے قدرتی مناظر سے تھکے ماندوں کو راحت اور مایوس دِلوں کو مسّرتِ حاصل ہوتی ہے۔ مختصراً قدرت نے اِس سرزمین کے چپے چپے پر جنت کے جلوے نمایاں کئے ہیں۔ جو لوگ بھی باہر سے یہاں آتے ہیں، اُن کے ہاتھ اس کی تعریف لکھنے کے بغیر اور زبان بولنے کے بغیر نہیں رہتی لیکن پھر بھی اُن کی قلم یہاں کی بے بہا قدرتی نعمتوں کا ذِکر کرنے سے قاصر ہے۔ اس ضلع اور تحصیل بسوہلی کے لوگ اس جگہ کی رنگینی اور دِلآویزی کو دیکھنے ہر سال بہت مصارف برداشت کر کے آتے ہیں اور یہاں سے لطف اندوز ہو کر مضطرب لوٹ جاتے ہیں۔ اُن کا جی چاہتا ہے کہ وہ اِس دلکش وادی میں عمر بھر رہائش پذیر رہوں۔"

پروفیسر عبدالرحیم راہی نے سمندر کو کوزے میں یوں بند کیا ہے:

"بھدرواہ ایک خوبصورت اور دِلکش مقام ہے۔ کشمیر کی طرح یہ خطہ بھی خوبصورت پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے اور یہاں پر قدرت نے اپنی رعنائی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ کیوں نہ ہو یہ "کشمیرِ صغیر" جو ہے۔ یہاں کی حسین وادیاں، فلک بوس چوٹیاں اور مچلتی ہوئی نہریں دِل کو سکون بخشتی ہیں اور بھدرواہ کی عظمت کی نشان دہی کرتی ہیں۔"

پروفیسر سنسار چند گپتا (اُدھم پوری) بھدرواہ سے متعلق اپنے دِل کی بات یوں بیان کرتے ہیں:

"بھدرواہ اپنی جغرافیائی حیثیت، سطحِ زمین، موسموں کی کیفیت، دریا اور پہاڑ، زرعی، جنگلاتی و باغاتی پیداوار، صنعت و حرفت اور تفریح کے مقامات وغیرہ اسباب کی بنا پر "چھوٹا کشمیر" کہلاتا ہے اور واقعی اِس چھوٹی سی وادی کا رنگ و روپ

اور اِس کے مناظر' اس کی جغرافیائی مماثلت پر مبنی نام کا حق دار بھی بناتے ہیں۔"

ڈاکٹر قطب الدین اپنے "بھدرواہ کے خوابناک اور طرب انگیز سفر" کی رُوداد قلم بند کر کے بھدرواہ کے حُسن کی یوں داد دیتے ہیں:

"صبح ہم تمنائے دید لئے ہوئے بیدار ہوئے تو دریچوں کے اندر سے ہی بھدرواہ کے دِلکش مناظر دیکھ کر کلفتِ سفر کافور ہو گئی۔ باہر نکلے تو سامنے شور کرتے ہوئے چشمہ کا سیماب صفت شفاف پانی بہتا نظر آیا چاروں طرف پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اور پہاڑ سر سبز و شاداب درختوں کے زمردین برگ و بار سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ یہ لمبے خوبصورت تناور درختوں صرف بھدرواہ کے حسن میں ہی اضافہ نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کی قیمتی لکڑیاں حقیقت میں قدرت کی طرف سے سرزمینِ بھدرواہ کے لئے بخشا ہوگراں قدر عطیہ ہے...... قدرت کا حُسن بکھرا ہوا ہے۔ یہاں ہر طرف قدرت کے حسن کی فسوں سازی کارفرما نظر آتی ہے۔ اس کوہستانی آبادی کے در و بام کا منظر خوبصورت ہے اور خود یہاں کے لوگ حسین ہیں۔ ظاہری صورت و شکل کے اعتبار سے بھی اور باطنی وصف' خلوص و محبت اور سادہ لوحی کے لحاظ سے بھی۔ بھدرواہ حقیقت میں صناعِ اِزل کے حسن صنعت کا نہایت ہی حسین و جمیل مرقع ہے۔ مجھے اِس پیکرِ جمیل سے پیار ہے۔ یہاں کے سادہ مزاج' ایثار لوگوں کا شیدائی ہوں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری ریاست کے بہت ہی قدیم اور اہم مورّخ کلہن کی "راج ترنگنی" میں بھدرواہ کی تاریخ کے متعلق کچھ حوالے ملتے ہیں' جن سے ہماری کچھ اُلجھنوں کا ازالہ ہوتا ہے۔ دراصل قدیم زمانے میں لوگ یہاں کے دُشوار گزار راستوں اور اِن راستوں میں پائے جانے والے جنگلی جانوروں اور کہیں کہیں ڈاکوؤں سے بھی خائف رہتے تھے اور یہ علاقہ بھی اپنی مخصوص جغرافیائی پوزیشن کی بنا پر ایک صدی پہلے تک الگ تھلگ ہی تھا اور صرف ڈوگرہ راج میں

جاگیر کی حیثیت سے اِس کی اہمیت کو سمجھا گیا اور آنجہانی مہاراجہ رنبیر سنگھ اور ہری سنگھ کی دور میں اس کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ آخرالذکر مہاراجہ ہری سنگھ کی دُوراندیشی کی بدولت یہ وادی ایک موٹر روڈ کے ذریعے سے ریاست اور ملک کے باقی حصّوں کے ساتھ ملادی گئی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے یہاں کی تعلیمی ترقی کی طرف خاص توجہ دی جس کو مہاراجہ ہری سنگھ نے بھی جاری رکھا۔

پروفیسر این۔ کول نے بھدرواہ کی خوبصورتی کے بارے میں اپنے تاثرات ''شاہین'' میں یوں قلم بند کئے ہیں:

''بھدرواہ کچھ ایسے مسحور کُن قابل دید جگہوں کے خوبصورت مناظر پیش کرتا ہے جو کسی بھی اعتبار سے سوئزرلینڈ سے کم نہیں ہیں۔ اپنی فرفیلی چوٹیوں کے ساتھ اس کے جنگلوں سے بھرے پہاڑ، بڑی سرسراہٹ بھرے تیز دھارے سے بہنے والے ندی نالے اور بادلوں کے جھنڈوں کے مناظر ہر کسی آنکھ کے لئے باعثِ سکون و راحت ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے فطرت کے جمال و کمال نے بھی ایسی عمارات کھڑی کی ہیں جو ہماری آنکھوں کے لئے کشش کا باعث بنی ہیں اور اِن میں مساجد و منادر اِنسان کے تئیں خداوند قدوس پر اعتقاد اور اِس کے مظاہر کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔''

جارج فارسلر، جب ۱۷۸۳ء میں بہ راستہ بھدرواہ سری نگر جاتے ہوئے چھتر گلہ (بلندی ۲۴۰۰ میٹر) پر پہنچا تو اُس نے اِس وادی کی اِلفاظ میں تعریف کی:

''جب مجھے اِس پہاڑی خطے میں اِس خوبصورت وادی پر پہلی نظر پڑی تو مجھے یہ سوئزرلینڈ کی طرح کھائی دی۔''

بھدرواہ کے دریا، ندی اور نالے

قدرت نے جہاں بھدرواہ کی حسین و جمیل وادی اور اِس قدیم سلطنت کے مختلف حصّوں کو قسم قسم کی انمول نعمتوں سے نوازا ہے، وہاں فلک بوس پہاڑوں سے

نکلنے والے بے شمار دریاؤں' ندی نالوں اور میٹھے پانی کے چشموں کے ایک حیران کُن نظام کی تخلیق کاری بڑی فیاضی سے عمل میں لا کر اس کی مجموعی ترقی اور خوشحالی کو یقینی بنا دیا ہے۔ یہ ندی نالے نہ صرف اِن علاقوں کی پیداوار کے حوالے سے آبی ضرورت کو کافی حد تک پورا کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہاں کی ماہی گیری صنعت کو بڑھاوا دینے میں مدد دیتے ہیں بلکہ اِن کے قدرتی حُسن کو بھی دوبالا کرتے ہیں۔ ان کے تیز بہاؤ سے پیدا ہونے والی صاف وشفاف پانی کی لہروں اور موجوں کی سرسراہٹ اور نغمگی کسی بھی صاحب نظر اور فطرت شناس اِنسان کو ایک فطری سکون بخشتی ہے۔

کوہِ کیلاش سے نکلنے والے ندی نالے

مرحوم نرسنگھ داس نرگس اپنی مشہور تاریخ ''تاریخ ڈوگرہ دیس'' میں کیلاش سے نکلنے والے دریاؤں اور ندی نالوں کا ذِکر یوں کرتے ہیں:

''کوہ کیلاش سے مشرق کی طرف سے دریائے سیاوہ' جنوب کی طرف سے دریائے اوجھ' مغرب کی طرف سے دریائے توی اور شمال کی طرف سے دریائے نیرو نکلتے ہیں۔ دریائے سیاوہ بنی پنیا لگ تحصیل بسوہلی سے گزرتا ہوا دریائے راوی میں متصل ہٹ گرتا ہے۔ اس جگہ کا نام سنگم مشہور ہے اور یہاں بسوہلی اور چمبہ کی حدود ملتی ہیں۔ دریائے اور اوجھ بلاور تحصیل اور رام نگر وادیوں کو سیراب کرتا ہوا گورداس پور کے نزدیک دریائے راوی سے جاملتا ہے اور موضع مکوال تحصیل جموں کے نزدیک دریائے چناب میں جا گرتا ہے۔ دریائے توی تحصیلِ جموں کے میدانی علاقہ کو سیراب کرتا ہے اور دریائے نیرو قصبۂ بھدرواہ کے نیچے سے گزرتا ہوا ڈوڈہ کے متصل دریائے چناب میں جاملتا ہے۔'' (تاریخِ ڈوگرہ دیس' ص ۱۶۸)

بھدرواہ کی طرف بہنے والے دریاؤں اور ندی نالوں میں ''نیرو'' اور ''ہلون'' قابلِ ذکر ہیں۔ نالہ ہلون کا رُخ چھتر دھار کے شمالی حصے سے بہتے ہوئے

موضع بستی کی طرف مڑ جاتا ہے۔ سرتنگل کی طرف آتے ہوئے یہ نالہ "مچھو گوجر" کی ہلونی نامی بہک سے گزرتا ہے۔ ہلونی بہک کی نسبت سے اس کا نام ہلونی پڑ گیا ہے۔ موضع گڑھ اور موضع سرتنگل سے آگے نکل کر مونڈہ گاؤں کے مقام پر کوہ آشاپتی سے آتے ہوئے دریائے نیرو کے ساتھ مل جاتا ہے۔ کیلاش کی طرح ہی کوہ آشاپتی وادئ بھدرواہ کے حسن اور خوبصورتی میں چار چاند لگاتا ہے۔ مسٹر دیس راج کاٹل اپنے ایک مضمون "اٹھکھار" میں نالۂ ہلون کی قدیم گزرگاہ کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

"موجودہ سرتنگل اور گڑھ کے نیچے جو نئی بستی آباد ہو رہی ہے، جس کا نام "ہروت نگر" رکھا گیا ہے، ایک ہی سطح پر تھے۔ اِن کے درمیان آج جو گہرا رہا ہے، یہاں پر نہیں بہتا تھا بلکہ یہ سرتنگل جنوب مشرق کی جانب سے بہتا ہوا ہلون نالہ بہہ سرتنگل اور پاور ہاؤس سرتنگل کے بیچوں بیچ بہتا ہوا بمقام راؤ نالہ نیرو میں ملتا تھا۔ تب اِن دونوں نالوں کا سنگم بہ مقام "راؤ" جو کہ آج کل بہ مقام گھانگو بنا ہوا ہے۔ نالۂ ہلون کا رُخ غالباً دوسرے بڑے تباہ کن سیلاب کے بعد بدلا، جس سے کہ اودھا نگر (پرنا ی راجدھانی) بُردِ آب ہو گیا۔"

کہا جاتا ہے کہ دریائے نیرو دو ندیوں یعنی نیرو" اور" کالگنڈی" کے ملنے سے وجود میں آتا ہے، جو آشاپتی اور کیلاش کے پہاڑوں سے نکلتی ہیں۔ یہ دریا موضع مونڈہ سے نکل کر بڑی آب و تاب کے ساتھ قصبۂ بھدرواہ اور اِس کی وادی کے دیگر علاقوں سے مشرق کی طرف سے پہاڑی دامن کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔

دوسری طرف کوہِ کیلاش سے ہی نالہ پونیجہ نکلتا ہے جو آگے جا کر "ہالیاں" کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ یہ نالہ قصبہ بھدرواہ کے بیچوں بیچ نکل کر موضع کوٹلی سے گزرتے ہوئے اور سرولباغ سے بہتے ہوئے نیرو میں مغرب کی طرف ملتا ہے۔ سیونج دھار سے ایک اور اہم نالہ موضع مٹھولہ سے گزرتے ہوئے موضع چکہ سے آگے

نکل کر اُدرانہ کے نشیبی حصّہ میں دریائے نیرو کے ساتھ ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ اس دریا کے ساتھ موضع چنوت کا نالہ بھی کوٹلی کے بالائی حصے میں مِل جاتا ہے۔ وہ نالہ بھی کیلاش اور سیوج دھار کی دین ہے۔ یہ سب ندی نالے بھدرواہ کی ترقی کے لئے ایک شہہ رگ کے مترادف ہیں۔ نالہ ملینی بھی رینڈہ کے مقام پر نیرو سے جا ملتا ہے۔ یہ پہلے بڑا تیز رفتار نالہ ہوا کرتا تھا لیکن اب کچھ عرصہ سے اس کے پانی میں بہت کمی آگئی ہے۔ نیرو کے طاس میں موضع مونڈہ، دریچہ، اٹال گڑھ، رینڈہ، سرولباغ، کرساڑی، درنگہ، بھالا، پرانوں اور بیرڑو جیسے معروف دیہات آتے ہیں۔

نالہ نیرو کے ساتھ علاقہ کیلاڑ سے آنے والا نالہ بن کڈ بھالا کے مقام پر مِل جاتا ہے جس پر ایک پختہ پل تعمیر ہوا ہے۔ آج کل اِس نالہ پر تقریباً پانچ بڑے اسٹیل برج تعمیر کئے جا رہے ہیں، جن پر کروڑوں روپے خرچ ہو رہے ہیں۔ دریائے نیرو پل ڈوڈہ کے مقام پر دریائے چناب سے مِل کر اپنا وجود کھو دیتا ہے لیکن اس کے نیلے پانی کا حسن آخر تک قائم رہتا ہے۔ بھدرواہ کی آبی زمین سے حاصل ہونے والی دھان کی پیداوار اور پبلک ہیلتھ سسٹم کے ذریعے پینے کے پانی کی فراہمی کا سارا دارومدار ان ہی ندی نالوں پر ہے۔ بھدرواہ کے دریا اور ندی نالے بہ حیثیت مجموعی یہاں کی اِقتصادی ترقی کے لئے ریڈھ کی ہڈی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

کشمیر سے آنے والے یا کشمیر کی طرف جانے والے راستے

۱۔ جموں۔ سروئیں سر۔ رام نگر۔ ڈوڈہ۔ بھدرواہ (دو پڑاؤ)

۲۔ مادھو پور۔ تھین۔ بسوہلی۔ لونگ۔ بھدرواہ۔ جنگواڑ۔ کشتواڑ۔ سری نگر (گیارہ پڑاؤ)

۳۔ چمبہ۔ تھین۔ بسوہلی۔ لوانگ۔ بھدرواہ۔ جنگواڑ۔ کشتواڑ۔ سری نگر (گیارہ پڑاؤ)

۴۔ جموں ۔ اُدھم پور۔ چھنّی ۔ اسر۔ جنگلواڑ۔ کشتواڑ۔ سری نگر (گیارہ پڑاؤ)

گرم میدانی علاقوں سے آنے والے اور پیدل چلنے والے لوگ اِن پہاڑی وادیوں کی خاموشی اور پر سکون خوبصورتی کا لُطف اُٹھایا کرتے ہوں گے۔ چمبہ۔ بھلیس ۔ بھدرواہ اور کشتواڑ کے لوگ جن دوسرے رابطہ راستوں کا اِنفرادی طور پر استعمال کرتے تھے، وہ بلند و بالا مقامات پر واقع درّوں میں سے گزرتے تھے جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

۱۔ چھتر گلہ (۷۰۰۰ فٹ اونچا[۱]) بھدرواہ کو بسوہلی سے ملاتا ہے۔

۲۔ پدری پاس (۱۰۰۰۰ افٹ اُونچا) چمبہ کو بھدرواہ سے ملاتا ہے۔

ڈنگانی درّہ (۱۲۱۰۵ اُونچا) چمبہ کو بھلیس سے ملاتا ہے۔

۴۔ میل واڑی پاس (۱۳۰۴۷ افٹ اُونچا) چمبہ کو بھلیس سے ملاتا ہے۔

۵۔ نے رنگواڑی درّہ (۱۴۷۴۷ افٹ اُونچا)

۶۔ گیٹیو پاس (۱۴۷۶۰ افٹ اُونچا)[۲]

علاقہ بھلیس، چمبہ کی چوہڑہ ذرات کے ساتھ مختلف درّوں کے ذریعے ملا ہوا تھا جن میں پدری گلی (۱۰۰۰۰ افٹ)، (درۂ بارُن ۱۲۱۰۰ افٹ)، ڈگانی درّہ (۱۲۸۶۲ افٹ) اور میلوڑا ای پاس (۱۳۰۴۷ افٹ) شامل ہیں۔

بٹوت بھدرواہ روڈ، مہاراجہ ہری سنگھ کا تحفہ

بٹوت، بھدرواہ موٹر روڈ کی تعمیر مہاراجہ ہری سنگھ کا بھدرواہ نواسیوں کے لئے ایک عظیم تحفہ تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنی جاگیر ''بھدرواہ'' کا ۱۹۲۱ء۔ ۱۹۲۲ء کی

۱:۔ کچھ حضرات نے اس کی بلندی ۱۰۱۰۰ افٹ بتائی ہے جو دُرست معلوم ہوتی ہے۔

۲:۔ بحوالہ ''ہمالین پرنسی پیلیٹیز' ڈاکٹر کول، ص:۱۲۶۔۱۲۷

اِس ذاتی جاگیر کا ناظمِ اعلیٰ بھی بنا۔ مہاراجہ صاحب بھدرواہ میں تقریباً ایک ہفتہ ٹھہرے۔ بٹوت سے بھدرواہ تک کے سفر کے دوران راجہ کو پیش آنے والی دُشواریوں اور خطرات کا بخوبی احساس ہوا۔ دوسری طرف اس دشوار گزار اور تنگ پیدل راستے کے مختلف مقامات پر لوگوں نے سواگتی تقریبات کے دوران ''بٹوت تا بھدرواہ موٹر روڈ'' کی تعمیر کا پُر زور مطالبہ کیا۔ بھدوارہ جاگیر کے ساتھ اُن کا ذاتی لگاؤ تھا ہی، اِس لئے اُنہوں نے اس دورہ کے دوران ہی جاگیر کی خوبصورتی اور اِس کے جنگلات کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے لوگوں کے مطالبے کو پورا کرنے کا اعلان کر دیا اور کہا کہ بھدرواہ تا بٹوت روڈ کا فوری طور پر سروے کروا کر اِس کی تعمیر کا کام شروع کیا جائے گا۔ چنانچہ عوام اور حکومت کے مفاد میں دربار نے اِس سڑک کی تعمیر کے سلسلہ میں ایک منصوبے کی منظوری دے دی، جس کے لئے ابتداء میں چالیس ہزار روپے رقم منظور کی گئی۔

بھدرواہ سے بٹوت تک کا پورا راستہ پہاڑی اور دُشوار گزار تھا اور لوگ عام طور پر پیدل ہی سفر کرتے تھے۔ اِس سڑک پر تعمیر کا کام ۱۹۳۷ء میں شروع ہوا۔ اس کی مجوزہ لمبائی پچاس میل تھی۔ اس سڑک پر تقریباً سات سال بڑے زور و شور سے کام ہوا اور ایک کچی سڑک کی شکل میں اِس کو ۱۹۴۳ء میں باضابطہ موٹر ٹریفک کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا۔ پہاڑی چٹانوں سے نکالے جانے کی وجہ سے اِس سڑک کے کچھ موڑ تنگ، خطرناک اور جان لیوا ثابت ہوتے رہے۔ اِس پر کئی حادثات واقع ہوئے جن میں کئی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں۔ رگی نالہ، کھلینی اور ملہوری موڑوں کا نام سنتے ہی لوگ خوف سے لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ جموں سے بھدرواہ تک کا کل فاصلہ دو سو کلو میٹر ہے۔ اوّل اوّل اس پر دس سیٹوں والی لاریاں چلتی تھیں اور چھوٹی کاریں وغیرہ بھی۔ لاریوں کے پچھلے حصّے میں دکانداروں کا سامان، سودا سلف لادا جایا کرتا

تھا۔ بسا اوقات سواریوں کو مال سے بھری ہوئی بوریوں پر بیٹھ کر سفر کرنا پڑتا تھا اور راستے میں ہچکولوں سے اُن کی کافی دُرگت ہوجاتی تھی لیکن اِس سڑک میں آہستہ آہستہ سدھار آجانے سے ان تکالیف کا ازالہ ہوتا گیا۔

۱۹۵۸ء میں پل ڈوڈہ سے ٹھاٹھری تک اور ۱۹۶۲ء میں ٹھاٹھری سے کشتواڑ تک کا راستہ گاڑیوں کی آمدورفت کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا۔ مرحوم اوم مہتہ نے بٹوت سے کشتواڑ تک کی سڑک کو نیشنل ہائی وے B-1 کا درجہ دِلا کر کشادہ اور پختہ کروایا۔ اِس کا فاصلہ ۱۰۲ کلو میٹر ہے۔

۱۹۸۱ء میں نیابت ٹھاٹھری کو تحصیل کا درجہ دیئے جانے اور نیشنل ہائے وے ون۔ بی پر واقع ہونے کی وجہ سے اِسے مرکزی مقام کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ کشتواڑ گندوہ، سرینگر، جموں، بٹوت، ڈوڈہ بھدرواہ وغیرہ کے مقامات سے آنے جانے والی گاڑیاں ٹھاٹھری بازار میں رُک کر یہاں کی رونق کو دوبالا کرتی ہیں۔

قصبہ بھدرواہ

موجودہ قصبہ ''بھدرواہ'' ضلع ڈوڈہ کا خوبصورت ترین قصبہ ہے، جس کی حسن وخوبصورتی کے بارے میں کئی تذکرہ نگاروں اور سیاحوں نے اپنی اپنی طرز سے قصیدے لکھے ہیں۔ اِس قصبے کی بنیاد تقریباً آٹھویں صدی عیسوی کے بعد ہی پڑی جب کہ پرانے قصبہ ڈونگا نگر اور اودھانگر کو ایک طوفانِ عظیم نے صفحہ ہستی سے مٹا ڈالا تھا۔ وہ قصبہ علاقہ اٹھکھار کے خوبصورت ترین مقام پر آباد تھا اور قدیم مملکت بھدرواہ کا دارالخلافہ بھی تھا، جو سرتنگل کے نزدیک گڑھ سے مونڈہ تک پھیلا ہوا تھا۔ نالہ ہالون اِس کے بیچوں بیچ سے گزرتا تھا، جو بالآخر اِس کی تباہی کا موجب بنا۔ ڈونگا نگر اور اودھانگر کا قصبہ وادئ بھدرواہ سے بسوہلی اور بڈھو کے علاوہ چمبہ کے علاقوں کی طرف جانے والے راستوں کا مشہور نقطۂ آغاز تھا۔ وادیٔ بھدرواہ میں داخل ہونے

کے لئے بھی یہ ایک گزرگاہ کے مصداق تھا۔ وادیٔ کشمیر سے بھی آنے جانے والے لوگ یہاں سے ہی گزرتے تھے۔ کچھ تذکرہ نگاروں کے مطابق اس قصبے کے آس پاس ایک قدیم یونی ورسٹی بھی قائم تھی، جس میں سینکڑوں طالب علم رہائش پذیر ہوکر سنسکرت اور دیگر علوم سے فیض یاب ہوتے تھے۔ اس بارے میں ہمیں کوئی تاریخی سند دستیاب نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی مذکورہ قدیم قصبے یا راجدھانی کے بارے میں ہمارے پاس کوئی مستند ثبوت موجود ہے۔ بس سینہ بہ سینہ چلی آ رہی روایات ہی کو ہم مصدقہ ثبوت تسلیم کرتے آئے ہیں۔

تواریخی شواہد سے یہ بات طے ہے کہ موجودہ قصبہ جو عرفِ عام میں ''نگر'' کے نام سے مشہور ہے، پرانے قصبے کی بربادی کے بعد آباد کیا گیا۔ یہ شاید اس وجہ سے ہوا کہ ہالون اور نیرو کے نالوں کے طوفانی خطروں سے یہ جگہ محفوظ تھی اور موجودہ بازار سیری کسی جاگیردار کی مملکت میں ایک بہت بڑے ہموار قطعہ زمین کی صورت میں دستیاب تھا اور ساتھ ہی یہاں پر قدیم منادر کی موجودگی لوگوں کی مذہبی رسومات کی انجام دہی کے لئے سکون واطمینان کا باعث تھی۔ ان میں واسک ڈیرہ میں تعمیر شدہ واسک ناگ کا مندر اور نالہ نیرو کے دائیں کنارے (یعنی مشرق میں) گپت گنگا کا قدیم مندر قصبہ سے ایک کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے، جو بڑے بڑے پتھروں سے تراشی گئی ٹائلوں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ واسکی ناگ مندر میں واسکی ناگ کی دو مورتیاں اور جُمت وہاں کی مورتی نصب کی گئی ہے۔ یہ دونوں منادر تاریخی اور مذہبی لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس قصبہ میں کچھ اور مندر بھی ہیں جن میں بازارِ سیری میں لکشمی نارائن مندر، پاسری مندر اور محلہ قلعہ کا مندر پرانے منادر ہیں۔ قصبہ کے بیچوں بیچ ایک عالی شان جامع مسجد ہے اور درجنوں محلہ مساجد تعمیر کی گئیں ہیں۔ بھدرواہ میں کئی زیارت گاہیں بھی موجود ہیں اور مرجع خلائق ہیں۔

موجودہ قصبہ چاروں طرف سے سرسبز و شاداب جنگلات اور پہاڑی سلسلوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ قصبہ محلّہ رُنتہ (محلّہ قلدہ کے بالائی حصے میں قلعہ بھدرواہ کے نزدیک ایک موضع کا نام ہے، جواب مونسپل کمیٹی کی حدود میں آگیا ہے) کی اُترائی سے گپت گنگا کے نشیبی حصّے تک اور قصاباں محلّہ (متصل قبرستان) سے گاٹھہ تک پھیلا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں بھدرواہ قصبہ میں ایک میونسپل کمیٹی قائم تھی، جسے بعد میں ٹاؤن ایریا کمیٹی میں تبدیل کیا گیا۔ کچھ عرصہ پہلے یہ قصبہ نوٹیفائڈ ایریا میں تبدیل کیا گیا لیکن موجودہ گورنمنٹ نے باقی قصبوں کے ساتھ ساتھ اس کا درجہ بڑھا کر اِسے بھی میونسپل کمیٹی میں بدل ڈالا ہے۔

قصبہ بھدرواہ بیرونی سیاحوں کی نظر میں

اس قصبہ کے بارے میں کچھ انگریز سیاحوں نے اپنے سفرناموں اور تذکروں میں اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں جن میں چارلس ایلی سن بیٹس، جی ٹی وائن اور فریڈرک ڈریو وغیرہ شامل ہیں۔ جی ٹی وائن نے اس علاقے کی سیاحت ۱۸۳۹ء میں کی تھی۔ اُس کے سفرنامے کی پہلی جلد لندن سے ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی۔ بھدرواہ کے بارے میں وہ یوں لکھتا ہے۔

"بدروار" بدھ کا مضبوط گڑھ نہایت خوبصورت ملک کے مرکز میں واقع ہے۔ کشمیر کو چھوڑ کر ایسا خوبصورت مقام پہاڑوں میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ میرا تھرمامیٹر (بیرومیٹر) ۵۰۰۰ کی بلندی ظاہر کر رہا ہے۔ کشمیری اسے "بدرکار" کہتے ہیں اور پہاڑیوں کے باشندے اِسے "بدر" پُکارتے ہیں۔"

بھدرواہ کی کشمیری آبادی اسے "بدرکا" کہتی ہے "بدرکار" نہیں۔ اسی طرح غیر مسلم باشندے اِسے "بڈلہ" کہتے ہیں۔ جی ٹی وائن اس وادی کے بارے میں مزید لکھتا ہے کہ:

"بھدرواہ سے راستہ بھدرواہ ندی کے بائیں کنارے تدریجاً بلند ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ یہ بیضوی دائرے میں جانکلتا ہے، جس کے نشیبی حصے دھان کے کھیتوں سے وابستہ ہیں جب کہ فراخ اور کم ڈھلوان حصّے زیادہ تر قابلِ کاشت تھے، جہاں آباد گاؤں واقع ہیں اور جن پر دیودار کے درخت سایہ فگن ہیں۔ یہ گاؤں اِن پہاڑی خطوں کے مقابلہ میں، جو میں نے علی العموم دیکھے تھے، نسبتاً بہتر حالت میں تھے۔"

قصبۂ بھدرواہ کے بارے میں وائن اپنے تاثرات یوں بیان کرتا ہے:

"......میرے خیال میں قصبہ بمقابلہ کشتواڑ دوگنا بڑا ہے۔ اس میں دوسو سے تین سو گھر تھے۔ اِن تمام پہاڑی قصبات کی آبادی کا معتد بہ حصہ کشمیری ہیں، جو اپنے وطنِ مالوف کے حکمرانوں کے ظلم وستم سے بچنے کے لئے اِن علاقوں میں فرار ہوئے ہیں۔

خاص بازار کی سمت جنوب مغربی ہے اور شمال کی طرف قلعہ ہے جو قصبہ کی حفاظت کرتا ہے۔ قلعہ بڑا اور مربع (شکل کا) ہے جو سلیٹ کے بڑے بڑے پتھروں سے بنایا گیا ہے۔ یہ پتھر قرب وجوار میں ملتے ہیں۔ یہ دوسرے پہاڑی قلعوں کے مقابلہ میں بڑا عجیب وغریب مقام ہے۔ اس قلعہ کی پشت پر جنگلات سے بھرپور پہاڑیاں اس کی حفاظت کرتی ہیں۔"

وائن نے اُس وقت کی غذائی حالت کا نقشہ کھینچا ہے جس سے عیاں ہوتا ہے کہ بھدرواہ میں ارزانی کا دَوردورہ تھا۔

"......چار سیر گندم کا آٹا جو تین انگریزی پونڈ کے برابر ہے' عام طور پر اک پنس سے کم میں فروخت ہوتا ہے۔ اسی قیمت پر تین سیر چاول اور آٹھ سیر جو دستیاب ہوتے ہیں۔ ایک عمدہ بھیڑ ایک روپے سے، جو دو شلنگ کے برابر ہے، فروخت ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بازار میں اشیائے تجارت کی فراوانی تھی۔ اڑھائی صد

کے قریب شال کے کرگھے (کھڈیاں) تھیں لیکن مصنوعات عمدہ قسم کی نہ تھیں۔ سیب کے درخت کی لکڑی سے عمدہ خوبصورت اور منقش کنگھے بنائے جاتے ہیں۔ موسم گرما میں ایک بلند درّہ کو عبور کر کے چار یا پانچ گھنٹے میں چمبہ جا سکتے ہیں یا دوسرے درّے چھاترو دھار (چھتر دھار) کے ذریعے بسوہلی۔ دونوں درّے برف نے جنوری ۱۸۳۹ء میں، جب کہ میں وہاں تھا، بند کر دیئے تھے۔"

وائن نے ڈائینوں کی موجودگی کا یوں ذکر کیا ہے جو کشتواڑ اور بھدرواہ میں اُن دِنوں موجود تھیں:

"...... بھدرواہ میں ایک بوڑھی عورت میں نے دیکھی جو اُس وقت ساحرہ یا ڈائین کی حیثیت میں لائی گئی تھی۔ اگر کوئی حاکم بیمار پڑ جائے اور اُس کی بیماری دوا کے اِستعمال سے دور نہ ہو سکے تو ایسی بوڑھی عورت کی تلاش کی جاتی ہے جس کے پاؤں اندر کی طرف مڑے ہوئے ہوں۔ اُس پر ڈائین ہونے کا اِلزام عائد کیا جاتا ہے اور شاید اُس کی ناک کاٹ لی جاتی ہے، یا شاید اُسے موت کے گھاٹ اُتارا جاتا ہے۔ میری اِستدعا پر اُس ڈائین کو میرے سامنے لایا گیا۔ ڈائین جیسے تاثرات، جو اُس کے چہرے سے عیاں تھے یقیناً میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ شروع شروع میں وہ بے حد خوف زدہ تھی لیکن اُس کا خوف کچھ کم ہو گیا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ میں اُس کے لئے حکام سے سلسلہ جنبانی کر رہا تھا۔ جب تک میں قصبہ میں رہا اُسے کسی نقصان سے بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ سزا یہ بھی ہے کہ تانبے کا سکہ گرم کر کے ماتھے پر داغا جاتا ہے......"

"...... الپائن پنجاب کے باشندے عام طور پر ہندو ہیں۔ وہ تنومند اور پھرتیلی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ میدانی باشندوں کے مقابلے میں کوتاہ قد اور مضبوط جسم کے ہیں۔ اُن کے نقش خوبصورت، رنگ سفید اور اخلاق پسندیدہ ہیں......"[1]

---

[1] ہمارا ادب ۱۹۶۵ء ص ۲۰۷-۳۰۷ عشرت کشتواڑی

فریڈرک ڈریو "دی ٹیری ٹریز آف جموں اینڈ کشمیر" کے صفحہ نمبر ۱۰۳ تا ۱۰۵ء پر بھدرواہ قصبے کا یوں ذِکر کرتے ہیں۔

بھدرواہ کا مصروف قصبہ اس قسم کے پہاڑی علاقے میں مقابلتاً ایک بڑی جگہ ہے۔ یہاں اندازاً چھ یا سات سو گھر اور تقریباً تین ہزار لوگ ہیں۔ بھدرواہ میں ایک کھلا بازار ہے۔ ایک لمبی گلی قلعہ کی جانب جاتی ہے۔ دو یا تین بازار، دو مسجدیں اور ایک بڑا مندر واقع ہے......"

"......قصبہ میں بنے ہوئے گھر تقریباً سالم دیو دار کی لکڑی کے ہیں اور گھروں کے ڈھانچے بھی لکڑی کے ہی ہیں۔ البتہ دوسرے تختوں کے درمیان خالی جگہ کو پتھروں سے بھرا جاتا ہے جو بعض اوقات ڈھیلے چھوڑے جاتے ہیں اور بعض دفعہ گارے سے جوڑے جاتے ہیں۔ بہت سے گھروں کی چھتیں ڈھلوانی قسم کی ہوتی ہیں جن پر شنگل لگائے جاتے ہیں۔ کناروں پر کھمبے لگانے کے لئے بعض اوقات انوکھے قسم کے طریقے اپنائے جاتے ہیں اور بعض اوقات مکان یا مندر کے بیچ میں سہارا دینے کے لئے اِنہیں لگایا جاتا ہے۔ کچھ اِنچ موٹے لکڑی کے سِلوں کو جوڑوں کی صورت میں سیدھے اُوپر کی طرف کھڑا کیا جاتا ہے وہ اس طرح کہ ایک جوڑا، دوسرے جوڑے کو زاویہ قائمہ پر قابو میں رکھے ہوئے ہوا اور وہ بھی یکے بعد دیگرے......"

"......ایک ندی کا پانی قصبہ کے عین درمیان میں سے گزرتا ہے اور اُس میں سے نکالی ہوئی شاخیں تمام گلیوں میں سے گزاری جاتی ہیں۔ عمارتوں کے درمیان اور قصبہ کے گردونواح میں میوے دار درخت لگائے گئے ہیں۔ سیب، ناشپاتی، شہتوت، خوبانی اور گلاس وغیرہ۔ یہاں سفیدوں کے درخت، چنار اور چپٹی سطح کے درخت بھی ہیں۔ درختوں میں سفیدے اور چنار کے درخت پائے جاتے

ہیں......"

وہ مزید لکھتا ہے:

"......ان خصوصیات کے علاوہ یہاں کی موسم گرما کی خوشگوار آب و ہوا اور کشمیری نژاد لوگوں کی ایک کثیر تعداد کی وجہ سے اِس علاقے کو "چھوٹا کشمیر" کے نام سے شہرت ملتی ہے......"

"...... بھدرواہ کے نصف سے بھی زیادہ باشندے کشمیری ہیں۔ اُنہوں نے یہاں کے اصلی ہندو باشندوں کو پس پشت ڈالا ہے۔ اُنہوں نے تقریباً ہر قسم کی نوکریاں اِختیار کی ہیں۔ اُن میں سے کئی دکاندار اور اُس سے بھی زیادہ امرتسر اور نورپور والوں کی فرمائش پر شال بافی کے کام میں مصروف ہیں۔ کچھ کشمیریوں کے پاس زمین ہے اور وہ اِس کی خود کاشت کرتے ہیں۔ کچھ یہ کام بے شک نصف سال تک کرتے ہیں اور سال کے دُوسرے نصف حصّے میں شال بافی کرتے ہیں، جو عموماً طویل برفیلے موسم سرما میں کیا جاتا ہے......"

"......گردونواح میں بہت سے کشمیریوں کے گاؤں ہیں لیکن قصبے کے باہر اُن پر بھدرواہیوں کی غالب اکثریت ہے جو یہاں کے قدیم باشندے ہیں۔ میں یہ نہ سمجھ سکا کہ کشمیریوں کی اِتنی بڑی تعداد یہاں پر کب آباد ہوئی۔ لیکن اِس موضوع پر کسی واضح روایت کی عدمِ موجودگی کی بنا پر ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ایسا کچھ تین یا چار نسلوں سے قبل وقوع پذیر ہوا تھا......"

"......سطح سمندر سے ۵۴۰۰ فٹ کی بلندی سال کے ایسے موسم میں اس جگہ کو موافق درجہ حرارت بخشتی ہے جسے بہت سے لوگ پسند کرتے ہیں۔ بعض اوقات برطانوی رجمنٹ کے یا گلّو میں مقیم گورکھے اپنے بال بچوں کو یہاں لاکر اپنی چھٹیاں بھدرواہ میں ہی گزارتے ہیں۔ یہاں اُنہیں بہتر آب و ہوا اور سستی بودوباش کے

فائدے حاصل ہوتے ہیں......"

"......قصبے کے اُوپر ایک نمایاں مقام پر قریباً تین سو فٹ کی اُونچائی پر ایک قلعہ ہے، جو لکڑی اور پتھر سے بنی ہوئی ایک مربع شکل کی عمارت ہے، جس میں پتھروں سے بنائی گئی بُرجیاں بھی ہیں۔ کچھ تو قدیم راجاؤں کے رہائشی مکانوں کے کھنڈر ہیں۔ بھدرواہ کے راجے میاں راجپوت تھے جن کا شجرۂ نسب گلّو اور بسوہلی کے خاندانوں سے ملتا تھا۔"

اِس قلعہ کے بارے میں جی ٹی وائن نے اپنے سفرنامہ (۱۸۳۹ء) میں لکھا ہے کہ:

"قصبہ جنوب کی طرف سے ۳۰۰ فٹ کی اُونچائی پر ایک پہاڑی پر واقع ایک قلعہ کی کمانڈ میں ہے، جو ایک بھاری عمارت ہے اور جس کے کونوں پر تعمیر کی گئی بُرجیاں مقامی مٹی سے بنی بڑی بڑی سِلوں پر مشتمل ہیں جو ہوا اور سورج کی تپش میں کھلا رہنے سے پختہ ہوتی ہیں۔ یہ مٹی مقامی طور پر دستیاب ہے۔ دیواروں میں گولہ باری کے لئے شگاف یا سوراخ بنائے گئے ہیں۔ اِس قلعہ میں چار توپیں داغی جاتی ہیں۔ اس قلعہ میں پچاس نفوس پر مشتمل ایک حفاظتی دستہ بھی ہے۔ اِس کا محلِ وقوع بڑی جنگلی اُونچائیوں کے دامن میں ہے جہاں تک مغرب اور جنوب کی طرف سے آسانی سے پہنچا جاسکتا ہے......"

وہ قصبہ کے بارے میں مزید لکھتا ہے کہ

"...... اِس صوبے (یعنی بھدرواہ) کے نام سے موسوم بڑا قصبہ ایک خوبصورت اور زیرِ کاشت وادی میں نالہ نیرو کے بائیں کنارے کے مغرب کی طرف قریباً ایک چوتھائی میل پر واقع ہے، جو قصبہ کے نچلے حصّے میں بڑے بڑے پتھروں سے بنے ہوئے اُونچے کناروں میں سے ایک ندی کی صورت میں بہتا ہے۔ یہ دو

پلوں سے عبور کیا جاتا ہے۔ ایک قصبہ کے شمال مشرق میں ہری پور کے نیچے اور دوسرا جنوب مشرق میں موضع دھریچہ کی طرف جانے والی گزرگاہ پر۔ اِس نالے کو مختلف گھاٹیوں سے بھی عبور کیا جاسکتا ہے......"

"...... قصبے میں تقریباً ۴۰۰ گھر ہیں جن میں سے دوسو گھر ہندوؤں کے ہیں۔ یہاں کے بازار میں ساٹھ (۶۰) ہندو دکاندار اور پچاس (۵۰) شال باف ہیں۔ اِس کے علاوہ ایک سو ساٹھ (۱۶۰) مسلم گھرانے بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں پر ۴۰۰ کھڈیاں بھی ہیں جن میں سے صرف نصف کھڈیوں پر کام ہوتا ہے......"

"...... یہاں کے مکانات بغیر صاف کئے ہوئے پتھروں اور گارے سے بنائے جاتے ہیں جو لکڑی کی تہوں سے جوڑے جاتے ہیں۔ یہ عام طور پر ایک ہی ہموار چھت والے ہوتے ہیں۔ اِن میں سے کچھ بہتر طرز کے دومنزلہ بھی ہوتے ہیں جن کی چھتیں ڈھلوانی ہوتی ہیں۔ گلیوں میں کھردرے پتھر لگے ہیں جو غیر ہموار اور گندی ہیں۔ اشیائے خوردونوش سستی اور وافر مقدار میں دستیاب ہیں۔ چاول کافی مقدار میں برآمد کیا جاتا ہے۔ قصبے میں سات چشموں کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ اِس قصبہ میں موضع مونڈہ کے آس پاس سے ایک نہر کے ذریعہ سے پانی لایا گیا ہے جو وہاں سے نالہ نیرو کے ساتھ ساتھ بہتی ہے۔ بھدرواہ کے بنے ہوئے شال کھردرے قسم کے ہیں، تاہم شال بافوں کو کھلی آزادی ہے۔ وہ ساڑھے چار روپے ماہوار کماتے ہیں......"

"...... دُشوار گزار درّوں میں سے گزرنے کی مشکلات کی وجہ سے بھدرواہ کی تجارت یہاں کی مقامی پیداوار پر ہی منحصر ہے، البتہ بسوہلی کے ساتھ پشمینہ کی محدود سی تجارت بھی ہوتی ہے۔ اس کے بدلے میں چند ایک برطانوی چیزیں درآمد کی جاتی ہے۔ قصبے میں سے گزرنے والی اشیا پر ایک فی صدی محصول لگایا جاتا ہے۔

جارج فارسٹر نے اپنے سفر نامہ بھدرواہ کا ذِکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جب میں پدری کے مقام پر پہنچا تو بھدرواہ مجھے ''سوئزرلینڈ'' جیسا لگا۔'' اُس نے ۱۷۸۳ء میں بھدرواہ کی سیاحت کی تھی۔ قصبۂ بھدرواہ کی خوبصورتی کو مرزا عارف نے اپنے ایک مضمون میں اِن دلکش الفاظ میں سمیٹ لیا ہے۔'' قصبہ بھدرواہ چھوٹے کشمیر کی طرح ہی حسین و جمیل ہے۔''[۱]

ناصرائے زرگر ''دی ویلی آف چناب'' کے صفحہ ۲۱۱ پر وادی اور قصبہ بھدرواہ کا یوں ذکر کرتے ہیں کہ...... ''وادیٔ بھدرواہ قدیم قسم کی دیہاتی خوبصورتی اور دورِ حاضر کی چندھیا دینے والی جدّت پسندی کے خوبصورت اِمتزاج اور قصبۂ بھدرواہ قدیم حسن و جمال اور عصری تمول اور امارت کا رنگا رنگ مظاہرہ پیش کرتا ہے۔ پس اِس حسین وادی کی یہی فسوں گری اور بھدرواہ کا یہی جادو ہے۔'' (ترجمہ: بشیر بھدرواہی)

بھدرواہ کا حدود اربعہ اور محل وقوع

چارلس ایلی سن بیٹس کے ''گزیٹیر آف کشمیر'' میں بھدرواہ خاص کا عرض بلد ۳۲ء۵۹ اور طول بلد ۷۵ء۴۵ دِکھایا گیا ہے، جبکہ اِس کی سطح سمندر سے بلندی ۵۴۲۷ فٹ بتائی گئی ہے۔ پروفیسر شبیر احمد قاضی کے مطابق بھدرواہ ۳۰ء۳۵ اور ۷۶ء۱۵ مشرقی طول بلد اور ۳۲ء۵۰ اور ۳۳ء۱۰ عرض بلد شمال کے درمیان واقع۔ ایس۔ ڈی۔ سوتنترا کے مطابق ''اِس کے جنگلات کی حدود ۳۲ء۷۵ اور ۷۶ء۱۵ مشرق طول بلد اور ۳۲ء۵۲ اور ۳۸ء۱۱ شمالی طول بلد کے درمیان پڑتی ہیں۔ یہ علاقہ شمال میں دریائے چناب اور کشتواڑ کے علاقہ، مشرق میں کشتواڑ اور چمبہ کے علاقوں، جنوب میں چمبہ اور بسوہلی کے علاقوں کی سرحدی حدود میں آتا ہے۔''

[۱]۔ شیرازہ، رسا نمبر، اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز

مشہور سیاح جی ٹی وائن کے مطابق ''قصبہ بھدرواہ جموں کے شمال مشرق میں ۱۰۲ میل، کشتواڑ کے جنوب میں ۴۶ میل، چمبہ کے شمال مغرب میں ۶۰ میل اور بسوہلی کے شمال میں ۶۵ میل کی دوری پر واقع ہے۔'' جب وائن سیاحت کرتے ہوئے بھدرواہ پہنچا تو دُور سے بھدرواہ کا محل وقوع دیکھ کر ''اُسے انگلستان یاد آیا۔'' ضلع ڈوڈہ کا یہ خوبصورت ترین قصبہ وادیٔ بھدرواہ کے عین مرکز میں واقع ہے اور چاروں طرف سے فلک بوس اور برف پوش پہاڑوں اور قسم کے جنگلی درختوں کی آغوش میں آباد ہے، جو اِس کی خوبصورتی، حُسن اور اِس کی دِلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔ ٹیلوں، اُونچائیوں اور پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر گھنے جنگلات کے درمیان بسائے گئے گاؤں اور چھوٹی بڑی بستیاں، جہاں اِس کی رونق کو دوبالا کرتی ہیں وہاں ڈھلوان سطح اور پہاڑوں کے دامن میں ہموار سطح میں زینہ بہ زینہ پھیلے اور لہلاتے ہوئے کھیت اور وادی سے گزرنے والے بل کھاتے ہوئے ندی نالے اور نہریں یہاں پر آنے والوں کا دل موہ لیتے ہیں۔، موسم گرما میں یہاں کی خوشگوار آب و ہوا عام لوگوں اور سیاحوں کے لئے باعثِ سکون اور فرحت بنتی ہے۔ گوکہ سردیوں میں یہاں عام طور پر سخت سردی پڑتی ہے۔ یہاں کا درجہ حرارت ۱۸ سے ۳۰ سینٹی گریڈ کے درمیان رہتا ہے۔ پکی سڑکوں کی تعمیر کی بدولت اب یہ قصبہ سری نگر سے ۲۵۲ کلومیٹر اور جموں سے ۲۰۱ کلومیٹر دور ہے جب کہ بھدرواہ سے بسوہلی کا فاصلہ ۱۶۶ کلومیٹر اور بھدرواہ سے چمبہ کا فاصلہ ۱۰۵ کلومیٹر ہے۔ یہ قصبہ پل ڈوڈہ کے مقام پر نیشنل ہائی وے سے ملا ہوا ہے۔ یہ سڑک ۲۰ کلومیٹر لمبی ہے۔ دوسری طرف یہ علاقہ بھلیس کے ساتھ کچھ پیدل راستوں سے ملا ہوا ہے۔ ان میں قطار دھار، گنٹھی دھار، باچھ دھار، گندوہ کے علاوہ بھدرواہ، جائی، جوڑہ، ملانوں اور کاہرہ کے راستے شامل ہیں۔ اندرونی طور پر بھی کئی سڑکیں اِس قصبہ کو آس پاس کے دیہاتوں سے ملاتی ہیں۔

بھدراہ کا حسین وجمیل قصبہ نیرو نالہ کے مغرب کی جانب دائیں کنارے پر واقع ہے۔ یہاں کی زمین بہت ہی زرخیز اور پانی وافر مقدار میں ہے۔ عام طور پر یہاں کے چشموں کا پانی گرمیوں کے موسم میں سرد اور سردیوں کے موسم میں گرم ہوتا ہے۔ وادی نیرو کا سارا علاقہ سرسبز وشاداب ہے اور جنگلات سبز سونے کے خزانے ہیں۔ ہر سو آبادیاں اور ہریالی پھیلی ہوئی ہے۔ لوگ خوشحال، محنتی، خود کفیل اور تعلیم یافتہ ہیں۔ فطرت کے حسن وجمال کا پرتو لوگوں کی شباہت میں نظر آتا ہے۔ یہاں کی سیرگاہیں اور صحت افزا مقامات جاذب نظر اور باعث کشش ہیں۔"

..................☆☆☆..................

محبّ الحسن

مترجم: علی حماد عباسی

قدیم کشمیر میں ثقافتی سرگرمیاں

سلاطین کے عہد میں کشمیر میں ثقافت کا معیار بہت بلند تھا، شری در کا یہ بیان[1] کہ ہر شخص شعر و شاعری سے لطف اندوز ہوتا تھا، اور شعر گوئی کوشش کرتا تھا، صریحی طور پر مبالغہ آمیز ہے، لیکن تاریخوں میں اس بات کے کافی ثبوت موجود ہیں کہ وادی میں فنون، ادب اور موسیقی کے لوگ کافی قدرداں تھے، کشمیری نہایت طبّاع اور ذہین ہوتے تھے[2] حاضر جوابی میں لاثانی تھے، وہ موسیقی کے بہت دلدادہ تھے، وہ فنی شعوران کے اندر بدرجہ اتم موجود تھا[3] انہیں علم سے محبت تھی، اور زمانہ قدیم کی طرح کشمیری اپنا گھربار چھوڑ کر ہندوستان کے دور دراز مقامات اور ترکستان اور ایران حصول علم کی تلاش میں نکل جاتے، سلاطین علوم و فنون کی نہ صرف مرّبی تھے بلکہ بعض تو خود شاعر اور فن موسیقی کے ماہر تھے، اہل علم مغنی اور مصوّران کے دربار کی زینت تھے، اور راج دھانی سرینگر عظیم الشان محلوں، مسجدوں، خانقاہوں اور باغوں سے بھری تھی۔

---

۱ : شری در ص ۱۴۴ ۲ Traweh از برنبر ص ۲۰۲، ۲۱۵ Lalla Yakyani از گریرسن اور بارنٹ دیباچہ ص ۱ ۳ : ہفت اقلیم رازی۔ ورق ۱۵۲ الف ۴ اس کا مقابلہ ہیوان سانگ کے "سی کی" کے بیان ص ۱۴۸ سے ہوسکتا ہے۔

ایرانی اثرات

کشمیراورایران کے ثقافتی تعلقات کی تاریخ بہت پرانی ہے،اس کا ثبوت سرینگر کے قریب ہاروِن، خانقاہوں اور کشمیر کی قدیم سنگ تراشی کے نمونوں سے ملتا ہے، ساسانی اثر بلاشبہ ظاہر ہے[۱]،اسی طرح سرکاری عہدوں کے نام جیسے دبیر یا دوِر (فارسی و بیر کے اتباع) اور گنج در (فارسی گنجور کے اتباع میں)[۲] صاف طور پر ساسانی اثرات کی نشاندہی کر تے ہیں، باہیں ہمہ چودھویں صدی تک کشمیر کی ثقافت کے حاوی رجحانات ہندوستانی تھے۔سلطنت کی تاسیس کے بعد ایرانی ثقافت کے مرکزوں پر زیادہ گہرے اور پائیدار تعلقات تقائم ہوئے،اس کا انجام یہ ہوا کہ ہندوستانی اثرات کی جگہ ایرانی اسلامی عناصر نے لے لی،اگرچہ ہندوستانی اثر ایک دم زائل نہ ہو سکا۔

عہدِ سلاطین میں اور زمانوں کے مقابلہ میں کشمیر اور ایران میں زیادہ قریبی ثقافتی تعلقات قائم ہونے کے کئی اسباب تھے، پہلا سبّب تو یہ تھا کہ وادی میں اسلام کی اشاعت وترقی ایران اور وسط ایشیا کے صوفی بزرگ مثلاً بلبل شاہ، میر سیّد علی ہمدانی، اوران کے بیٹے میر محمد ہمدانی، میر شمس الدین اور دوسرے بزرگوں کی تبلیغی سرگرمیوں کی مرہون منت تھی، ان صوفیہ نے کشمیر کی ثقافت پر ایرانی رنگ چڑھایا، کیونکہ یہ بزرگ نہ صرف اسلام کے مبلّغ تھے، بلکہ ایرانی زبان وثقافت کے پُرجوش حمایتی تھے،دوسرا سبّب یہ تھا کہ اسلام کی اشاعت کے ساتھ یہ بات عین فطری تھی کہ مسلمان باشندے اپنے ذہنی اور روحانی سرچشموں کی آبیاری کے لے ان ملکوں سے دلچسپی لیتے، جو اسلامی ثقافت کا مرکز بن گیے تھے، کشمیری علماء نے ہرات، سمرقند اور بخارا جو ایران کی ثقافتی سلطنت کا جزو تھے، کی سیاحت کی ممتاز فقیہوں اور بزرگ صوفیوں کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا،اور ایرانی ثقافت

۱: یہ مراکز موجودہ ایران کے جغرافیائی حدود کے باہر وسط ایشیا، شمالی ہندوستان اور ایشیا سے کوچک تک پھیلے تھے ۲: جون راج ص ۵۸۔۵۷

کے سرچشمہ سے جی بھر کے سیراب ہوئے، تیسرا سبب یہ تھا کہ شہاب الدین کے عہد سے ایرانی اور ایرانی تہذیب سے متاثر ہونے والے تُرک سلاطین کی سرپرستی سے متاثر ہوکر زیادہ سے زیادہ تعداد میں کشمیر کا رخ کرنے لگے، ان لوگوں نے عوام کی معاشرتی اور ثقافتی زندگی پر گہرا اثر ڈالا، وادی کا ہندوستان سے بھی گہرا ثقافتی تعلق تھا لیکن ہندوستان کا ثقافتی اثر ایران اور ترکستان کے مقابلہ میں بہت کم تھا۔

ایرانی زبان

ایران اور وسطِ ایشیا سے مذہبی اور ثقافتی تعلقات کے نتیجہ میں کشمیر میں فارسی ایرانی زبان پھیلی، ہندو راجاؤں اور خاندان شاہ میر کے ابتدائی دور میں سنسکرت درباری زبان تھی، لیکن شہاب الدین کے عہد سے فارسی نے اس جگہ لینی شروع کردی، جو کہ تعلیم یافتہ طبقوں کی زبان بن گئی تھی اور اس کا اثر گاؤں میں بھی بڑھا، حافظ شیرازی نے تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ ساتھ کتنی حقیقت افروز بات کہی ہے[1]۔

یہ شعر حافظ شیرازی گویند و می رقصند
سیہ چشمانِ کشمیری و ترکان سمرقندی

کشمیر میں فارسی کی توسیع و ترقی میں سب سے نمایاں کارنامہ زین العابدین کا ہے، وہ خود شاعر تھا، اور فارسی نثر میں دو کتابوں کا مصنف بھی تھا، اس نے فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا، شعراء اور اہلِ علم کی سرپرستی کی اور سنسکرت کی تاریخی اور علمی کتابوں کے فارسی تراجم کی ہمت فزائی کی[2]، چنانچہ اس کے عہد میں علم و ادب کا کافی کام ہوا لیکن ان کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اس کی بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، سلطان اور اس کے درباری شعراء کے کلام کے جو نمونے تاریخوں میں ملتے ہیں اگر وہ کسوٹی کا کام

۱: Literary History of a Persia از براؤن ج ۳ ص ۲۸۳ ۲: دیکھو ص ۹۰ کتاب ہذا، مزید تفصیل کے لئے دیکھو میرا مقابلہ انڈو برٹانیکا جلد ۷ نمبر ۳

دے سکتے ہیں تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سلطان کے عہد میں کشمیر میں فارسی شاعری کا معیار کافی بلند ہوگا، زین العابدین کا لڑکا اور جانشین حیدر شاہ بھی شاعر تھا، اور اس نے نظموں کی ایک کتاب لکھی تھی، اس کے بعد حسن شاہ جو خود تو شاعر نہ تھا، لیکن علم وادب کا مربی تھا اور شعراء اور اہل علم کی سرپرستی کرتا تھا، سلاطین کے نقش قدم پر امرا بھی چلے، جن کے اردگرد عالموں کا جمگھٹا رہتا، اور علمی ادارے اپنے خرچ سے قائم کرتے بلکہ ......اونچے طبقہ کی خواتین بھی علم وادب کی ترقی میں جوش وخروش سے حصہ لینے میں کسی سے پیچھے نہیں تھیں،

خاندان شاہ میر کے آخری دور میں مستقل خانہ جنگیوں اور بیرونی حملوں کی وجہ سے علم وادب کی رفتار سست رہی، لیکن مرزا حیدر کی تھوڑے عرصہ کی حکومت میں اور خاندان چک کے عہد میں اس کا پھر احیاء ہوا، مرزا حیدر خود ادیب تھا، اس لئے علم وادب کی سرپرستی کرتا تھا، بدقسمتی سے اس کے دربار سے منسلک اہلِ علم اور اس کی سرپرستی میں تصنیف شدہ کتابوں کے نام معلوم نہیں ہیں، چک حکمرانوں میں حسن شاہ سب سے زیادہ علم وادب سے دلچسپی لیتا تھا، وہ خود بھی شاعر تھا، اور اس کو شعراء اور اہلِ علم کی صحبت پسند تھی، شاعر اور خطاط میر علی اسی کے عہد میں ایران سے آیا، اور کشمیر پر ایک طویل قصیدہ لکھا[۱]، ملا باقی، ملا نامی اوّل اور ملا نامی ثانی شعراء تھے، اور حسین شاہ کے دربار سے منسلک تھے[۲]، علی شاہ کے دربار کے سب سے اہم شاعر کا نام تھا ملا مہری، محمد امین مستغنی کشمیری تھا، یوسف شاہ کا درباری تھا، اور اچھا شاعر تھا، اس کے دربار کے دوسرے شاعر کا نام تھا، مرزا علی خان جو یعقوب شاہ اور بھگوان داس کی جنگ میں مارا گیا[۳] بابا طالب اصفہانی کشمیر میں غازی شاہ کے عہد میں آئے تھے، وہ اچھے شاعر تھے، اور تمام چک حکمراں ان کی عزت کرتے تھے، جب اکبر نے کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کیا، تو بابا طالب آگرہ گئے اور اکبر کے

۱: واقعات کشمیر ورق ۱۶۱ الف، تاریخ حسن جلد ۴ ورق ۲۷۸ ب

۲: حیدر ملک ورق ۱۶۰ الف تاریخ حسن جلد ۴ ورق ۲۷۸ ب ۲۷۵، الف

ملازم ہو گئے[۱]

خاندانِ چک کے عہدِ حکومت کے دو خاص شاعر اور اہلِ علم تھے، حضرت بابا داوٗد خاکی اور حضرت شیخ یعقوب صرفی، بابا داوٗد مشہور کاتب شیخ حسن گنائی کا لڑکا تھا، اس کی پیدائش ۱۵۳۱ء میں ہوئی، اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ کچھ عرصہ تک نازک شاہ کے لڑکے کا اتالیق رہا، پھر وہ حضرت شیخ مخدوم حمزہ کا شاگرد ہو گیا اور اننت ناگ میں ۱۵۸۴ء میں اس کا انتقال ہوا، وہ عالم صوفی تھا، اور اس کا کلام مذہبی اور عارفانہ ہے، اس نے بہت سی تصنیفات کیں، جن میں دستور السالکین، ورد المریدین اور قصیدۂ جلالیہ وغیرہ اہم ہیں[۲]

حضرت شیخ یعقوب صرفی کے باپ کا نام شیخ حسن گنائی تھا، شیخ یعقوب کی پیدائش ۱۵۲۱ء میں ہوئی، اور انتقال ۲۵/جولائی ۱۵۹۴ء میں ہوا، صرف سات سال کی عمر میں اس نے حفظ قرآن کر لیا تھا، اور اسی عمر میں فارسی میں شاعری بھی شروع کی تھی، اس نے لاہور، سیالکوٹ، سمرقند، مشہد، مکہ اور مدینہ میں مشہور اساتذہ سے فیض علم حاصل کیا[۳]، وہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا عالم تھا، اور ابو لفضل کے قول کے مطابق مذہبی امور میں سب سے مستند عالم تھا[۴] اس نے عربی میں فیضی کی تفسیر سواطع الالہام کا مقدمہ لکھا تھا، اس نے صحیح بخاری شریف کی ایک شرح لکھی، اور موت سے پہلے اس نے قرآن کی ایک تفسیر بھی تقریباً مکمل کر لی تھی[۵] بدایونی اس تفسیر کو اس کی فطانت کا بڑا حیرت انگیز کارنامہ[۶] کہتا ہے، یعقوب صرفی اچھا شاعر بھی تھا، اس نے بہت سی غزلیں اور قصیدے لکھے، اس نے ایک خمسہ بھی لکھا، اس کے علاوہ نظامی کے تتبع میں اس نے کئی مثنویاں بھی تصنیف[۷] کیں۔ اسکی طبیعت جیسا کہ بدایونی نے لکھا، بلاغت آثار شاعری کے لئے نہایت ہی موزوں تھی[۸]

۱: آئین اکبری (بلاخ مین) ص ۶۷۶ اور حاشیہ ۲: واقعات کشمیر ورق ۶۳ ب صوفی جلد ۲ ص ۴۵۷ ۳: آئین اکبری (بلاغ مین) ص ۶۵۱ اور حاشیہ مزید تاریخ کبیر از مسکین ص ۷۰ اور ۱۷۱ ۴: آئین اکبر (بلاخ من) ص ۱۹۱ اور منتخب التواریخ ۳ ص ۲۶۶ ۵: منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۔۲۰۰ صوفی ج ۲ ص ۳۶۰ ۶: ایضاً ج ۳ ص ۲۰۱ ۷: ایضاً جلد ۳ ص ۳۶۰ ۸: ایضاً ص ۲۰۰ اور حاشیہ ۱

سنسکرت

یوں تو بارہویں صدی کے نصف سے ہی کشمیر میں سنسکرت علم وادب زوال پذیر ہو گئے تھے، لیکن فارسی کے نظم ونسق اور ثقافت کی زبان بن جانے سے سنسکرت کی اہمیت کم ہوتی گئی، سنسکرت سرکاری زبان نہ رہ گئی، لیکن سلاطین اس کی سرپرستی سے دست کش نہ ہوئے، اور کشمیر کئی بڑے سنسکرت عالموں کے نام پر فخر کرسکتا ہے[۱] سلاطین کے عہد میں جون راج، شری ور، پراجیہ بھٹ اور شُک نے اپنی اپنی تاریخیں لکھیں، تاریخ کی ایک کتاب کے علاوہ شری ور نے جامی کی تصنیف "یوسف زلیخا" کا سنسکرت میں ترجمہ بھی کیا، اور کشمیر اور ہندوستان کے ۳۵۰ شعراء کے کلام کا انتخاب بعنوان "سبھاشتاولی" بھی مرتب کیا[۲]، اس عہد کی اہم تصنیفات میں جگدھر بھٹ کی تصنیف "استتی کسما نجلی" (۱۴۵۰ء) اور سیتا کنٹھ کی تصنیف بال بودھ نی (۱۴۷۵ء)[۳] اور پندرہویں صدی میں تصنیف شدہ اور وراج کی، شیوسوتر دارتکا' کا ذکر کرنا ضروری ہے[۴]، یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ فارسی کی روزافزوں مقبولیت کے باوجود نجی اور سرکاری کاموں میں سنسکرت کا استعمال بالکل ختم نہ ہوا تھا، درحقیقت اکثر تو فارسی کے شانہ بہ شانہ استعمال ہوتی رہی، پندرہویں اور سولہویں صدی کی متعدد قبریں سری نگر اور بیج بہاڑہ میں آج بھی موجود ہیں، جن پر دونوں زبانوں میں کتبہ ہے۔ اوپر سنسکرت میں اور نیچے فارسی میں، اسٹائن نے ۱۶۸۲ء کے ایک بیع نامہ کا حوالہ دیا ہے، جو سنسکرت اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھا گیا تھا[۵]، اسی طرح سری نگر کے میوزیم میں کشمیر کے مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ مخدوم حمزہ کا وصیت نامہ موجود ہے، یہ دونوں

۱: لوگا کشی گرہ سوتر، از شاستری دیباچہ ص Kashmir Senes of Texts and Studies xlix
۲: Report on Your از بوہلر ص ۶۱ ۳: یہ معلومات ریسرچ اینڈ پبلیکیشن ڈیپارٹمنٹ سری نگر نے فراہم کی تھیں
۴: Kashmir Senses of Texts and Studies
۵: جرنل آف دی رایل ایشاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۹۰۰ ص ۱۸۷ اور

زبانوں میں بھوج پر تحریر ہے، اور اس کا سنہ تحریر ۹۸۴ مطابق ۱۵۷۶ء ہے، دائیں طرف سنسکرت عبارت جو شاردا حروف میں ہے، پڑھی نہیں جاسکتی، لیکن فارسی کا متن جو بائیں طرف ہے کچھ پڑھا جاسکتا ہے، ان مثالوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وادی میں سنسکرت کے قدم زیادہ دن نہ جم سکے، اور سترہویں صدی کے آخر تک تو اس کا استعمال اور مطالعہ چند برہمن خاندانوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا، فارسی کے فروغ کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ بہت سے غیر ملکی الفاظ سنسکرت میں داخل ہو گئے، پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ ساسانیوں کے اثر سے ہندوؤں کے عہد میں دبیر اور گنج درجیسے الفاظ کشمیر کے سرکاری استعمال میں آچکے تھے، خاندان شاہ میر کی تاسیس سے فارسی الفاظ کی بہت بڑی تعداد سنسکرت زبان میں شامل ہوگئی، چنانچہ "لوک پرکاش" کے ان حصوں میں جو سلاطین کے عہد میں لکھے گئے تھے، فارسی کے بہت سے نئے، الفاظ مثلاً شاہی، خواص، سر ترانا (سلطان) اور صلح دار شامل ہیں، یہ الفاظ لوک پرکاش کے اُن حصوں میں نہیں پائے جاتے، جو شمیندر کی تصنیف بتائے جاتے ہیں، یا کلہن کی راج ترنگنی[1] میں بھی ان کا وجود نہیں ہے، اسی طرح جون راج، شری ور، پراجیہ بھٹ اور شُک کی سنسکرت "تاریخوں میں عربی فارسی اور ترکی کے بہت سے الفاظ مثلاً خاتونہ (خاتون[2]) کھان گاہ (خانقاہ) مسجیدہ یا مسید اہا (مسجد) مدرسہ[3] رواد (رباب[4]) ملتے ہیں۔

کشمیری شاعری

پہلے ذکر آچکا ہے کہ راجاؤں کے زمانہ میں سنسکرت ثقافت کی زبان تھی، لیکن سلاطین کے عہد میں اس کا مقام فارسی نے لے لیا، لیکن کشمیری، معتد بہ اکثریت کی مادری زبان رہی، فارسی کے اثر سے یہ اور پھلی پھولی، اور سلاطین کی سرپرستی سے اس کا اپنا موقر

۱: Indiscre Studies ج ۱۸ ص ۲۹۴، ۳۴۷، ۳۵۰ ۲: شری ور ص ۱۵۷

۳: ایضاً ص ۲۲۵۔۷ ۴: ایضاً ۱۳۶

شعری ادب پیدا ہوسکا۔

کشمیری زبان کی سب سے پرانی مصنفہ للہ دید ہے[1] کیونکہ تاریخوں میں اس سے پہلے کسی مصنف کا ذکر نہیں آیا، وہ ایک عظیم شاعرہ تھی، اور اس کی نظموں میں عمیق فلسفیانہ معانی پائے جاتے ہیں، اس نے اپنے خیالات کا اظہار عام فہم زبان میں کیا، یہی وجہ ہے کہ آج بھی وادی میں اس کے واکھ زباں زد ہیں، اور بات چیت، کہاوتوں اور ضرب الامثال میں استعمال ہوتی ہیں، اس کی نظموں میں سنسکرت کے بہت سے الفاظ ملتے ہیں[2] لیکن بعد کے شعراء خاص طور سے مسلمان شعراء فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کرتے تھے[3] ان کی شاعری فارسی عروض میں ہے، اور انہوں نے فارسی تشبیہیں، استعارے اور تمثیلیں استعمال کی ہیں، لیکن انہوں نے مقامی اساطیر اور کہانیوں اور ماحول کی اپیل سے یکسر چشم پوشی نہیں کی ہے[4]

لل دید کا ہم عصر اور وادی کے مقبول عام بزرگ حضرت نورالدین ریشی بھی شاعر تھے اور انہوں نے کشمیری ادب کو مالا مال کیا، اس کے مقولے جن پر مذہب اور تبلیغ کا رنگ غالب ہے، للہ دید کی کہاوتوں کی طرح، ہر کشمیری کی زبان پر ہیں [5]

سب سے پہلی غیر مذہبی نظم ''بان سرووہ'' سلطان زین العابدین کے عہد میں لکھی گئی تھی، جو نہ صرف فارسی بلکہ کشمیری زبان کا بھی سرپرست تھا[6] اس کے عہد کی دوسری تصنیف ''ستیا کنٹھ'' کی ''مہاسیہ پرکاش'' ہے، لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ

---

[1] Linguistic Survacy of India از گریرسن ج ۸ ج ۲ ص ۲۳۷ [2] اس نے کبھی کبھی فارسی کے الفاظ مثلاً شکار استعمال کیا ہے، (نظم ۱۵) (کول نظم نمبر ۱۰) حبہ خاتون نے پیالہ، شیشہ، سنبل، گل، بلبل دل، دیدار وغیرہ الفاظ استعمال کئے ہیں، (ایضاً نمبر ۴۳، ۴۵، ۵۸، ۶۸ [4] Kashmiri Lyrics از کول دیباچہ ص ۱۵ [5] ایضاً [6] Kashmine Lyrics از کول

پندرہویں صدی کی تصنیف ہے، زین العابدین کے عہد کی دواور تصنیفیں ہیں، جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، ناتھ سوم پنڈت کی ''جین چرت'' اور یودھ بھٹ کی ''جین پرکاش'' ہے۔[۱]

خاندانِ چک کے عہدِ حکومت میں ایک مشہور شاعرہ حبہ خاتون تھی، وہ یوسف شاہ کی ملکہ تھی، کشمیری شاعری میں لول[۲] یا عشقیہ شاعری کی ابتداء اسی نے کی تھی، اور ایک صوفی بزرگ سیّد مبارک کے مشورہ پر اس نے فارسی عروض استعمال کیئے، جبکہ للہ دید اور نورالدین ریشی کی نظمیں عارفانہ اور ناصحانہ ہیں حبہ خاتون کے نغموں میں انسانی محبت، اس کی ناامیدیاں، اس کی تڑپ، اس کی کامیابی کا ذکر ہے، ان میں جذبات کی فراوانی، موسیقی اور نغمگی ہوتی ہے، اور آج بھی دستکار، کسان اور ملاح اس کو گا کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔

تعلیم

کشمیر میں سلاطین کے عہد میں تعلیم عام تھی، سلاطین اور امراء نئے نئے مدارس کھولنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے، وہ ان پر جاگیریں وقف کرتے، جس کی وجہ سے ہر گانوں میں ایک مدرسہ تھا، اس کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کی طرف بھی توجہ تھی، اور سری نگر میں یونیورسٹی تھی، خانقاہیں بھی علم کا مرکز تھیں جہاں قابل اساتذہ طلبہ کو درس دیتے تھے[۳]

ان مدرسوں کا نظام اور نصاب تعلیم ہندوستان، ترکستان اور ایران کے مدرسوں کا سا تھا، عام طور پر پانچ سال کی عمر میں بچہ کو مدرسہ میں بٹھایا جاتا، جہاں وہ عربی حروفِ تہجی سے روشناس ہو کر قرآن پڑھنا سیکھتا،[۴] اس کے بعد اس کو علوم متداولہ مثلاً علم الکلام، علم التوحید، تفسیر، حدیث، فقہ کا مطالعہ کرنا پڑتا، طبیعی علوم بھی پڑھائے جاتے، اور تیراندازی،

۱: Kashmiri Lyrics از کول ۲: ''لول'' کشمیری زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہوتے ہیں، محبت، تمنا اور دل کی آرزو (Kashmiri Lyrics) از کول دیباچہ ص ۱۱) ۳: خوارق السالکین ورق ۱۵۵، ب واقعات کشمیر ورق ۱۴۱ الف ۴: تذکرۂ ملا رینا، ورق ۱۱۵ الف، ب،

شمشیر زنی اور گھوڑ سواری بھی سکھائی جاتی[۱] اداروں کے صدر، سربرآوردہ علماء ہوتے، اور ہندوستان، ہرات، ترکستان سے طلبہ آکر اُن سے فیض حاصل کرتے[۲]

شہاب الدین کشمیر کے سلاطین میں پہلا سلطان تھا، جس نے وادی کے مختلف حصوں میں مدارس قائم کیئے[۳] اس کے علاوہ سری نگر میں قرآن وحدیث کے مطالعہ کے لئے اس نے ایک کالج بھی قائم کیا تھا، قطب الدین، نے تخت نشین ہونے پر اپنی نئی راجدھانی قطب الدین پور میں ایک کالج قائم کیا، اور پیر حاجی محمد قاری کو اس کا پرنسپل مقرر کیا، اس کالج سے متعلق ایک دارالاقامہ بھی تھا، جس میں اساتذہ اور طلبہ کے قیام وطعام کا مفت انتظام تھا، یہ کالج سکھوں کے عہدِ حکومت تک قائم رہا، لیکن سرکاری سرپرستی کی کمی کی وجہ سے اس کو بند کرنا پڑا، قطب الدین کے عہد میں ایک اور مدرسہ تھا، جس کا نام عروۃ الوثقیٰ تھا، اس کی بنیاد سید جمال الدین محدث نے رکھی تھی، سید صاحب کشمیر میں سید علی ہمدانی کے ساتھ آئے تھے اور قطب الدین کے اصراء پر قیام کرنے پر رضامند ہو گئے تھے، قطب الدین کے لڑکے اور جانشین سکندر نے بہت سے اسکول کھولے اور اپنی تعمیر کردہ جامع مسجد کے ساتھ ایک کالج اور دارالاقامہ کی بنیاد رکھی تھی، ملا افضل بخاری اسی کالج میں درس دیتے تھے، اور ناگام کا گاؤں بطور جاگیر ملا تھا[۴]

لیکن وادی میں توسیع تعلیم کے لئے جس سلطان نے سب سے زیادہ کام کیئے، وہ زین العابدین تھا، اس نے نوشہر میں محل کے پاس ایک اسکول کھولا، اور مولانا کبیر کو اس کا ناظم بنایا، خود سلطان کبھی کبھی مولانا کا درس سنتے آیا کرتا تھا، اسکول کے خرچ اور غیر مستطیع طلبہ کو وظائف دینے کیلئے اس نے ایک وقف قائم کیا تھا، جس کے متولی مولانا کبیر تھے،

۱:۔ تذکرۂ ملا رینا ورق ۵۱۳ الف　　۲: حیدر ملک ورق ۱۱۸، ب واقعات کشمیر۔ ورق ۱۴۱ الف

۳:۔ نوادر الاخبار۔ ورق ۲۹ ب، گوہر عالم۔ ورق ۱۰۱ ب مزید دیکھو، سید علی ص ۱۰

۴:۔ تاریخ کبیر از مسکین ص ۴۹

یہ ادارہ سترہویں صدی کے نصف تک قائم رہا، اس کے علاوہ سلطان نے زین گیر میں ایک کالج اور اسلام آباد کے قریب دچھن پورہ کی سیر پر ایک بڑا مدرسہ قائم کیا تھا، جس کے مدرس اعلیٰ ملا غازی خان تھے، بابا اسماعیل کبروی کی خانقاہ میں بھی تعلیم کا انتظام تھا، بابا اسماعیل، حسن شاہ کے عہد میں شیخ الاسلام ہوئے تھے، ان کے علم کا اتنا شہرہ تھا کہ ہرات ہندوستان اور ماوراالنہر سے طلبہ کھنچے چلے آتے تھے، زین العابدین کو تعلیم سے اتنی دلچسپی تھی، کہ وادی کے باہر بھی تعلیمی ادارں کو مالی امداد دینے سے احتراز نہ کرتا تھا، چنانچہ سیالکوٹ کے مدرستہ العلوم کو اس نے ۶ لاکھ روپے کا چندہ دیا تھا، اور اس کی ملکہ نے اپنا بیش قیمت گلو بند دیا تھا، مدرسوں کے علاوہ سلطان نے تکنیکی اسکول بھی کھولے، جہاں عوام کو کاغذ سازی، جلد بندی، اور دوسرے فنون جن کی داغ بیل سلطان نے ملک میں ڈالی تھی، سکھائے جاتے تھے۔

حسن شاہ کے دورِ حکومت میں بہت سے مدرسے کھولے گئے، سلطان کی ماں گل خاتون اور اس کی ملکہ شاہ بیگم اور اس کے وزیر اعظم ملک احمد کی بیوی اور نوروز اور تازی بٹ جیسے امراء تعلیم سے بہت دلچسپی رکھتے تھے، اور اپنے خرچ سے مدرسے قائم کرتے تھے اور بابا اسماعیل کبروی کا اس کا صدر مدرس بنایا تھا، نوہٹہ اور ڈل کے درمیان واقع باغاتِ مال خانہ اور لار پرگنہ میں برہم کا گاؤں اس مدرسہ کے لئے وقف تھے۔

خاندان شاہ میر کی طرح چک حکمران بھی تعلیم کے بہت بڑے سرپرست تھے، چنانچہ حسین شاہ نے حسن شاہ کے قائم کردہ مدرسہ دارالشفا میں کافی ترمیم واضافہ کیا، اور اس کے علاوہ ایک کالج بھی کھولا جس پر زین پور کی لگان وقف کردی، کالج میں کتب خانہ اور دارالاقامہ تھا، ان پر بھی جائداد وقف تھی، اس کالج کے پرنسپل فتح اللہ حقانی اور ان کے نائب اخوند ملا درویش تھے۔

صنعت وحرفت

سلاطین کے عہد کا ایک خاص کارنامہ چھوٹے فنون کی ترقی ہے، لیکن بدقسمتی سے ان ہی شو دنما کی تاریخ کا پتہ لگانا ممکن نہیں ہے کیونکہ ان کے عہد کے فنی نمونے بہت کم دستیاب ہوئے ہیں، کشمیر میں تو زمانہ قدیم سے پارچہ بافی کا فن ترقی پر تھا، کشمیر کا اونی کپڑا گرمی اور پائیداری کے لئے مشہور تھا، اور ساسانی فوج بطور لباس اس کو استعمال کرتی تھی[1] کشمیریوں نے ہندو راجاؤں کے عہد میں چینیوں سے ریشم کے کیڑے پالنا سیکھا تھا، لیکن زین العابدین نے بُنائی کے بہتر طریقے اور ایران سے آرائش کا اسلوب لاکر ریشمی کپڑوں کی صنعت کو بہت ترقی دی، اس وجہ سے کشمیر ریشمی کپڑوں کے لئے مشہور ہوگیا[2]

جہاں تک شال کی صنعت کا تعلق ہے، اس کی ابتداء کے متعلق کچھ بھی قطعی طور پر نہیں معلوم، مقامی روایتوں کے مطابق جس کا ریکارڈ انیسویں صدی میں ملتا ہے سب سے پہلے ترکستانی پارجہ بافوں نے کشمیری شال کی بنائی شروع کی تھی، جنہیں زین العابدین نے وادی میں بسنے کی دعوت دی تھی[3] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سید علی ہمدانی نے ۱۳۷۸ء[4] میں شال کی صنعت کی ابتداء کی تھی، بہر حال حقیقت جو بھی ہو، لیکن اتنا ضرور ہے کہ شال کی صنعت تیرہویں صدی سے پہلے موجود نہ تھی، کیونکہ کلہن کی راج ترنگنی یا کسی دوسرے ماخذ میں اس کا حوالہ نہیں ملتا، اور یہ کہ سلاطین کے عہد ہی میں ایران اور ترکستان کے پارچہ بافوں کی مدد سے اس صنعت کی نشو ونما ہوئی، ان مہاجروں نے نہ صرف نئے نمونے کی شال تیار کی بلکہ بنائی کی ایک نئی تکنیک دوسوتی مشجر تکنیک کی ابتداء

۱: جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی (بمبئی ج ۱۰ ص ۲۴۱) ۲: شری ور ص ۱۵۱ طبقات اکبری ج ۳ ص ۴۵۷ میں لکھا ہے کہ اس زمانہ میں کشمیر میں ریشم کے بہت عمدہ دھاگے بنتے تھے ۳: Travels in Kashmni از Nugel ص ۱۹-۱۱۴، مزید دیکھو جرنل آف دی رایل سوسائٹی آف آرٹس XXXا ص ۳۰۹

۴: Jammu and Kashmir State Handbook ص ۳۰۹

کی، جس کی مثال ایران اور وسط ایشیا میں مل جاتی ہے، لیکن ہندوستان اور پاکستان[1] میں کہیں نہیں ملتی، بہر حال اس صنعت کی تاریخ کا پتہ لگانا ممکن ہے، کیونکہ سترہویں صدی کے آخری نصف سے پہلے کی کوئی شال اب باقی نہیں رہ گئی ہے، شری ور سے صرف معلوم ہو سکا ہے، کہ زین العابدین کے عہد میں کشمیر اپنی شال کے لئے مشہور تھا[2]، جب مغلوں نے وادی کو فتح کیا شال کی صنعت کافی ترقی یافتہ حالت میں تھی، اس کے بعد اس کی ترقی کی رفتار آسانی سے معلوم کی جا سکتی ہے، لیکن یہ اس تصنیف کے باہر کی بات ہے،

دھاتوں پر قلعی کرنے کا فن ہندوستان اور کشمیر میں ایران سے آیا تھا[3]، مسلمان کھانا پکانے اور کھانے کے لئے تانبہ کے برتن استعمال کرتے ہیں، اس لئے استعمال سے پہلے ان پر قلعی کرنا ضروری ہوتا ہے، کشمیر میں لوٹے عام طور سے سرخ تانبے کے ہوتے ہیں، ان پر نقش و نگار اور مینا کاری اور قلعی ہوتی ہے ان کے دستے پیتل کے اور چینی اژدہے[4] کے سر اور دم کی طرح ہوتے ہیں، اور ان پر بنے ہوئے نقش و نگار اور اشکال ایرانی ہوتے ہیں، یہ نقش و نگار اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں، کہ ان پر ہندو آرٹ کا اثر باقی ہے، چنانچہ کشمیر کے دھات کے برتنوں کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وادی کشمیر میں تین قدیم تہذیبیں یعنی ایرانی چینی اور ہندو ایک دوسرے سے گلے ملیں، لیکن ایرانی تہذیب چینی اور ہندو تہذیبوں پر حاوی رہی، اگر چہ ایرانی تہذیب میں مقامی طریق اظہار نے کافی ترمیم و اضافے کئے[5] لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ کشمیری صرف

۱: مزید تفصیل کے لئے دیکھو جان اردن کا مقالہ "کشمیر کی شال" (مطبوعہ مارگ، ج ۶ نمبر ۱ ص ۵۰-۴۳ ۲: شری

> Art daocuivres Ancien ۵:۴ ص ۱۶ (۱۹۰۳) Gorge از Indian Art Exhibition ۳: ، ۱۵۱ در ص

Les Arts Decoratifa Thibet au اپنی کتاب لیکن Duhouset از Jfuluy ص ۱۱۰ Cachemen

لکھتا ہے کہ یہ دستے Renced Ethrographic Sept oct2831 ص ۳۸۶ an Petit cachemere

daulphin کی شکل کے تھے، نہ کہ Grogres کی شکل کے۔

نقال تھے، وہ غیر ملکی اثرات ضرور قبول کرتے تھے لیکن اس میں اپنا رنگ بھی ملا کر ایک نئی چیز پیدا کر دیتے، چنانچہ ان کے کچھ لوٹے ایرانی ساخت سے بالکل مختلف ہیں، اور کچھ تو ایشیا بھر میں اپنی مثال آپ ہیں، اس کے علاوہ کشمیری مینا کاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے، مینا کاری کا فن ایران اور دوسرے ملکوں کے مسلمان صناعوں میں مقبول نہ ہو سکا، کشمیری اپنے برتنوں پر ایسے نقش و نگار بناتے ہیں جو ان کے فن کو ہندوستان اور ایران کے فن سے ممتاز کرتا ہے، اس طرح کشمیر کا فن طبع زاد کہلانے کا بھی مستحق ہے، اجفالوی لکھتا ہے "اسلام کے ساتھ کشمیر میں ایرانی عربی فن بھی آیا، کشمیری ساری دینا میں اور خصوصاً وسط ایشیا میں اختراع پسندی کے لئے مشہور ہیں، ان کے سامنے فن کے بہت سے خوبصورت نمونے آئے، وہ نقل کرنے اور اس کو تکمیل تک پہونچانے کے فن میں طاق تھے، چنانچہ وہ روزانہ استعمال کی چیزیں بناتے بناتے فن کے اصلی نمونوں سے بھی آگے بڑھ گئے"[۲]

دھات کے برتن کے علاوہ سلاطین کے عہد میں لکڑی پر نقاشی کے فن نے بھی بہت ترقی کی، اس کا ثبوت موجود ہے کہ یہ فن کشمیر میں زمانہ قدیم میں بھی تھا، اور چونکہ ازمنہ وسطیٰ میں زیادہ تر عمارتیں لکڑی کی ہوتی تھیں، یہ فن ترقی کرتا رہا، اس زمانہ کا صرف ایک نمونہ جو زمانہ کی دست برد سے بچ سکا ہے، وہ مسجد مدنی کا دروازہ اور جھنجری دار جنگلے ہیں، جن پر نقش و نگار بنے ہیں، جامع مسجد اور مسجد مدنی اور خانقاہِ معلیٰ میں جالی کے پردے اس بات کی شہادت ہیں کہ یہ جالی کے پردے پہلے بھی موجود ہوں گے، کیونکہ مغلوں کے عہد میں ان عمارتوں کی دوبارہ تعمیر کے وقت ان کے نقوش کو برقرار رکھا گیا تھا، جہاں تک چھوٹی صنعتوں کا تعلق ہے، روایت یہی کہتی ہے کہ ان کی ابتداء سلطان زین العابدین کے ہاتھوں ہوئی تھی، لیکن ان کے متعلق کوئی تبصرہ کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ ان کا

۱: Ujfaluy ۲۹

۲: Ujfaluy ص ۲۸

ایک نمونہ بھی زمانہ کی دست برد سے نہیں بچ سکا ہے[1]

مصوّری

کشمیری مصوری کا تفصیلی جائزہ ناممکن ہے، کیونکہ سلاطین کے عہد کی مصوری کا ایک بھی نمونہ خانہ جنگیوں کے طوفاں اور بیرونی حملوں سے بچ نہیں سکا ہے لیکن اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ کشمیر کی فنی روایتیں بہت عظیم تھیں اور اس کے فن کا ایک جدا گانہ اسلوب تھا، زین العابدین کے دربار میں مشہور مصوّر ملا جمیل رہتا تھا[2] اکبر کے دربار میں پانچ کشمیری مصوّر رہتے تھے، لیکن کشمیری طرز کا اثر مغل اسکول پر کیا پڑا، اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہا جا سکتا[3]، بہر حال جیسا کہ براؤن نے لکھا ہے، کشمیری مصور اپنے موئے قلم سے بہت نازک تاثر پیدا کرتے تھے، وہ پانی ایک جگہ اکھٹا کرتے اور جب پانی سوکھ جاتا تو اس کے تلچھٹ کو لے کر انسانی شبیہ کے پسِ منظر کے لئے استعمال کرتے جو ہلکا لیکن حسین امتیاز شبیہ کے رنگ اور زمین کے رنگ میں پیش کرتا[4]

فنِ خطاطی

سلاطینِ کشمیر فنِ خطاطی کی بڑی سرپرستی کرتے تھے، لیکن بد قسمتی سے فن خطاطی کے نمونے کے طور پر ایک بھی مسوّدہ نہیں بچا ہے، لیکن کچھ مسجدوں اور مقبروں میں دیدہ زیب خط نسخ اور نستعلیق میں فارسی اور عربی کہتے موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فن خطاطی کشمیر میں نقطہ عروج تک پہنچ چکا تھا، زین العابدین اور حسن شاہ کے عہد کے کتبوں

1: صوفی ج ۲ ص ۵۵۵ میں رقم طراز ہے، کہ وکٹوریہ اور البرٹ میوزیم میں مغلوں کی فتح سے پہلے چوبیس تصویروں کا ایک سیٹ موجود ہے لیکن ہندوستانی سیکشن کے اسسٹنٹ کیپر مسٹر جان اودان کا کہنا ہے کہ میوزیم میں کشمیری طرز (صرف چند شال کے ٹکڑوں کو چھوڑ کر) کی ۱۹ ویں صدی سی پہلے کی کوئی چیز موجود نہیں ہے 2: طبقات اکبری ج ۳ ص ۴۳۹ 3: Indian Penting under the mughas از Brown ص ۱۲۱ 4: Indian Peinting under the mughals از Brown ص ۱۸۹

سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں خطِ نسخ کا رواج تھا، لیکن خاندان شاہ میر اور چک سلاطین کے عہد میں خطِ نستعلیق کا عام رواج تھا، زین العابدین کے عہد میں ایران اور ترکستان سے بہت سے خطاط وادی میں آئے، اور ان کو جاگیریں بھی عطا ہوئیں، سلطان نے ان سے زمخشری کی تفسیرِ قرآن کی کئی کاپیاں تیار کرائی تھیں[1] چکوں کے عہد کا سب سے ممتاز خطاط محمد حسین تھا، جو کشمیر کے مغل سلطنت میں شامل ہونے پر اکبر کی ملازمت میں آگیا تھا، اکبر نے اس کی خطاطی کی لطافت، حُسن اور تناسب سے متاثر ہو کر اس کو زرین قلم، کا خطاب دیا[2] چکوں کے عہد کا دوسرا مشہور خطاط علی چمن کشمیری تھا، اس کو بھی اکبر کی سرپرستی حاصل تھی[3] جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کے ممتاز خطاط بھی کشمیری نسل سے تھے۔

سنگ تراشی

ایک کتاب میں کہیں پر مغبت کاری کے نمونے کی ایک تصویر دی گئی ہے[4] یہ نمونہ بارہ مولہ کے قریب وشکر مقام پر چرچ مشن اسکول بارہ مولہ کے فادر دی راتیر کو ملا تھا، اور سلاطین کے عہد کی سنگ تراشی کا یہ واحد نمونہ ہے، جو موجود ہے۔ اس میں ایک گھوڑسوار دکھایا گیا ہے۔ سوار دو لبادے پہنتے ہوئے ہے، ایک تو چست کوٹ ہے جس کے اونچے کالر ہک سے بند ہیں دوسرا اوپر کا کوٹ ہے جس کی آستین چھوٹی منقش ہے اور اس کی کمر پر یہ کوٹ چار تہہ کے پٹکے سے بندھا ہوا ہے، پیر بدقسمتی سے ٹوٹ گئے ہیں لیکن نیچے کا لباس

---

[1] صوفی ج ۲ ص ۵۵۸ [2] آئین اکبری (بلاخ من) ص ۱۰۹ [3] ایضاً [4] اصل انگریزی کتاب دیکھئے، اردو ترجمہ میں تصویر نہیں دی جاسکی، ڈاکٹر سونتی کمار چٹرجی نے میری توجہ یونیورسٹی آف نسلوانیا کے میوزیم میں پتھر کی ایک شبیہ کی طرف دلائی تھی اس میوزیم کے کیوریٹر صاحب نے مجھے اس پتھر کی شبیہ کی تصویر بھیجی ہے، اور یونیورسٹی میوزیم بولٹین کی ایک کاپی بھیجی ہے، جس میں اس شبیہ کی تفصیل دی گئی ہے، میں کلکتہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر کے گنگولی کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے اس شبیہ کی تفصیل بیان کرنے میں میری بڑی مدد کی۔

جو شاید سروال ہو نیچے کی طرف زاویہ درزاویہ مڑا ہوا نظر آتا ہے، سوار کے ہاتھ میں کمان ہے، فتراک میں تیر بھرے ہیں، ایک بڑی تلوار اور خنجر، ایک کٹارہ، ایک تبر، اور ایک ڈھال اس کے پاس ہے، گھوڑا خوبصورت زری کے کپڑے سے ملبوس ہے، جو اس کے جسم پر پیٹی سے بندھا ہوا ہے، اس تصویر سے لباس اور مجسمہ سازی کے نقطہ نظر سے وسط ایشیا کے سواروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اس سے معاصر فوجی ساز وسامان پر بھی روشنی پڑتی ہے، پتھر پر جو کتبہ ہے، وہ شاردار رسم الخط میں ہے اور اس پر شکروار کا دن ماگھ کے مہینے کی نویں اماوس ۸۲ لوکک سال درج ہے، جو ۱۵۰۶ء کے مطابق ہے۔

فنِ تعمیر

عظیم مغلوں کی طرح سلاطینِ کشمیر بھی زبردست معمار تھے، لیکن بدقسمتی سے چند مقبروں اور مسجدوں کو چھوڑ کر ان کی بنوائی ہوئی تمام عمارتیں تلف ہو گئی ہیں، اس زمانہ کی عمارتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۔ معماری طرز ۲۔ چوبی طرز، پہلی طرز کی عمارتوں میں ایک عمارت زین العابدین کی ماں کا مقبرہ سری نگر میں اب بھی موجود ہے، اگرچہ یہ ایک پرانے مندر کی کرسی پر بنا ہے، لیکن کرسی کے اوپر جو اینٹوں کی عمارت ہے مسلمانوں کے مقبرہ کے طرز پر بنی ہے، پھاٹک کے دونوں طرف طاقوں کو چھوڑ کر جو مارتنڈ کی طرح ہیں، دیواروں پر بنے ہوئی نکیلی محراب اور پھاٹک کے اوپر اینٹ کی محراب سب کی سب اسلامی طرز کی ہیں، بیرونی دیواروں میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر نیلے رنگ کی چمکیلی اینٹیں جڑی ہوئی ہیں، اور عمارت کے اوپری حصہ میں چار چھوٹے چھوٹے گنبد اور بیچ میں ایک بڑا گنبد ہے، لیکن سارے گنبد ایک ہی طرز کے ہیں، بیچ کا گنبد ایک اونچے ستون پر ہے، جس کی دیوار میں محرابیں کھلی ہیں چھوٹے گنبدوں کے نیچے کی دیوار میں چھت دار راستے ہیں، ان کے نیچے ایک گھماؤ دار دندانے دار آرائش ہے، یہ طرز تعمیر یعنی عمارت کے چاروں کونوں پر چھوٹے گنبد اور بیچ میں ایک بڑا گنبد ہندی مسلم فنِ تعمیر میں

پہلی بار نظر آتا ہے، دوسری بار یہ طرز کچھ ترمیم و اضافہ کے ساتھ سہسرام میں شیر شاہ کے مقبرہ میں دکھائی پڑتا ہے۔

سری نگر میں معماری طرز کی دوسری عمارت سید محمد مدنی کا مقبرہ ہے، سید صاحب سکندر کے عہد حکومت میں مدینہ سے کشمیر بحثیت سفیر تشریف لائے تھے، اس کی تعمیر ۸۴۰ھ مطابق ۱۴۴۴ء میں ہوئی تھی، لیکن اب یہ کھنڈر ہو گئی ہے، لیکن ابھی حال تک اس میں دو خاص باتیں تھیں پہلی بات تو اس کی رنگین اینٹیں ہیں، جو ایران سے آئی تھیں، اور مغل ٹائلز سے مختلف تھیں[۱]، اس مقبرہ میں رنگین اینٹیں مربع شکل کی تھیں، اور ان کے رنگ نہایت چمکیلے جیسے نیلا، سرخ، بھورا، سبز، زرد ایک ہی ٹکڑے پر تھے لیکن مغلوں کی ٹائل چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں مختلف رنگوں کی ڈیزائن بن جاتی اور مزیک جیسی نظر آتی۔

لیکن سب سے اہم بات اس عمارت میں کثیر رنگ کی ٹائل پر بنی ہوئی ایک جانور کی شبیہہ تھی، جو مشرق میں سامنے آنے والے محراب دار راستہ کے نصف جنوب میں تھی، جانور کا جسم چیتے کا دھڑ انسان کا جس کا سر، سینہ اور کندھا غائب ہے، لیکن وہ اپنی ہی دم کو تیر کمان سے مارتا ہوا نظر آتا ہے، جس کی دم کی سرے پر ایک اژدہے کی قسم کے جانور کا سر ہے، اور قریب سے ایک لومڑی بادلوں اور پھولوں کے درمیان سے یہ نظارہ دیکھ رہی ہے، اس تصویر کا پسِ منظر نیلا ہے، چیتے کا جسم زرد رنگ کا ہے، اور اس پر سبز دھبے ہیں، آدمی کا دھڑ سرخ رنگ کا اژدہے کا سر اور لومڑی کا رنگ سرخی مائل بھورا ہے، اور پھول مختلف رنگوں کے ہیں بادلوں کا رنگ اور اژدہے کا سر چینی اور ایرانی اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں[۲]۔

۱: اب اس عمارت میں صرف نصف درجن ٹائلیں باقی ہیں، کچھ سری نگر میوزیم میں ہیں، لیکن بقیہ کو لوگ مقدس یادگار سمجھ کر اٹھا لے گئے، پٹنہ میوزیم میں اس عمارت کی جو ٹائلیں ہیں، وہ مغلوں کے عہد کی معلوم ہوتی ہیں[۲]: Archaeological Survey of India Report ۱۹۰۶ء

بہر حال وادی میں چوبی طرز کی عمارتیں زیادہ مقبول تھیں، اگر چہ ہندوؤں کے عہد میں لکڑی کی عمارتوں کا رواج تھا، لیکن سلاطین کے عہد میں یہ زیادہ مقبول تھیں، یہ شاید اس وجہ سے تھا کہ لکڑی کے ڈھانچہ پر بنی ہوئی عمارتیں زلزلہ میں اینٹ اور پتھر کی عمارتوں کے مقابلہ میں کم گرتی تھیں اس کے علاوہ تبدیلی مذہب کی وجہ سے عبادت گاہوں کے لئے زیادہ اور تیزی سے عمارتیں بنانے کی ضرورت تھی، ہندو طرز تعمیر کی عبادت گاہوں کی زیادہ ضرورت نہ تھی، لکڑی وافر تھی اور آسانی سے عمارت بن جاتی تھی، اس لئے لکڑی نے پتھر کی جگہ نے لی، اور جب یہ طرز چل پڑا تو پھر کہاں رکنے والا تھا[1]

مسجدیں اور مقبرے سب کے سب ایک ہی طرز کے تھے، سب کی شکل چوکور ہے، لیکن جب کہ مسجد میں کئی چوکور عمارتیں ہیں، جس میں ایک کشادہ صحن بھی ہے، جس کو ستونوں کی ایک قطار آپس میں ملاتی ہے، دیواریں کبھی اینٹوں کی بنتیں اور کبھی لکڑی کی لکڑی کے لٹھوں کو ایک دوسرے سے ملا کر نقی سمت میں رکھ دیتے اور لٹھوں کے بیچ میں جو جگہ بچ جاتی، اس کو اینٹوں سے بھر دیتے، چونکہ کشمیری لکڑی جوڑنے کے فن سے ناواقف تھے اسلئے لٹھوں کو مضبوطی کے ساتھ ایک پتلی اور نوکیلی لکڑی سے باندھ دیا جاتا، انہیں اور دوسرے طریقے مثلاً پیل پایہ ٹی اور لکڑی کو ترچھے رکھ کر باندھنے کا فن بھی نہیں معلوم تھا، جس سے بغل کی جھکاؤ کی لچک محفوظ کی جاتی، ان عمارتوں کی چھت بھرجے سے بنائی جاتی جس پر بارش یا برف کا اثر نہیں ہوتا، بھرجے کو تختہ پر لگا کر لکڑیوں کے سہارے رکھ جاتا، کمرے کی چھت دیودار کے اونچے کھمبوں پر کھڑی ہوتی، جس سے عمارت کی زیبائش بڑھ جاتی، اہرام کی شکل کی چھت پر مینار ہوتا، اور کلس پر دھات چسپاں ہوتی، جو کھلی ہوئی چھتری کی طرح نظر آتی، مینار میں ڈھالو چھجے دونوں طرف سے نکلے ہوتے، جنگلوں اور کٹہروں میں عمدہ جالی لگی ہوتی، اولتی کے زاویہ میں لکڑی کے خوبصورت جھومر لٹکے ہوتے

---

[1] کلکتہ ریویو ۱۹۲۷ء ص ۳۰

اور اولتی کے بالکل نیچے بھاری کارنسیں ہوتیں، جو دیوار کے لٹھوں سے صلیب کی شکل میں آدمی کے دانت کی طرح نظر آتیں، کشمیری فن تعمیر کی یہ ہیت دوسرے پہاڑی ملکوں مثلاً نیپال، ناروے اور آسٹریا کے لکڑی کے مکانوں کی طرح ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دونوں کا مبدا ایک ہی ہے کشمیر میں مکانوں کی تعمیر میں جو طریقے استعمال ہوتے تھے، مثلاً زینہ دار چھت، بھرجا اور گھاس کی مدد سے چھت کو ڈھانپنا اور کچھ دوسری باتیں خاص طور سے کشمیر کی اپج ہیں، ان چیزوں پر آب وہوا اور لکڑی کے افراط سے ملنے کا اثر پڑا ہے یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ ان عمارتوں کا طرز تعمیر بودھوں کے پگوڈا سے مستعار لیا گیا تھا، کیونکہ پہلے تو سلاطین کے عہد میں وادی میں ایک بھی پگوڈا نہیں تھا، اور دوسرے یہ کہ پگوڑا اور ان لکڑی کی عمارتوں کے طرزِ تعمیر میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔

وادی میں چوبی فنِ تعمیر کی ایک اچھی مثال سری نگر میں ہمدانی مسجد ہے جو خانقاہ معلیٰ کے نام سے مشہور ہے، یہ مسجد جہلم کے داہنے کنارے پر اینٹوں کی ایک غیر مسطح بنیاد پر واقع ہے، برآمدوں اور اس سے ملے ہوئے حصوں کو چھوڑ کر اس کی لمبائی چوڑائی ۷۰ فٹ ہے، اس کی عمارت دو منزلہ ہے، جو زمین سے اولتی تک ۵۰ فٹ ہے، اس کی اہرامی چھت تین تہوں میں بنی ہے، اور اس کے اوپر مؤذن کے لئے ایک شہ نشین ہے، اور شہ نشین کے اوپر گنبد ہے، اور اس پر کلس ہے جس کی اونچائی زمین سے ۱۲۵ فٹ ہے، عمارت کے چاروں طرف چھت دار راستے اور برآمدے اور برساتیاں ہیں، جن میں جابجا جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ نچلی منزل میں ایک مستطیل بڑا کمرہ ہے، جس کی لمبائی ۶۳ اور چوڑائی ۴۳ فٹ ہے، یہ کمرہ پہلے مربع تھا، لیکن شمال اور جنوب میں چھوٹے چھوٹے کمروں کے بن جانے کی وجہ سے اس کا اصل رقبہ چھوٹا ہوگیا ہے، بناوٹ کے لحاظ سے اندر کا کمرہ زیادہ اہم نہیں ہے لیکن اس میں ہشت پہل گاؤدم کھمبے طاقدار محراب لکڑی کی چھت اور دیواروں پر خوبصورت رنگوں کے نقش ونگار اور فرش پر بچھے ہوئے قیمتی اور مختلف رنگوں کی جائے نماز

اس کی حسن کو عظمت بخشتے ہیں۔

سری نگر میں ۱۴۰۰ء میں سکندر کی بنوائی جامع مسجد میں کشمیری چوبی فن تعمیر کے وہ تمام اوصاف موجود ہیں جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے، اس کے علاوہ اس مسجد کی تعمیر میں مذہب کی رُو سے جو باتیں ملحوظ رکھی جاتی ہیں وہ بھی موجود ہیں۔ یہ مسجد کئی مرتبہ آگ کی نذر ہوئی، لیکن ہر بار اس کو از سر نو تعمیر کرایا گیا، آخری بار اس کی تعمیر اورنگ زیب نے کرائی جس نے اس کا ابتدائی نقشہ برقرار رکھا، اس میں ۲۴۰ فٹ کا ایک صحن ہے جس کے چاروں طرف چوڑی دالان ہے، باہر کی دیوار اینٹ کی ہے جس میں صرف مغرب کی طرف چھوڑ کر ہر تین طرف راستے ہیں، اصل دروازہ جنوب میں ہے جس میں ایک طاق دار برساتی ہے، جس سے ہو کر راستہ صحن میں جاتا ہے صحن کے چاروں طرف محراب دار دالان ہیں، جن کے اوپر کھڑکیاں ہیں، لیکن بیچ میں سامنے کا رخ مربع نما ہے، جس کے اوپر محراب دار راستہ ہے، اور اس کے اوپر چھت اور گنبد ہیں، جس کا بیان پہلے آ چکا ہے، مغرب کی جانب منبر ہے، اس میں بڑے محراب دار راستے سے داخل ہو سکتے ہیں، جس میں دو طرفہ لکڑی کے کھمبے لگے ہیں، اور محرابیں بنی ہیں، جس سے عمارت کے اس حصہ میں کشادگی اور وسعت آ گئی ہے، لیکن سب سے بڑی چیز اس مسجد کے چاروں طرف اونچی فصیل ہے، یہ فصیل دیودار کے اونچے اور خوبصورت ۲۵ سے ۵۰ فٹ اونچے کھمبوں سے بنی ہے، کل کھمبوں کی تعداد ۳۷۸ ہے، ساری عمارت اس کی کشادگی اور وسعت، اس کے شاہانہ کھمبے، اس کی شان کو دوبالا کر دیتے ہیں۔

مسجد مدنی بھی لکڑی کی عمارت ہے، اور برنی کے مقبرہ سے ملحق ہے اس کا بیان آ چکا ہے، اس کی بھاری کاوش ہمدانی کی مسجد کی طرح ہے، مسجد کی حالت بہت خستہ تھی لیکن اَب اس کی مرمت کی گئی ہے پھاٹک پر ایک کتبہ میں لکھا ہے، کہ دونوں عمارتیں ایک ہی ساتھ یعنی ۸۴۸ھ مطابق ۱۴۴۴ء میں تعمیر ہوئیں، مقبرہ کی طرح مسجد بھی ایک پرانے

ہندو مندر کی جگہ پر بنی تھی، اور جس طرح مقبرہ کے اندر منقش پتھر کے کھمبے ہیں، اسی طرح کے کھمبے مسجد کی برساتی میں بھی ہیں۔

کشمیر کے پل توڑے دار پلوں کے اصول پر بنائے گئے تھے، پل کے پشتے دیودار کے لٹھوں کو جوڑ کر بنائے جاتے ہیں، جو پتھروں کی بنیاد کے ایک مستطیل نما سانچہ پر کھڑے ہوتے ہیں، دیودار کی ان لکڑیوں کو لمبان اور چوڑان میں اس طرح رکھا جاتا ہے، کہ نیچے کی ہر لکڑی ذرا باہر نکلی رہے، اس سے پشتہ کی شکل اُلٹے اہرام کی سی بن جاتی ہے جو پل کے کھمبوں کے درمیاں کے فاصلہ کو کم کر کے ایک پائر سے دوسرے پائر پر لٹھے کو رکھنے اور سڑک بنانے میں مددگار ہوتی ہے، پرانے نمونے کے دو پل ۱۹۵۲ء تک سری نگر میں موجود تھے، لیکن ان میں ایک پل جس کا نام فتح کدل ہے، سیلاب کی نذر ہو گیا، اور اس کی جگہ پر ایک تیسرا اور نیا پل تعمیر ہوا، چھٹا پل جس کا نام نوا کدل ہے ۱۹۵۴ء میں دوبارہ تعمیر ہوا[1]

موسیقی

ازمنہ وسطیٰ میں کشمیر میں موسیقی نے بہت ترقی کی، سلاطین موسیقی کے دلدادہ تھے، اور ان کے دربار میں ہندوستان کے مختلف حصوں وسط ایشیا اور ایران کے موسیقاروں کا جمگھٹا تھا، سلطان زین العابدین کو موسیقی کا خاص شوق تھا، اور وہ اکثر موسیقی کی محفلیں منعقد کرتا، اس کا لڑکا اور جانشین حیدر ساز بجانے میں ماہر تھا، اور اس کا پوتا حسن شاہ جو خود بھی فنِ موسیقی کا ماہر تھا، اس نے دکن سے مغنی بلوائے، تا کہ کشمیری موسیقی میں نئے عناصر شامل کر کے اس کو مالا مال کر سکیں، حسن شاہ کے عہد میں ایک شعبہ موسیقی کا تھا، جس کا ناظم شری در تھا[2]، مرزا حیدر دوغلت نے وادی میں موسیقی کی ترقی کے سلسلہ میں کافی کام کئے، لیکن ازمنہ وسطیٰ کے تمام کشمیری حکمرانوں میں یوسف شاہ کو موسیقی کے سب سے

۱: نہروں پر پرانے نمونے کے کچھ پل اب بھی موجود ہیں

۲: شری در ص ۲۳۱

بڑے مربی اور ماہر فن ہونے کا فخر حاصل ہے، اس کی ملکہ حبہ خاتون ایک عظیم موسیقار تھی، اور راست کشمیری راگ اسی کی ایجاد ہے، خاندان چک کے زوال کے بعد دربار کی سرپرستی کے فقدان کی وجہ سے کشمیری موسیقی کی ترقی مسدود ہوگئی۔

کشمیری موسیقی میں مختلف النوع عناصر شامل ہیں، جو ایک دوسرے میں مدغم ہوگئے ہیں، لیکن ان عناصر میں سب سے اہم ایرانی اور ترکستانی اثرات ہیں[1]، حقیقت تو یہ ہے کہ وادی میں موسیقی کے خاص دبستانوں کی بنیاد زین العابدین کے عہد میں ایرانی اور تورانی ماہرینِ فن نے رکھی تھی[2]، کشمیر کی کلاسیکی موسیقی "صوفیانہ کلام" کے نام سے مشہور ہے، جو فارسی موسیقی سے مستعار ہے[3]، اس میں ۵۴ سر و ہیں، جن میں سے کچھ تو ہندوستانی راگوں کی طرح ہیں، اور ان کے نام بھی ہندوستانی ہیں، جیسے بھیروین، للت اور کلیان اور دوسروں کے ایرانی نام ہیں، جیسے اصفہانی، دوگاہ، پنج گاہ، عراق، راست فارسی اور درسہ گاہ[4] جن تالوں کا عام رواج ہے، وہ سہ تال، نیم دور خفیف اور ترکی ضرب ہیں، یہ تال ہندوستانی تالوں سے مختلف ہیں، ان کے بول بھی مختلف ہیں، اس کے علاوہ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے برخلاف صوفیانہ کلام کورس میں گایا جاتا ہے[5]، اس لحاظ سے کشمیری موسیقی اپنا جواب نہیں رکھتی، پہلے زمانہ میں گانے کے ساتھ ایک طرح کا رقص "حافظ نامہ" بھی ہوتا، یہ رقص جسم کی حرکت (مدرا) سے گانے کا مطلب ظاہر کرتا، ساتھ میں ڈھکرا، سنتور، ساز اور ستار[6] بجائے جاتے، دوسرے سازوں میں مزمار (ایک قسم کی بانسری

۱: کشمیر ج ۴ نمبر ۶ ص ۱۳۵

۲: آئین اکبری (بلاخ من) ص ۶۶۰ حاشیہ ۳: کشمیر ج ۴ نمبر ۶ ص ۷۔۱۳۵ ۴: مرزا ناصر، بحور الحان ص ۱۵ یہ سب مقامے ایرانی موسیقی کے مقامات میں شامل ہیں دیکھو تزک جہانگیری ج ۲ ص ۱۴۸، جہاں پر ہندوستانی موسیقی کے سُر کا ذکر ہے، مزید دیکھو زمانہ ج ۲۷ نمبر ۱۶۴ ص ۹۵۔۱۹۴ ۵: کشمیر ج ۴ تزک جہانگیری ج ۲ ص ۱۴۸، ۶: کشمیری ج ۱۶۴ ایضاً ج ۱ نمبر ۱۴

اور طنبور تھے[1] سب سے زیادہ مقبول ساز جو لوک موسیقی میں استعمال ہوتا، رباب تھا[2]، جو ایران سے مستعار تھا، عود کا استعمال زین العابدین کے عہد میں شروع ہوا تھا، یہ اب بھی مقبول ہے،[3] لوک موسیقی میں سب سے مقبول چھکری، طنبور، نغمہ اور بچہ نغمہ ہیں جو کورس ناچ کے ساتھ گائے جاتے ہیں، ان میں چھکری سب سے زیادہ مرغوب ہے، یہ ارباب کے ساتھ موسمِ بہار میں گایا جاتا ہے۔[4]

..................☆☆☆..................

۱: بہارستان شاہی ورق ۱۲۲ الف تزک جہانگیری ج ۲ ص ۱۴۸ ۲: ص ۱۴۸

۳: شری در ص ۱۳۶، عود غالباً ایرانی ساز تھا، حجاز میں یہ جدہ سے آیا تھا، جو ایران کے زیر اثر تھا، ۴: کشمیری ج ا نمبر ۱۴ اور جلد ۴ نمبر ۴ رباب خراسان کا خاص ساز تھا، اور کشمیر میں زین العابدین کے عہد میں یقیناً وہیں سے آیا ہوگا، یہ عربوں کا قومی ساز تھا

غلام نبی خیال......

یارانِ وطن جو چلے گئے

شمیم احمد

برِ صغیر کی تقسیم کے بعد جو ادبی، ثقافتی اور صحافتی شخصیات کشمیر سے پاکستان یا پاکستانی کشمیر چلی گییٔ اُن میں احمد شمیم سب سے ممتاز شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کا اصلی نام غلام احمد زرگر تھا۔ کالج میں انہوں نے الہام شمیم کا قلمی نام اختیار کیا تھا۔

احمد شمیم 3 رمارچ 1930ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ وہ طالب علمی کے زمانے ہی سے حزب اختلاف کی سیاست سے وابستہ تھے جس کی بنا پر انہیں 1948 میں اُس وقت کی ریاستی حکومت نے گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا۔ پاکستان ہجرت کرنے کے بعد وہ پہلے آزاد کشمیر کے محکمہ اطلاعات سے وابستہ ہوئے اور پھر وہاں کے ریڈیو میں ملازمت اختیار کر لی۔

سرینگر میں وہ کچھ عرصے تک پریم ناتھ بزاز کی سوشلسٹ تحریک سے بھی وابستہ رہے۔ شمیم نے اگر چہ شاعری کا آغاز اردو ہی میں کیا اور ان کا کلام پاکستان کے کئی رسایل وجراید میں شایع ہوتا رہا تاہم وہ جلد ہی اپنی مادری زبان کشمیری کی طرف مایل ہوئے اور پھر ان کی شاعری میں ایک نکھار آ گیا۔

شمیم کا مثالی شاعر عبدالاحد آزاد تھا جس سے وہ اپنے کلام پر اصلاح بھی لیتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ مہجور پر آزاد ہی کو ترجیح دی۔ البتہ ان کے کلام میں اکثر مہجور اور آزاد

ہی کی بحر، اوزان، اور ردیف وقوافی کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان کے بہترین دوستوں میں غلام رسول طاؤس بانہالی سرِ فہرست تھا۔

چونکہ احمد شمیم نے اپنی زندگی کے بیشتر مہہ وسال وطن سے دور گزارے لہازا اُن کے سوانح مکمل شکل میں دستیاب نہیں۔ انہوں نے 1982ء میں انتقال کیا۔

اُن کی ایک مشہوار ودو نظم ''دجلہ ٔخون'' سے یہ چند اشعار پیش ہیں:

ستم وجور وہی
رگِ جاں بھی ہے وہی اور نشتر بھی وہی
دستِ اغیار میں خنجر بھی وہی
کیسا جذبہ ہے کہ جو خانۂ زنجیر کا پابند نہیں
پھر امڈ آئی ہے بازاروں میں
موت پر خندہ کناں
اک تمنائے جواں
لب پہ آجائے تو اک نعرۂ مستانہ ہے
ہاتھ میں آئے تو اک خشتِ جنوں بنتی ہے
دل میں آجائے تو اک ولولۂ نو کی طرح
درو دیوار ہلا دیتی ہے
سوئی قسمت کو جگا دیتی ہے
کوئی دیکھے تو میرے شہر کے بازاروں میں
دجلۂ خوں تو رواں آج بھی ہے
رسمِ شبیر جواں آج بھی ہے

ریاستی کلچرل اکیڈیمی اس لحاظ سے درخورِ تحسین ہے کہ اس نے شمیم کے دستیاب

مختصر کشمیری کلام کی شیرازہ بندی کر کے اسے 1989ء میں "دگ تہ داغ" (درد اور داغ) کے نام سے شایع کر کے محفوظ کیا۔

راقم نے شمیم کے چند اردو اشعار کو کشمیری میں یوں منتقل کیا ہے:

جس ستم گار نے دل کو میرے برباد کیا
دل نے ہر لمحہ اُسے شوق سے پھر یاد کیا
غمِ جاناں غمِ دوراں کو بسایا دل میں
اور اسی درد سے اس گھر کو بھی آباد کیا
دہر کی خاطر سبب ہے فخر کا میرا وجود
ہاں یہی غم ہے کہ تو نے مجھے برباد کیا

......☆......

کتنا پیارا ہے خزاؤں میں بہاروں کا خیال
دشمنوں کے نرغے میں گویا کہ یاروں کا خیال
دیس سے پردیس آکر روز و شب کی یہ کسک
صبح ہو یا شام ہو آئے چناروں کا خیال
دیکھئے کس نوع کا شاعر ہے یہ احمد شمیم
آتشِ نمرود ہے اور گلعذاروں کا خیال

......☆......

میر عبدالعزیز

میر عبدالعزیز وطن مالوف کشمیر۔ کے ایک پختہ مشق اور مشہور صحافی تھے۔ وہ جنوری 1924ء کو سری نگر کے رام باغ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پہلے اپنے ہی محلے کے مدرسے میں اور اس کے بعد سری پرتاپ ہائی سکول اور اخیر پر ایس۔ پی۔ کالج میں

تعلیم حاصل کی۔

صحافت کی دنیا میں انھوں نے ہفت روزہ "ملت" اور پریم ناتھ بزاز کے روزنامہ "ہمدرد" کی ادارت سے آغاز کیا۔1947 میں وہ جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کے کنوینر بنائے گئے۔1948ء میں کشمیر سرکار نے انہیں زندہ گرفتار کئے جانے پر انعام مقرر کیا کیونکہ وہ اپنے اداریوں میں حکومتِ وقت کے خلاف انتہائی زہر افشاں تنقید اور تضحیک کا اسلوب اختیار کرتے تھے۔اسی دوران وہ روپوشی کی حالت میں سرحد پار چلے گئے۔پاکستان میں انہیں نئی نئی مشکلات اور مصایب نے آن گھیرا۔حتیٰ کہ جب1958 میں پاکستان میں جنرل ایوب خان نے مارشل لا نافذ کیا تو میر عبدالعزیز کو بھی 26 جون1959 کو جیل میں ڈال دیا گیا۔اس موقعے پر پنڈت پریم ناتھ بزاز نے پاکستان سرکار کی نکتہ چینی کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔"وہ تنگ نظر افسر جس نے حکومتِ پاکستان کو اس اقدام کا مشورہ دیا اس نے پاکستان کے کشمیر کیس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا اور یہ افسوس ہے کہ وزارتِ داخلہ میں بھی کسی نے اس امر کی نشان دہی نہیں کی۔"اس حوالے سے میر عزیز نے یہ اشعار قلم بند کئے:

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

میر عبدالعزیز آخر دم تک اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں مصروف رہے۔انہوں نے اگرچہ کئی سیاسی تنظیموں میں وقتاً فوقتاً شمولیت بھی کی لیکن بعد میں انہوں نے سیاست کو خیر باد کہہ کر باقی ماندہ زندگی اپنے دو اخباروں ہفتہ وار "انصاف" اور "ٹائمز آف کشمیر" کے لئے ہی وقف کر لی۔یہ دونوں جریدے راولپنڈی سے شایع ہوا کرتے

تھے۔ پاکستانی کشمیر کے اولین صدر سردار محمد ابراہیم نے میر کے اس ان تھک عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ جب دو انگلیوں سے ٹائپ کرتا تھا تو اُس کو کھنے پینے سمیت کسی بھی چیز کا ہوش نہیں رہتا تھا"۔ 1997 میں انہیں صدر پاکستان کی طرف سے صحافتی خدمات کے عوض پرائیڈ آف پرفارمنس کے اعزاز سے نوازا گیا۔

آپ صرف ایک بار 1982 میں اپنے وطن کشمیر آئے اور میرے ساتھ ان کی ایک طویل ملاقات میری رہائش گاہ پر ہوئی جہاں ہم رات گئے تک ہندستان اور پاکستان کے حالات بالخصوص سیاسیات پر تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ اس وقت مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوا کہ میر صاحب برِ صغیر کے کوائف سے نہایت دل برداشتہ تھے اور ان کے بقول اس پریشان کن سیاست گری سے سب سے زیادہ زیاں اہل کشمیر کو ہوا تھا۔

میر عبدالعزیز 6 فروری 2000ء کو راولپنڈی کے ایک ہسپتال میں 76 سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ ان کے انتقال پر ان کے صاحبزادے میر وقار عزیز نے یہ مصرعہ پڑھا:

چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہوں گے

مسعود کشفی

مسعود کشفی، علامہ میر غلام احمد کشفی کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ ان کا اصل نام میر مسعود احمد سلطان تھا۔

پاکستان کے ایک معروف ادیب محمد حنیف نے مسعود کی وفات پر ناصر کاظمی کا یہ شعر ایک تعزیتی محفل میں پڑھا تھا:

وہ ہجر کی رات کا ستارہ، وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا

سدا رہے اُس کا نام پیارا، سُنا ہے کل رات مر گیا وہ

اور اپنے ایک تہنیتی مضمون میں لکھا تھا۔ ''موت کے پنجہ سے کوئی ذی نفس نہیں جو بچ سکا ہو۔ اس تلخ حقیقت نے انہیں بھی نہیں بخشا جنہوں نے اپنی ساری عمر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گزاری ہو۔''

مسعود کشفی شمالی کشمیر کے بانڈی پورہ قصبے میں واچھی گام کی نہایت خوبصورت وادی میں ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد میر غلام احمد کشفی کشمیر کے مشہور روزانہ اخبار ''خدمت'' کے مدیرِ اعلیٰ تھے اور وہ شیخ محمد عبداللہ اور مولانا محمد سعید مسعودی کے قرابت داروں میں شامل تھے۔

مسعود صاحب جب پاکستان چلے گئے تو وہاں تراڈکھل ریڈیو میں ان کی تقرری ہوئی اور پھر ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے انہوں نے اس نشریاتی ادارے کی قیادت سنبھالی۔ چونکہ مظفر آباد میں ثقافت اور ادبیات کا کوئی ادارہ موجود نہیں تھا، مسعود نے ریڈیو کے ذریعہ ہی فنونِ لطیفہ کے لحاظ سے اس غیر آباد اور بنجر علاقے کو ادبی سرگرمیوں کا ایک مرکز بنایا۔

بقولِ حنیف ''مسعود اپنی ذات میں سیماب صفت تھے۔ کشمیر ان کی پہچان اور کشمیری ہی ان کی زبان تھی لیکن بد قسمتی سے ان کا کشمیری کلام ہم تک نہیں پہنچ پایا ہے۔ مسعود کے جانے سے روزنامہ ''گردش'' کے قارئین مسعود سے محروم ہوگئے اور قارئینِ ''سیاست'' بھی ان کے دلچسپ مضامین اور شذرات کو ترستے رہے۔

وفات سے چند روز قبل معاصر جریدے ''آتشِ چنار'' میں کشمیری ادب اور ثقافت پر اُن کا ایک شاندار مقالہ شایع ہوا جس نے پاکستان کے اردو دان حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ مسعود کے دوست محمد حنیف نے بالآخر ان کی یاد میں کہا ''مسعود کشفی اپنی ذات میں گلدستہ تھے جس کے پھولوں اور جس کی یادوں کی مہک سے فضائیں معطر رہیں گی۔''

............☆☆☆............

جہانگیر دانش

شاردا......منظر پسِ منظر

کشمیر میں بدھ مت کا دَور ایک لمبا اور پُر امن دور رہا ہے۔ جہاں ایک طرف لداخ اور تبت تک براستہ کشمیری بدھ مت کے پھیلاؤ کا سلسلہ تھا وہاں گلگت، مونجی، ہُنزا نگر وغیرہ جنہیں آج کل پاکستانی حکام شمالی علاقہ جات کے نام سے پکارتے ہیں کو کشمیر سے ملانا کا ایک اور راستہ بارمولہ سے کپواڑہ، کلاروس اور پھر ایک درہ موسومہ سنجلی گلی بلندی قریب (۹۰۰۰) نو ہزار فٹ سے گزر کر وادیٔ کشن گنگا (وادیٔ نیلم) میں داخل ہوتا ہے۔ سنجلی گلی سے ہو کر پیدل راستہ دریائے نیلم کے بائیں کنارے پہنچ کر شمالی مشرقی سمت دریا کے ساتھ ساتھ اوپر کوئی ۸۹ میل پہنچ کر ایک میدان تک پہنچتا ہے۔ یہاں دریائے کشن گنگا کسی بہت پرانے وقت میں بل کھاتا ہوا بہتا ہوگا کیونکہ اب اس کھلے میدان میں کہیں کہیں پانی سے گھسے ہوئے گول پتھر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اسی جگہ کا نام ''شاردا جی'' ہے جہاں بدھ دور میں ایک مشہور دانشگاہ ''شاردا پیٹھ'' ہوا کرتی تھی۔ شاردا کا مقام ایک پڑاؤ اور بیس کیمپ (Base Camp) ہو رہا ہوگا، کیونکہ وہاں سے آگے علاقہ گلگت وغیرہ کو جانے کے دو

راستے ہیں ایک نالہ سرگن کے ساتھ ساتھ اونچی چراگاہوں سے ہوکر یاغستانی علاقہ موسومہ بوڑادانی (قبائلی نیم آزاد لوگوں کی بستیوں پر مشتمل) ان بلند چراگاہوں سے اُتر کر دریائے سندھ اور دھیر، سوات کی (۱۹۴۲ء سے قبل) نیم آزاد ریاستیں ہوا کرتی تھیں، کی طرف جاتا ہے۔ دوسرا راستہ شاردا سے دریا کے باتیں کنارے ہوتا ہوا موضع کیل کو جاتا ہے۔ کیل بہت بڑا گاؤں ہے اور جہاں رومن نسل کے وہ فوجی لوگ آباد ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سکندر اعظم نے جب اٹک سے بڑھ کر درہ خیبر (ایرانی شاہراہِ ریشم جو سیکیانگ چین کو وادیٔ سندھ سے ملاتی ہے) کا رخ کیا تو کچھ فوجی لوگ یا تو تھک کر کنارہ کش ہوئے یا مہم جوئی میں راستہ سے بھٹک کر درہ شونٹھر سے وادیٔ کشن گنگا میں داخل ہوئے۔ سامنے دریا کی لہریں اور شمال مشرق کی طرف کوہ نانگا پربت کی سنگلاخ ڈھلوانیں دیکھ کر یہ لوگ وہاں سستانے کو ٹھہرے اور یہاں کے پُر فضا ماحول میں ایسے بیٹھے کہ آج تک اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ اسی کیل کی بستی سے ۲، ۳ میل اوپر دریائے کشن گنگا کا ایک معاون نالہ شونٹھر آملتا ہے اور اسی نالہ کے ساتھ ساتھ راستہ اوپر بلندیوں کی طرف نالہ کے ٹاپ پر پہنچتا ہے۔ یہاں سے گزر کر دوسری طرف علاقہ چیلاس جو دریائے سندھ کے بائیں جانب نانگا پربت کے شمالی ڈھلوانوں پر مشتمل بونجی، گلگت تک پھیلا ہوا ہے۔ ڈوگرہ، برٹش دَور میں براستہ مچھل اس گلی کو سر کر کے بانڈی پورہ وغیرہ کو فوجی نقل وحمل کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

جغرافیائی محل وقوع اور شاردا پیٹھ کے مقام سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کپواڑہ، سنجلی گلی، شاردا، کیل، شونٹھر، چیلاس، گلگت اور وہاں سے آگے شاہراہِ ریشم سیکیانگ، چین تک جاتی ہے۔ چونکہ بدھ مت اپنے عروج میں تمام شمالی مغربی ہندوستان، افغانستان اور چین، تبت پر پھیلا ہوا تھا۔ بدھ بھکشو اور عالم جہاں پہنچے ڈیرہ جما کر وہاں رہتے اور ریاضت اور تعلیمی سرگرمیوں میں مشغول ہوجایا کرتے تھے۔ شاردا پیٹھ ویسی ہی

ایک درسگاہ تھی کلہن نے اپنی تاریخی کتاب (راج ترنگنی) میں یہاں ایک مندر کا ذکر کیا ہے۔ مگر مقامی لوگ جو کب کے اسلام قبول کر چکے ہیں۔ آج بھی شاردا کو (شاردا جی) کہہ کر عزت سے اس مقام کو یاد کرتے ہیں۔ ریاست کے ایک محقق اور ادیب موتی لال ساقی اور ڈاکٹر جہانگیر دانش اور پہاڑی لکھاری شریف حسین نے اپنی تحریروں میں یہ واضح کیا ہے کہ پہاڑی زبان کا رسم الخط شاردا لپی، بدھ علماء نے شاردا پیٹھ میں ہی ایجاد کیا۔

شاردا تہذیب، شاردا رسم الخط ...... دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی، قدیم تہذیب و تمدن کا گہوارہ، ۲ ر ہزار سال کی معلوم تاریخ، کبھی علم و ادب اور ریسرچ کا مرکز...... آج اپنی شناخت کو ترس رہی ہے۔ ماضی کی رونقیں افسانہ لگتی ہیں۔ تاریخ بکھر چکی ہے۔ یہ ایک انتہائی خوبصورت مقام ہے۔ مقام آبادا سے ''چوراہا'' قرار دیتی ہے۔ یہ علاقہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر، گلگت بلتستان، کشمیر اور ہزارہ کا سنگھم ہے۔ شاردا سرینگر سے ۱۲۰ کلو میٹر اور مظفر آباد سے ۱۳۰ کلو میٹر کی دوری پر واقع ہے۔ وادیٔ نیلم یوں تو انتہائی خوبصورت وادی ہے لیکن شاردا ایک خوبصورت نگینے کی طرح ہے جس کے چاروں اطراف اونچے اونچے اور گھنے جنگلات سے گھرے پہاڑ ہیں۔ اس کے بیچوں بیچ دریائے نیلم یا کشن گنگا یا مدھومتی بہتا ہے۔ مدھومتی اس کا قدیم نام ہے۔ ہندوستان میں اس دریا کو کشن گنگا کہا جاتا ہے۔ بدھ مت اور ہندو دھرم میں گنگا کی انتہائی اہمیت ہے۔ گنگا کا دوسرا نام پاکیزہ ہے۔ اہلِ ہنود پورے ہندوستان، نیپال اور سری لنکا سے یہاں آکر اس دریا میں نہاتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اس دریا میں نہانے سے وہ پاک ہو جاتے ہیں۔ شاردا کو ہندو سرسوتی بھی کہتے ہیں اور اسے شاردا پیٹھ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ شاردا میں بیساکھی کا میلہ بھی لگا کرتا تھا جس میں دور دور سے لوگ آکر شرکت کرتے تھے۔ یوں تو شاردا کا علاقہ متعدد دیہات پر مشتمل ہے، شاردا چک، شاردا گراں، کشن گھاٹی، میدان، چھپران، ڈھوکری، بیاں، لٹی، الٹا، جوناڑ، لچھل، ... پانی، کھری گام اور

خواجہ سیری اس کا حصّہ ہیں۔ گوتم بدھ (۵۔۶۲۳ ق م) کے بعد کشمیر میں بدھ ازم پھیلا۔ شاردا میں کنشک (۶۰۔۵۰) نے بدھ ازم یونیورسٹی قائم کی۔ ۱۱ صدی عیسوی کے آخر پر ہرش کے دور میں بدھ ازم کا زوال ہوا اور شیومت کو فروغ ملا۔ اس کے بعد مسلم دور کا آغاز ہوا۔ کہتے ہیں شاردا میں منوں کے قدیم ترین درخت کے نیچے سلطان زین العابدین المعروف بڈشاہ (۱۴۲۱ء۔۱۴۷۴ء) کی قبر ہے۔ لیکن اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ شاردا کے مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ قبر بڈشاہ کی ہی ہے، البتہ یہ تصدیق ہوئی ہے کہ بڈشاہ نے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد شاردا کا دورہ کیا تھا۔ شاردا کو ہندو ازم میں شاردا مائی کا نام بھی دیتے ہیں کہتے ہیں یہ دو بہنیں ہیں دوسری کا نام ناردا مائی ہے۔ شاردا کے بالمقابل پار ناردا پہاڑ ہے۔ شاردا یونیورسٹی اور مندر کے جو کھنڈرات موجود ہیں۔ ان میں استعمال ہونے والا مخصوص پتھر اُسی ناردا پہاڑی سے لایا گیا ہے۔ وہ اس علاقے میں صرف ناردا پہاڑی پر ہی پایا جاتا ہے۔ یہ تعمیرات، فنِ تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ اور شاہکار ہیں۔ مندر میں داخلے کے لئے پتھروں کے تختے نما سلیں نصب ہیں۔ ہر ایک زینے میں دو دو پتھر استعمال ہوئے ہیں۔ ہزاروں سال گزرنے کے باوجود یہ سیڑھیاں سلامت اور محفوظہ ہیں۔ یہ بڑے سلیقے سے تیار کی گئی ہیں۔ ان کی تنصیب بھی منفرد ہے۔ عبادت گاہ میں داخلے کے لئے صدر دروازے کا یک حصّہ موجود ہے، جو اِن ہی بھاری تراشے ہوئے پتھروں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی چار دیواری ہے جس پر چاروں اطراف سے چھت تھی جہاں رہائشی ہٹ تھے۔ ان دیواروں میں، ہی پتھر کے حفاظتی کمرے بنائے گئے تھے جن کے اندر پہرہ دار ہر وقت موجود رہتے تھے۔ یہ کمرے اس وقت بھی موجود ہیں۔ ایک طرف کی دیوار بالکل تباہ ہو چکی ہے۔ یہ نالہ شاردا کی طرف کا حصّہ ہے۔ یہ نالہ بھی اہلِ ہنود کے لئے متبرک ہے۔ لیکن شاردا نالے میں آنے والے سیلابوں اور تباہ کن زلزلوں نے یہاں کا جغرافیہ ہی بدل دیا ہے۔ جو کسر بچی تھی وہ پاکستانی اور پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی حکومتوں کی عدم توجہی کی نذر

ہوگئی۔ یہاں کی اہمیت کسی مذہب کی عبادت گاہ کی وجہ سے نہ تھی بلکہ یہ عظیم دانشگاہ تھی جس کا رقبہ اب بھی کسٹوڈین محکمہ کی دستاویزات میں موجود ہے۔ یونیورسٹی کا رقبہ تقریباً ۷۰ کنال اراضی پر مشتمل ہے جو غالباً ۱۹۴۷ء کے مہاجرین کو الاٹ کیا گیا ہے جو کہ سراسر غلط فیصلہ ہے۔ یونیورسٹی کا علاقہ دریا کے دائیں کا کنارے واقع ہے۔ دریا پر کشتیاں چلتی تھیں۔ اس پورے علاقے میں دریائے نیلم جیسے ٹھہر گیا ہے۔ کسی بھی جگہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ دریا کا رخ کس جانب ہے۔ اس میں کشتی رانی آسانی سے ہوسکتی ہے۔ ٹورازم کے فروغ کے لئے بھی کشتی رانی کی جاسکتی ہے جس کی جانب ابھی تک توجہ نہیں دی گئی۔

شاردا نالے کی ایک طرف قلعہ ہے اور اس کی دوسری جانب یونیورسٹی کا علاقہ ہے۔ پُل عبور کرتے ہی جس جگہ جامع مسجد ہے وہاں پر رہائشی عمارتیں تھیں جبکہ چبوترہ ابھی بھی موجود ہے۔ یہ سلیقے سے تراشے اور جوڑے گئے بڑے بڑے پتھر ہیں۔ ایک پتھر کا وزن تقریباً ۲ ہزار کلوگرام ہوگا۔ اس کی تعمیر میں سینکڑوں پتھر استعمال ہوئے ہیں۔ جنہیں ناردا سے لایا گیا ہے جو یہاں سے تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ناردا پہاڑی کے اوپر میدان ہے، جہاں ایک تالاب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاردا ایک جدید ترین شہر تھا۔ کھدائی کے دوران یہاں سے مٹی کی بنی ہوئی پائپیں دریافت ہوئی ہیں جو پینے کے پانی اور ڈرینج سسٹم کے لئے استعمال کی جاتی تھیں۔ یہاں ایک بڑا بازار بھی تھا جس میں ضرورت کی ہر شے دستیاب تھی۔ سرینگر اور دہلی سے یہاں مال سپلائی ہوتا تھا۔ یعنی جدید مارکیٹ اس علاقہ کی دسترس میں تھے۔ یونیورسٹی کی ایک بڑی لائبریری بھی تھی جو کتاب ٹیکسلا میں دستیاب نہ ہوتی وہ یہاں سے مل جاتی تھی۔ دودنیال نالہ سے یہاں کا رابطہ وادی سے ہوجاتا تھا۔ اسی وجہ سے دودنیال نالے کو کاشر ناڑ بھی کہتے ہیں۔ شمالی کوریا، جنوبی کوریا اور چین کا راستہ گلگت اور کیل سے ہوتا ہوا نکلتا تھا۔ کیل سے ایک راستہ اسکردو اور دوسرا مژھل کی طرف وادیٔ کشمیر کو جاتا ہے۔ نوری ٹاپ سے ٹیکسلا تک ڈیڑھ دن کا راستہ تھا۔

شاردا کا ٹیکسلا سے ایک خاص لنک تھا۔ ایک راستہ سرگن، نوری ٹاپ، جہلم کھڈ، بابوسر سے ہوتا ہوا چیلاس کو نکل جاتا ہے۔ شہاب الدین غوری کیل کے راستے ہی حملہ آور ہوا تھا۔ ایک راستہ شونٹھر، رٹو، استور، اسکردو کو جاتا ہے۔ ایک راستہ مظفر آباد تاریل، کنگن کی جانب وادیٔ کشمیر کو ملاتا ہے۔ سرگن سے راستہ نوری ٹاپ جاتا ہے، نوری ٹاپ سے تاراں کا غان 9 گھنٹے کا سفر ہے۔

شاردا کا مطلب سنسکرت زبان میں علم کی دیوی ہے۔ یہاں کی مناسبت سے ایک معروف رسم الخط ایجاد ہوا تھا جسے شاردا رسم الخط یا شاردا لپی کہا جاتا تھا جو دیوناگری میں تھا شاردا اور ٹنکری سے ہی گورمکھی نے جنم لیا ہے۔

ڈوگرہ دور میں یہاں ایک بڑی مورتی رکھی گئی تھی اور مہاراجہ نے حکم دیا اس مورتی کو سرینگر پہنچا دیا جائے۔ لوگ پریشاں تھے کہ کیسے اس بھاری پتھر کی مورتی کو اتنا دور لے جائیں گے۔ مقامی لوگوں نے مشاورت کی دوسرے دن کچھ لوگ راجہ کے دربار میں پیش ہوئے اور چیخ وپکار شروع کر دی اور کہا کہ آپ بھگوان کو لے جائیں گے تو ہمارا کیا بنے گا۔ ہم بھگوان کے بغیر کیسے زندہ رہ پائیں گے۔ یہ علاقہ بھی ویران ہو جائے گا۔ راجہ مان گیا اور کہا کہ ٹھیک ہے اسے یہیں رہنے دو۔ لیکن پھر یہ بھگوان غائب ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ اس میں ہیرے، جواہرات تھے، بعض لوگوں نے اسے توڑ کر نایاب ہیرے، جواہرات لوٹ لئے۔ بعض کہتے ہیں کہ اسے دریائے نیلم میں ڈال دیا گیا تھا، مقامی لوگ آج بھی اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے بزرگوں نے دانشمندی اور حکمت عملی سے معاملہ حل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔

معروف مورّخ البرونی اپنی تصنیف ''کتاب الہند'' میں شاردا کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں کہ سرینگر کے جنوب مغرب میں شاردا واقع ہے۔ اہلِ ہند اس مقام کو انتہائی متبرک تصوّر کرتے ہیں اور بیساکھی کے موقع پر ہندوستان بھر سے لوگ یہاں یاترا

کے لئے آتے ہیں۔ لیکن برفانی اور دشوار گزار ہونے کے باعث میں خود وہاں نہیں جاسکا۔ وہ لکھتے ہیں کہ کنشک اوّل کے دور میں شاردا وسطی ایشیا کی سب سے بڑی تدریسی درسگاہ (Learning Seat) تھی۔ یہاں بدھ ازم کی باقاعدہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تاریخ، جغرافیہ ہیئت، منطق، ریاضی اور فلسفے کی مکمل تعلیم دی جاتی تھی۔ اس درسگاہ کا اپنا رسم الخط تھا جو دیوناگری سے ملتا جلتا تھا۔ اس رسم الخط کا نام شاردا لپی تھا۔ اسی مناسبت سے گاؤں کا نام بھی شاردا ہے۔ اس کی عمارت کو کنشک اوّل نے ۲۴ تا ۲۷ء میں تعمیر کرایا تھا۔ کنشک اوّل نیپال کی ریاست کا شہزادہ تھا۔ شاردا یونیورسٹی کی عمارت شمالاً جنوباً مستطیل چبوترے کی شکل میں بنائی گئی ہے۔ عمارت کی تعمیر آج کے انجینئرز کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ یہ عمارت برصغیر میں پائی جانے والی تمام عمارتوں سے مختلف ہے۔ خاص کر اس کے درمیان میں بنایا گیا چبوترہ ایک خاص فنِ تعمیر پیش کرتا ہے جو بڑا دلچسپ ہے۔ اس کی اونچائی تقریباً ۱۰۰ فٹ ہے۔ چاروں طرف دیواروں پر نقش ونگار بنائے گئے ہیں۔ مغرب کی طرف ایک دروازہ ہے، عمارت کے اوپر اَب چھت کا نام ونشاں باقی نہیں ہے۔ تاہم مغرب سے اندر داخل ہونے کے لئے ۶۳ سیڑھیاں بنائی گئی ہیں۔ آج بھی کچھ قبائل ۶۳ زیورات پر مشتمل تاج ہاتھی کو پہناتے ہیں اور پھر اُس کی پوجا کرتے ہیں۔ ۶۳ کا عدد جنوبی ایشیا کی تاریخ میں مذہبی حیثیت رکھتا ہے۔ بدھ مت کے عقائد سے ملتی جلتی تصاویر اس میں آج بھی نظر آتی ہیں۔ ان اشکال کو پتھر میں کرید کر بنایا گیا ہے۔ اس عمارت کے صحن میں ایک تالاب بھی ہوا کرتا تھا جو آج موجود نہیں ہے۔ کوڑھ امراض میں مبتلا لوگ اس تالاب میں غسل کرنے سے شفا پاتے تھے، چونکہ اس کا پانی دو کلومیٹر دور سے سلفر ملے ہوئے تالاب سے لایا گیا تھا۔

تاریخی شواہد کے مطابق شاردا میں پانچ ہزار افراد موجود رہے تھے۔ شاردا سے کشن گھاٹی تک کا سارا علاقہ آباد تھا۔ کشن گھاٹی شاردا کی مرکزی عمارت سے تین کلومیٹر جنوب

مشرق میں واقع ایک پہاڑی کا نام، جسے مقدس تصور کیا جاتا تھا۔ یہاں ایک لمبی غار تھی، جس میں ایک بُت بنوایا گیا تھا۔ یہاں ہندو مردوں کو جلایا کرتے تھے اور اس راکھ کو کشن گنگا میں بہا دیا جاتا تھا۔ (موجودہ دریائے نیلم)۔ شاردا ماضی بعید میں ناگا اور دراوڑ قبائل کا مسکن رہا ہے جن کے مذہبی عقائد بدھ مت اور جین مت سے ملتے جلتے تھے۔ شاردا قلعہ کے پس منظر سے لوگوں کی اکثریت نابلد ہے، اسی لئے لوگوں میں اس تاریخی اور تدریسی درسگاہ سے متعلق بڑی دلچسپ کہانیاں مشہور ہیں جو یہاں آنے والوں کو سُنائی جاتی ہیں، جن میں دیو مالائی قصّے ہوتے ہیں۔ شاردا میں ایک قلعہ بھی تھا، تاہم آج یہ عمارت پُرانے کھنڈرات کا نظارہ پیش کرتی ہے اور عدم توجہ کا شکار ہے۔ اس کی تعلیمی اور تدریسی اہمیت صرف ایک خواب لگتی ہے۔ شاردا میں میر، نائیک، چوہدری، قوتشی (پٹھانوں کی ایک نسل جن کا سلسلہ بٹگرام علاقے سے ملتا ہے) بٹ، لون، ملک، خوجہ اور شیخ جیسی قومیں آباد ہیں۔ کہتے ہیں کہ بدھ اِزم کے حکمراں راجہ کنشک اور اشوک کے زمانے میں یہاں یونیورسٹی قائم تھی لیکن آج تعلیم کے میدان میں یہاں کے مقامی لوگ ہزار سال پیچھے چلے گئے ہیں۔ تاہم تحصیل کرناہ کا وہ حصّہ جو ہندوستان کا حصّہ ہے تعلیمی معیار میں کسی سے کم نہیں۔ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعظم چوہدری عبدالمجید نے شاردا کا دورہ کیا اور شاردا یونیورسٹی کو بحال کرنے کا اعلان کیا ہے۔ انہوں نے اراضی سے متعلق بھی جانکاری حاصل کی ہے۔ نہ جانے کب شاردا یونیورسٹی ایک بار پھر دنیا کے نقشے پر اُبھر کر سامنے آئے گی اور مقامی و غیر مقامی عوام کو علم کے نور سے منور کرے گی۔ وہاں کی حکومت کو شاردا یونیورسٹی کی جانب توجہ دینی چاہیئے۔ جبکہ ہندوستان میں ایک نجی یونیورسٹی شاردا کے نام سے قائم ہو چکی ہے اور نوئیڈہ نئی دہلی میں ۱۶۳ ایکڑ اراضی پر شاردا یونیورسٹی قائم کر لی گئی ہے جو کہ عالمی معیار کے مطابق ہے۔ یاد رہے کہ شاردا تحصیل کرناہ کے اُس حصّے میں واقع ہے جس پر پاکستان کا قبضہ ہے۔ شاردا میں چنار کے دو درخت تھے جن میں

سے صرف ایک باقی ہے۔ چنار کشمیر کا قومی نشان بھی ہے لیکن منوں کے درخت کا مقامی لوگ اکثر ذکر کرتے ہیں۔ ایک درخت مندر کے صدر دروازے میں ہے جبکہ دوسرا سامنے پار گاؤں میں قبرستان میں ہے۔ یہ بڑا درخت ہے جس کے نیچے قدیم ترین قبر ہے۔ اس قبر کے بارے میں قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں۔ ہزاروں برس قبل دنیا کا بدید ترین شہر آج اکیسویں صدی میں دنیا سے کٹ کر رہ گیا ہے۔

شاردا کا قلعہ پانڈوؤں نے تعمیر کیا ہے۔ یہاں ہر سال میلہ لگتا تھا، بیساکھی کے موقع پر خیمے لگتے تھے۔ یہاں پر فوج کی چھاونی بھی تھی۔ ڈوگرے قلعے میں رہتے تھے۔ یہاں کے زمینداروں سے مویشی خریدتے تھے۔ شاردا میں سیب کے درخت بھی تھے۔ سادھو ہمیشہ موجود رہتے تھے، ایک روایت کے مطابق انہیں بلم کہا جاتا تھا۔ شاردا میں سب سے پہلے "میر" اور "ملک" آباد ہوئے۔ پھر "لون" آئے، "بٹ" خاندان بعد میں آ کر آباد ہوئے۔

پرانی مشکل بدھمی (ھندکو) یا (ھنکو) یا ہزاروی یا پہاڑی زبان کو افغانستان کے ہزارہ قبائل جو وقت کی دھارا کے ساتھ ساتھ سلسلہ کوش کے آر پار آباد ہو گئے، اُن کی زبان ہزاروی کو دس ہزار سال پرانی بتاتے ہیں۔ زبان اور اس کے رسم الخط کو متوازن اور آسان بنایا اور مقامی بولی "ہندکو" کو ہزاروی زبان کے سادہ الفاظ سے مزّین کیا۔ ہندکو یا پہاڑی زبان کے نامور مورّخ ڈاکٹر نیّر ہیں جن کو "تاریخِ زبان ہندکو" لکھنے پر صدرِ پاکستان نے تمغہ امتیاز دیا ہے، کے مطابق دیکھتے ہی دیکھتے یہ زبان کشمیر سے لے کر نیپال تک تمام پہاڑی خطے میں پھیل گئی اور پہاڑوں میں رہنے والے لوگوں کی مشترک زبان بن گئی۔ کشمیر کے آس پاس پہاڑوں میں بدھ مت کے عروج کا زمانہ شاردا رسم الخط والی اس "پہاڑی زبان" کے عروج کا زمانہ مانا جاتا ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب بدھ مت کو زوال آنا شروع ہوا، ہندوستان کے میدانی علاقوں سے بدھ بھکشو بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ گزین ہوئے، تو کشمیر کی وادی بھی

شنکر آچاریہ کے جنوبی ہندوستان سے اُٹھائے ہوئے مذہبی انقلاب سے بچ نہ سکی۔ جب شاردا زبان کے بدھ عالموں اور بدھی ثقافت کو تباہ و برباد کیا گیا تو باری بدھ تحریروں پر پہنچی، یہ بھی جلائی گئیں اور سنسکرت زبان کا دور دورہ ہوا تو کشمیری پنڈت جنہوں نے بدھ مت چھوڑ کر ہندو مت اختیار کیا تو اُن کو سنسکرت زبان سیکھنا مشکل تھا تو انہوں نے ہندو عالموں کو کہا کہ وہ ہندوازم کی مذہبی کتابوں کو شاردا لیپی جو کہ ان کی مادری بھاشا ہے میں تحریر کروائیں تا کہ ہندوازم عوام الناس کے لئے سیکھنا اور سمجھنا آسان بن جائے۔ چنانچہ بہت سی ہندو پوتھیں شاردا لیپی یعنی پہاڑی زبان سے کافی ملتی جلتی بھاشا میں لکھی گئیں اور اب بھی کہیں نہ کہیں پنڈت تعلیم یافتہ گھرانوں میں شاردا کے سامنے دریا کے دائیں کنارے جہاں سرگن نالہ نیلم (کشن گنگا) سے ملتا ہے، وہاں سے ایک نالہ اُبھر کر پہاڑوں کی چوٹی تک سرگن نالہ واٹر شیڈ بناتا ہے۔ اس پہاڑ پر کوئی (۱۴۰۰۰) چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک چھوٹی سی جھیل ہے۔ کہتے ہیں کہ شاردا پیٹھ کے بدھ بھکشو وہاں بھی تپسیا (عبادت) کرنے جاتے تھے۔ اس بلند جھیل کے آس پاس اکثر ابر اور دُھند چھائی رہتی ہے اور اکثر اولے گرتے ہیں۔ لوگ اُس تقدس کے اظہار کے لئے جو شاردا پیٹھ سے انہیں ہے اس جھیل کو "مائی ناردا" کہتے ہیں۔ چونکہ اس علاقہ میں بدھ مت کا وہ فرقہ براجمان تھا جو بتوں کو نہیں پوجتے تھے اس لحاظ سے تحصیل کرناہ کا علاقہ دراوہ کشن گنگا دریا کا درمیانی حصہ یا وادیٔ نیلم) میں مسلم بزرگ بھی اکثر بڑا گوشت کھانے سے پرہیز کرتے تھے اور وضع قطع اور بود و باش میں صوفیانہ رنگ میں رنگے ہوتے تھے۔ شاردا پیٹھ سے کوئی (۱۵) پندرہ میل نیچے ایک مشہور گاؤں دودنیال ہے۔ یہاں نالہ شالہ بٹھو، جمع گنڈ نیلم کے بائیں طرف سے بغل گیر ہوتے ہیں۔ دریا کے بائیں بازو پر دودنیال کا بڑا گاؤں ہے جہاں ڈوگرہ دور کے شروع میں ایک مکتب ہوا کرتا تھا، جس کے مدرس علامہ انور شاہ کشمیری کے والد بزرگوار پیر معظم شاہ صاحبؒ تھے۔ علامہ انور شاہؒ اپنے والد بزرگوار سے ابتدائی تعلیم

حاصل کرنے کے بعد یہاں سے ہی پہلے پلھلی کے مدرسے میں گئے اور پھر والدِ محترم کے پاس ددونیال آتے رہتے ہونگے کہ دیوبند کی اجازت لیں، چنانچہ دیوبند داخلہ کے وقت حضرت انور شاہ صاحبؒ کی سکونت ضلع مظفر آباد درج ہے۔ اس عقدہ کو مولانا محمد سعید مسعودی نے حل کیا کہ علامہ انور شاہ صاحبؒ چونکہ دودنیال سے براستہ ٹیٹوال و مظفر آباد، دیوبند پہنچے تو انہوں نے اپنی سکونت ضلع مظفر آباد لکھوائی کیونکہ دودنیال تحصیل کرناہ کا حصّہ تھا اور تحصیل کرناہ ضلع مظفر آباد کی ایک تحصیل تھی۔ الغرض شاردا پیٹھ کے بدھ بھکشوؤں نے نہ صرف پہاڑی زبان وادب کی خدمت کی ہے بلکہ من پسندانہ رویہ اور سخت ریاضت سے ایسے گہرے نقوش چھوڑے ہیں کہ آج تک بھی شاردا کا نام عزت واحترام سے شاردا جی کہہ کر لیتے ہیں۔ شاردا جی کے متعلق ایک پرانی روایت بھی چلی آتی ہے کہ جب موسم گرما میں دریا کا پانی سرایت کر کے کہیں کہیں سیجل یانمی بن کر نکلتا ہے تو خوش اعتقاد دیہاتی اس سیجل یانمی کے پانی کو جمع کر کے بیمار جانوروں اور بچوں کو شفاء کی امید سے پلاتے ہیں۔ مورّخ کلہن کے کہنے کے مطابق وہاں ایک مندر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ کچھ آوازیں آج کل بھی سُنائی دے رہی ہیں۔

شاردا کو برصغیر کی چار بڑی دانشگاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس دانشگاہ کو عالمگیر شہرت حاصل تھی۔ اس کا قیام ہزاروں برس قبل عمل میں آیا۔ بقول مورخ البیرونی کہ کنشک اوّل کے دور میں شاردا وسطی ایشیا کی سب سے بڑی تدریسی درسگاہ تھی۔ اسے World's Known Seat of Learning کہا جاتا ہے جس کا تعلق تحصیلِ کرناہ سے ہے۔ یہ دانشگاہ برصغیر بلکہ پورے براعظم یوریشیا، ء کے تاریخی، علمی، ادبی اور ثقافتی ورثے پر محیط ہے۔ شاردا قدیم دور کی چار بڑی اور عظیم دانشگاہوں میں سے ایک تھی۔ جہاں برصغیر کے علاوہ چین، تبت، نیپال اور وسطہ ایشیاء یورپ اور افریقہ کے ممالک سے بھی طلباء آ کر فیض حاصل کرتے تھے۔ شاردا کے کھنڈرات تحصیل کرناہ کے علاقہ کیرن

اور آٹھ مقام سے چند میل دور دریائے کشن گنگا کے کنارے وادیٔ نیلم میں آج بھی اس کی عظمت کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کررہے ہیں۔ان کھنڈرات کو آج بھی شاردا کہتے ہیں اور یہاں پہاڑی لوگ آباد ہیں۔ تحصیل کرناہ کو آج بھی یہ فخر حاصل ہے کہ شاردا جی اس کی سرزمین کا حصّہ ہے اور اہلِ کرناہ کے دلوں میں آج بھی علمی ذوق بدرجۂ اتم موجود ہے اور یہاں کے لوگ ترقی کی سیڑھیوں کو پھلانگتے ہوئے شاردا کی عظمتوں اور وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹنے کی کوشش کررہے ہیں۔

............☆☆☆..................

☆...... مصنّف۔جان کولٹ

☆...... تلخیص وترجمہ: تابش بشیر احمد

رہبرِ سیاحتِ کشمیر

نام کتاب:۔ A Guide for visitors to Kashmir

مصنّف :۔ جان کوُلٹ

سنِ اشاعت: ۱۸۹۸ء

زیرِ اہتمام: اے۔ متر ا(چیف میڈیکل آفیسر کشمیر)

شائع کردہ: ڈبلیو، نیومن اینڈ کمپنی ڈلہوزی چوک، کلکتہ

W.Newman & Co. 4, Dalhousie Square, Kolcatta

☆☆☆

۱۸/نومبر ۱۸۳۵ء کو سرینگر میں تین یورپی سیاح ملتے ہیں۔ایک جموں سے واردِ کشمیر ہوتا ہے، دوسرا لداخ سے اور تیسرا اسکردو سے۔انہوں نے اپنی سری نگر آمد کو تاریخی بنادیا۔سنگ مرمر کی ایک کالی سِل پر یہ احوال انہوں نے کچھ یوں کندہ کیے۔

Three Travellers

Baron Carl Von Hugel, From Jammu

John Henderson, from Ladak,

Godfrey Thomas Vigne, from Iskardo

We met in Srinagar.....

ہم تین یہاں سری نگر میں ملنے کا سبب بنے کہ ہم کندہ کریں نام ان یوروپی

سیاحوں کے جو ہم سے پیشتر عازم کشمیر ہوئے ہیں جو یوں ہیں!

برنیئر	(Bernier)	۱۶۶۳ء
فارسٹر	(Forster)	۱۷۸۶ء
مور کرافٹ	(Mooresoft)	۱۸۳۲ء
جیک مونٹ	(Jacquemont)	۱۸۳۱ء
وولف	(Wolf)	۱۸۳۲ء

اس لوح سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپی سیاح کشمیر کی سیاحت کو کس قدر اہمیت دیتے تھے۔ دیتے بھی کیوں نہیں، ظاہر ہے کہ یہ دورے اُن دنوں ہوا کرتے تھے کہ جب کشمیر کی وادی بیرونی دنیا سے قریب کٹی ہوئی تھی۔ بقولِ ایلفن سٹون (Elphin Stone)

"وادیٔ کشمیر اپنی اونچائی (سطح سمندر سے) کی وجہ سے ہندوستان کی گرمی کی حدّت سے بہت دُور ہے جو کہ سنگلاخ چٹانوں اور فلک بوس پہاڑوں کی پناہ میں ہے اور اسے میّسر ہے شیریں آب و ہوا اور مسکن ہے یہ سبزہ زاروں کا...... برف پوش پہاڑوں کی وادی...... جو مریض کے لئے شفاء، محقق کے لئے ذخیرۂ تحقیق، فن کار کے لئے قدرت کا انمول نظارہ، جغرافیہ داں کے لئے مسائل فی العلم الارض کا انبوہ، ماہرِ نباتات کے لئے کثیر مگر گم نام نباتات کا وسیع و عریض باغ اور عالمِ عمرانیات کے لئے الجھی گتھیوں کا مرقع......اور شکاریوں کے لئے ایک بہت ہی بڑی شکار گاہ......"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپی سیاحوں کی نظر میں کشمیر کی کیا اہمیت اور جاذبیت رہی ہوگی کہ جب راستے دشوار گزار اور پُر خطر ہوں اور یہاں کے عام باسی انگریزی سے نابلد۔ ظاہر ہے کہ یہاں گھومنے پھرنے کے لئے کسی جامع ہدایت نامہ کی اشد ضرورت رہی ہوگی۔ یوں جتنے بھی سیاح کشمیر آئے انہوں نے اپنے تاثرات اور معلومات قلم بند کئے اور کچھ نے تو انہیں دوسروں تک پہنچانا اپنا فرض سمجھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو بھی

سیاح وارد کشمیر ہوا، وہ اس کے حسن وخوبصورتی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور جس نے جیسا پایا ویسا ہی لکھنے کی کوشش کی۔

کشمیر میں یورپی سیاحوں کی آمد کا آغاز غالباً زیویئر (Xavier) نامی ایک یہودی سیاح کے مغل شہنشاہ اکبر کے ہمراہ کشمیر آنے سے ہوتا ہے۔ ۱۶۶۵ء میں ڈاکٹر برنیئر Bernier بادشاہ اورنگ زیب کے ساتھ کشمیر آیا۔ اس کے بعد ایک مشنری فادر ڈیسڈیری Father Desideri ۱۷۱۴ء میں کشمیر آیا اور جاڑے کا پورا موسم یہیں گزارا۔ ۱۷۸۳ء میں George Forster سیاحت کی غرض سے عازم کشمیر ہوا۔ اُن دنوں افغان کشمیر پر حکومت کرتے تھے۔ اس کے چالیس سال بعد، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ اقتدار میں مور کرافٹ Moor Craft نے کشمیر کا دورہ کیا۔ ۱۸۳۱ء میں جیک موئنٹ Victor Jaiquemout نے حکومت سے اجازت نامہ حاصل کر کے کشمیر کی سیاحت کی۔ ایک مشنری Wolff ۱۸۳۲ء میں کشمیر آیا۔

غرض یورپی سیاحوں کا یہاں آنے جانے کا سلسلہ چل نکلا اور اسی دوران انہوں نے کشمیر پر کچھ اہم کتابیں بھی تصنیف کیں جن کی تعداد ۱۸۹۵ء میں والٹر لارنس کی شہرۂ آفاق کتاب 'دی ویلی آف کشمیر' تک ۲۵ رکو پہنچ جاتی ہے۔ ان میں مور کرافٹ Moorcraft کی کتاب Journey Through Kashmir تھامس مور کا لافانی شاہکار 'لالہ رخ'، ویگنس Vignes کی Travels in Kashmir ہیگل کی اسفارِ کشمیر وپنجاب Travels in Kashmir & Punjab ویک فیلڈ Wake field کی Happy Valley وغیرہ قابلِ ذکر ہیں اسی سلسلہ کی ایک سنگ میل زیرِ نظر کتاب Guide For Visitors to Kashmir "(راہبرِ سیاحتِ کشمیر) جان کولٹ (John Collet) کی تصنیف ہے جسے انہوں نے غالباً ۱۸۸۴ء میں سپردِ قلم کیا۔ لیکن یہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر ۱۸۹۸ء میں آئی جب اسے چیف میڈیکل آفیسر برائے کشمیر اے۔ مترا

(A.Mitra) نے نظرِ ثانی، ترمیم اور اضافے کے ساتھ معہ ایک روٹ میپ (Rout Map) کے کلکتہ سے ڈبلیو مین اینڈ کمپنی (N.Newan & Co) سے شائع کروایا۔

لیکن اس کتاب کو محض Guide کہنا مناسب نہیں ہوگا کیوں کہ یہ ۱۸۹۸ء کی صورتِ حال کی ایک اہم دستاویز ہے جس میں آپ ایک صدی قبل کے کشمیر کی جغرافیائی، اقتصادی، معاشی، سیاسی اور عمرانی صورتِ حال کی ایک جھلک ضرور دیکھیں گے۔ تقابلی مطالعے کے لئے تو یہ دستاویز دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ مثلاً ان دنوں سڑکوں، پگڈنڈیوں اور شاہراہوں کی صورتِ حال۔ آبی رسل و رسائل پر انحصار۔ ہوٹلوں اور ریسٹ ہاؤسوں کی عدم دستیابی یا کمیابی، سرینگر میں خیموں کا کھلے میدانوں میں انتظام، کرایہ اور مزدوری کی شرحیں، حکمرانوں کا کشمیریوں کے تئیں رخ، جنگلی جانوروں کی بہتات اور جہلم ویلی روڈ کی تعمیرِ نو کے بعد کل صورتِ حال اسی طرح ۱۸۹۳ء کا تباہ کن سیلاب جس نے کئی پلوں اور تعمیرات کو تباہ کر دیا تھا اور اس سیلاب کے بعد آئے زلزلے کی بازگشت میں سے کئی ہزاروں جانیں تلف ہوئیں تھیں۔ لیکن اس سب کے باوجود فاضل مصنف کو جس چیز نے متاثر کیا وہ کشمیر کا قدرتی حُسن ہی ہے جس سے اس کی آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔

وہ یوں رقمطراز ہے......

"دُنیا جہاں میں شاید ہی کہیں کوئی خطۂ زمین ہوگا کہ جس کی تعریف نثر و نظم میں ایسی ہوئی ہوگی جیسی کہ کشمیر کی اور واقعہ یہ ہے کہ یہ ہے بہت خوبصورت۔ سرسبز و شاداب کسی نیلم کی مانند جسے چاروں اطراف سے اَن چھوئی بے داغ برف نے گھیر رکھا ہے...... یہ وادی اصلاً آماجگاہ رہی ہے آریائی نسل کے باشندوں کی اور بیچ اس کے لہراتا، بل کھاتا، بہتا ہے ایک دریا جسے کثرت سے ثمر آور درختوں اور مشکبار پھولوں نے گھیر رکھا ہے اور اس کی شان کو دوبالا کرتے ہیں قد آور چنار اور تناور سفیدے اور پشت پر ایستادہ ہیں برف پوش پہاڑ"۔

وہ تمہید کچھ یوں باندھتا ہے ''فارسی شاعر نے بالکل سچ کہا ہے۔ ''یہ جنت ہے، بروئے زمیں'' بقولِ ویگنی (Vigne) اس کی سطح اتنی نرم و ملائم ہے کہ کسی دوسری جگہ سے اس کا مقابلہ نہیں اور سبزہ و جنگلات کی بہتات کا یہ حال کہ جیسے سارا شمالی علاقہ کنگال ہو گیا ہوگا۔''

پھر آگے چل کر لکھتا ہے 'کشمیرِ بے نظر...... جنتِ بے نظیر...... جو واقع ہے پہاڑوں کے درمیان ...... ایک زرخیز وادی جو ہندوستان کے گرم میدانی علاقے کے دہقاں کے وہم و گماں سے بھی زیادہ پیداواری صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن آپ کو اسے گُدگُدانا ہے کسی کُھرپے سے اور یہ مسکرا کر تمہیں فصل دے گی۔

اس میں بہتے ہیں صاف بلوریں پانی کی نہریں جو پہاڑوں اور چٹانوں سے اُچھلتے کودتے آتی ہیں اور زمین کی زرخیزی بڑھاتی ہیں اور پیاس بجھاتی ہیں درندوں اور انسانوں کی۔

جھیلوں کے گہرے پانیوں میں برف پوش پہاڑوں کے عکس نظر آتے ہیں۔ موسمِ بہار میں یہ وادی پھولوں سے لدی رہتی ہے اور درختوں پر ہلکے پھلکے رنگ اور جھاڑے میں اسے، اَن چھوئی برف کی تہہ لپیٹے رکھتی ہے۔ یہ وہ ملک ہے کہ جہاں قدیم آریاؤں نے مندر اور مکان تعمیر کئے۔ بودھوں نے معبد بنائے اور مغلوں نے مستی و نشاط کے باغ اور چشمے بنوائے اور مسجدیں بنوائیں۔

غرض یہ تمہید نہایت خوابناک اور شاعرانہ ہے اور سیاح جس راستے سے بھی کشمیر آنا چاہے، اس کے لئے رختِ سفر باندھے بغیر چارہ نہیں۔ یہ کُھلا دعوتِ نظارہ راستے کی ناہمواری، سہولیت کے فقدان اور سفر کے مصائب و تکالیف کو ہر چند مانع نہیں ہونے دیتا اور وہ چل پڑتا ہے نئے نویلے راستے پر جو حال ہی میں بن کر تیار ہوا ہے جس کا نام جہلم ویلی کارٹ روڑ ہے Jehlum Valley Cart Road پر اس کتاب کا پہلا باب بھی

ہے......آیئے کچھ دیر کے لئے۔

سیاحوں کے لئے اِشارے (Hints to Travellers)

کشمیر کی سیاحت کے لئے آئے اکثر سیاح ظاہر ہے کہ سب سے آسان راستہ ہی پسند کریں گے اور یہ ہے جہلم ویلی روڈ۔ راولپنڈی پہنچنے پر مسٹر دھنجی بوئے اینڈ سنز Dhangboy & Sons سے، جس کا دفتر ڈاک بنگلہ کے متصل ہے، رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ کمپنی راستہ کے بارے میں کوائف اور سفر کے لئے ضروری تیاری، یکہ وتانگہ اور دوسرے انتظام خود کرے گی۔ سیاح راستے میں کئی ایک ڈاک بنگلے پائیں گے لیکن اکثر تکان سے چُور مسافروں سے بھرے ہوئے ملیں گے۔ ایسے حالات میں، خاص طور پر جبکہ رش بہت زیادہ ہوتا ہے اور آپ معہ اہل وعیال سفر کر رہے ہوں تو بہتر ہے کہ خیمہ (Tent) اپنے ساتھ رکھیں۔ یہ آپ کے لئے اس وقت زیادہ ضروری ہوگا جب آپ وادی پہنچیں گے۔ کشمیر پہنچتے ہی سیاحوں کو کھانے پینے کا خود ہی انتظام کرنا پڑتا ہے۔ خانساماں کا انتظام تو خیر سرینگر میں ہوجائے گا لیکن جن کے ساتھ فیملی ہُو انہیں چاہیئے کہ خانساماں اور ایک نوکر کا انتظام یہیں سے کرلیں۔ اس قسم کے نوکر کشمیر میں ملنا مشکل ہیں۔ موسمِ سرما کے دوران تانگے کشمیر نہیں جاسکتے۔ موسمِ بہار کے ابتدائی ایام میں جب یہاں بہت زیادہ بارشیں ہوتی ہیں، جہلم ویلی روڈ پر کئی جگہوں پر بہت زیادہ پھسلن ہوجاتی ہے اور یوں سفر میں رکاوٹ پیش آتی ہے بلکہ اکثر یہ سفر خطرناک بھی ثابت ہوتا ہے۔ یوں کشمیر کا سیاحتی موسم عام طور پر مئی کے پہلے ہفتہ میں شروع ہوتا ہے اور اکتوبر کے اواخر پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ کشمیر میں موسمِ خزاں بہت ہی خوبصورت ہوتا ہے۔

موسم میں یورپ سے آئے ہوئے افراد کی اچھی خاصی تعداد دارالحکومت سری نگر میں ملتی ہے۔ ملکہ معظّمہ کے جنم دن پر تو ریاستی سرکار سیاحوں کو کھانے پر مدعو کرتی ہے۔

سرینگر پہنچنے پر مہاراجہ آکے مقامی کارندے (ایجنٹ) بابو رام ناتھ رائے صاحب

سے سب سے پہلے ملنا چاہیئے۔ وہ انگریزی روانی سے بولتے ہیں اور بڑے بے لوث سِول آفیسر ہیں۔

مکانیت کشمیر میں بڑی محدود ہے۔ بہت سارے بنگلے جو پہلے سیاحوں کے لئے مخصوص تھے اب سرکاری آفیسران کے تصرّف میں ہیں۔ یہاں کوئی ڈاک بنگلہ یا ہوٹل نہیں ہے۔ اس لئے آپ یا تو کشتیوں میں یا خیموں (Tents) میں رہنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرلیں۔ ہاوس بوٹ House Boat رہائش کے لئے بڑے آرام دہ ہیں لیکن ان کی تعداد بہت قلیل ہے۔ اگر پیشگی کسی دوست یا ایجنٹ کے واسطے سے انتظام نہیں کیا گیا تو پھر ہاوس بوٹ ملنا ناممکن ہے۔ ہاوس بوٹ کا کرایہ 30 روپے سے 50 روپے ماہوار کے آس پاس ہے۔ کنوارے (غیر شادی شدہ) مرد حضرات صرف چنار باغ میں ہی خیمہ نصب کرسکتے ہیں۔ دوسری جگہ اس مقصد کے لئے ہری سنگھ باغ ہے جو ابھی مکمل نہیں ہوا ہے جبکہ چنار باغ سبھی آنے والے سیاحوں کے لئے کافی ہوگا۔ منشی باغ شادی شدہ جوڑوں کے لئے مخصوص رکھا گیا ہے۔ اس میں پکے ایک رویہ مکان بھی تعمیر کئے گئے ہیں لیکن یہ مستقل رہائش پذیر کنبوں نے اٹھا رکھے ہیں۔ اس سے کچھ آگے دریا کے ساتھ ایک خوبصورت جگہ 'رام منشی باغ' قیام کے لئے نہایت موزوں جگہ ہے۔

راستے

وادی پہنچنے کے لئے بہت سے راستے ہیں لیکن سب سے آسانی اور سب سے زیادہ اختیار کیا جانے والا رستہ راولپنڈی اور مری سے گزر کر جانے والا راستہ ہی ہے۔ مسافر کو راولپنڈی سے تانگہ لینا ہے اور سری نگر تک اسی سے پہنچنا ہے۔ کارٹ روڈ 'Cart Road' ہر قسم کے پہیئے والی ٹریفک کے لئے کھلا ہے۔ رستے میں جگہ جگہ پر رسد اور مکان دستیاب ہیں۔

اب جو حضرات نسبتاً کم عبور و مرور والا راستہ اختیار کرنا چاہیں انہیں چاہیئے کہ وہ

گجرات (لاہور سے 71 میل) میں ریل سے اتر جائیں اور تانگے سے بھمبر (Bhimber) (گجرات سے 28 میل) کشمیر کے سرحدی گاؤں پہنچ جائیں۔ یہاں سے براستہ پیر پنچال (Pir Panchal) 167 میل کی مسافت طے کر کے سرینگر پہنچ جائیں۔ یہ مسافت 12 پڑاوں میں طے کی جاسکتی ہے لیکن راستہ سطح سمندر سے 11500 فٹ کی اونچائی پر نہایت مشکل ہے۔ کئی جگہوں پر تو سخت چڑھائی چڑھنی پڑتی ہے۔

یہ وہ تاریخی راستہ ہے جسے مغل حکمران موسمِ گرما میں وادیٔ کشمیر کے دورے کے لئے اختیار کرتے تھے۔ جہاں تک اس کی خوبصورتی اور شان وشوکت کا تعلق ہے تو یہ اس میں اپنی مثال نہیں رکھتا اور اس کا متبادل راستہ جموں سے ہے۔ یہ ریلوے ٹرمینل توی سے شروع ہوتا ہے اور جموں کی پہاڑیوں کے دامن سے ہوتا ہوا درہ بانہال (9200 ft) وادی میں ویری ناگ کے مقام پر داخل ہوتا ہے۔ لیکن یہ راستہ ہزہائی نس مہاراجہ کے لئے مخصوص ہے۔ یورپی سیاحوں کو خصوصی اجازت ناموں کے بغیر داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ راستہ دشوار گزار ہے اور اس پر رسد کا فقدان بھی ہے۔

دوسرے راستے یہ ہیں:

ا۔ براستہ پونچھ، بارہمولہ

۲۔ ایبٹ آباد روڑ جو جہلم ویلی روڑ سے دومیل میں ملتا ہے اور اوّل الذکر تھنہ منڈی میں چھٹے پڑاو پیر پنچال پر ملتا ہے اس میں چڑھائی کم پڑجاتی ہے۔ جب موسمِ سرما میں مری میں برف باری شروع ہوجاتی ہے تب ایبٹ آباد کا راستہ موزوں رہتا ہے۔

دوسرے کئی راستے بھی ہیں لیکن وہ انتہائی دشوار گزار ہیں اور اکثر ندی نالوں پر پُل بھی نہیں ہیں۔ مزید برآں رہائش اور رسد کا بھی فقدان ہے۔

جہلم ویلی روڑ (Jhelum Valley Road)

ریل کا رستہ راولپنڈی میں ختم ہوجاتا ہے۔ تانگہ میں راولپنڈی سے بارہمولہ تک کا

رستہ دو دن میں طے ہوتا ہے۔

یہ راولپنڈی سے علی الصبح نکل کر شام کو گڑھی پہنچتا ہے جہاں رات قیام کرنے کے بعد پو پھٹے پھر نکل پڑتا ہے اور بارہمولہ دن کے ۳ بجے پہنچ جاتا ہے۔ گرمی کے ایام میں اگر راستے میں کوئی رکاوٹ مانع نہ ہو تو تانگہ اپنی منزل یوں طے کر لیتا ہے۔

پہلا دِن

راولپنڈی سے روانگی	۵ بجے صبح
مری آمد	۱۰ بجے صبح

(ناشتہ ہوٹل سَنی بینک (Sunny Bank) پر

یہاں سے	۱۱ بجے دن
کوہالہ	۳۰-۳ بجے سہ پہر
دومیل	۳۰-۶ بجے شام

یہاں (رات کا قیام)

دوسرا دن

دومیل سے روانگی	۵ بجے صبح
اوڑی	۳۰-۱۰ بجے صبح
بارہمولہ	۳۰-۳ سہ پہر

راولپنڈی سے سرینگر تک کی مسافت ۱۹۵ میل ہے۔ اور یہ ۱۴ پڑاؤ میں تقسیم کی گئی ہے۔

راولپنڈی سے چھوٹتے ہی تانگہ ایک ہموار مسطح سڑک پر رواں دواں ہو جاتا ہے۔ سڑک کے دو رویہ شیشم کے درخت ایستادہ ہیں۔ ۱۳ ویں میل پر ایک پہاڑی جو ہڑ کو عبور کر کے ایک بروکا ڈاک بنگلہ نظر آتا ہے۔ اس کے آگے آہستہ آہستہ چڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ۲۳ ویں میل پر چڑھائی بھرپور طریقے سے چڑھنی شروع ہو جاتی ہے۔

اب آپ کا تانگہ کوہ مری کی جانب خراماں گامزن ہے۔ یہاں سے دو راستے ہیں نچلا راستہ مشرق کی طرف مڑ کر کشمیر اور کوہالہ کی سمت اختیار کرتا ہے۔ مری سے کوہالہ تک اُترائی ہے۔ یہ الٹا اور مشکل سفر ہے۔ سڑک کی مخالف سمت میں پونچھ کے راجہ کا علاقہ ہے۔ کوہالہ میں سخت گرمی پڑتی ہے۔ پل عبور کرتے ہی مسافر مہاراجہ کشمیر کی ریاست میں داخل ہو جاتا ہے۔ کوہالہ سے چکوٹی تک شدّت کی گرمی پڑتی ہے۔ اس واسطے یہ سفر صبح سویرے ہی شروع کرنا چاہیئے۔ یہاں پر نیا پل تعمیر کیا گیا ہے جبکہ پرانا پل جو رسیوں سے بنا ہوا تھا ۱۸۹۳ء کے سیلاب میں بہہ گیا۔

جہلم ویلی روڈ جدید انجینئرنگ کا عجیب کارنامہ ہے۔ یہ پہاڑوں کے دامن اور اطراف سے کاٹا گیا ہے اور دریائے جہلم کے کناروں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اس پر کام کی ابتداء ۱۸۸۰ء میں ہوئی تھی اور یہ کام دس سال میں مکمل ہوا۔ پہلے والا رستہ محض ایک پگڈنڈی کی مانند تھا۔ ناہموار اور اوبڑکھابڑ اور پہیئے والی سواری کے لئے تو بالکل ہی ناموزوں۔ کوہالہ سے ۱۲ میل پر دولائی Dulai کا خوبصورت ڈاک بنگلہ ہے۔ دولائی اور دومیل کے درمیان میں دریا کے داہنے کنارے پر ایک تندرو پہاڑی نالہ نین سکھ، جہلم سے آملتا ہے یہاں سے آگے سارا علاقہ مہاراجہ کی ریاست میں شامل ہے۔ دولائی سے دومیل ساڑھے نو میل کی دوری پر ہے۔ دومیل اصل میں کشن گنگا اور جہلم کا سنگم ہے۔ یہاں پر ایک ڈاک بنگلہ ورک شاپ اور اچھا سا ایک پل بنایا گیا تھا جو سب کے سب ۱۸۹۳ء کے سیلاب کی نذر ہو گئے۔ اُس کے دس میل آگے مظفر آباد کا قصبہ ہے۔ یہ ضلع مظفر آباد کا صدر مقام ہے۔ کوہالہ سے بارہ مولہ تک کے سارے راستے اسی ضلع کے زیرِ انتظام آتے ہیں۔ دومیل سے آدھ میل کی دوری پر کشن گنگا ایک پل کو عبور کر کے ایبٹ آباد کی سڑک براستہ گڑھی حبیب اللہ سے ملتی ہے۔ دومیل سے یہ راستہ تیزی سے زاویہ بناتا ہوا جنوب مشرق اور مشرق کی طرف مڑ جاتا ہے۔ گڑھی سے ہٹیاں ۱۰ میل کی مسافت پر ہے۔ یہاں

کچھ چنار کے درخت ہیں لیکن یہ ویسے بڑے اور تناور نہیں جیسے کہ آگے چل کر نظر آئیں گے۔

یہاں سے آگے ٹھنڈی فرحت بخش ہواؤں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے پھر آگے بڑھیں تو اُوڑی کا قلعہ نظر آتا ہے جو چکوٹی سے اوڑی تک دیکھ ریکھ اور راستہ بحال رکھنے کے کے لئے بنایا گیا ہے۔ یہاں سے ایک راستہ پونچھ کو بھی جاتا ہے۔

نیچے جہلم بہت گہرائی میں بہتا ہے۔ یہاں عجیب طرح کا بنا ہوا رسیوں کا پل ہے جسے عبور کر کے مقامی لوگ دوسری طرف کھیتوں میں جاتے ہیں۔ پُل کیا ہے مانو رسیوں کی سیڑھی بچھی ہوئی ہے دریا میں گرنے کا اندیشہ ہر آن رہتا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اوسطاً ہر سال ایک شخص کی جان یہاں جاتی ہے

اوڑی سے آگے سلیٹی چٹانوں سے بنے اونچے سر بہ فلک پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ اونچائی پر بہت ہی کم درخت نظر آتے ہیں لیکن نچلے حصوں میں دیودار کے خوبصورت درخت ہیں۔ رام پور سے گزر کر بونیار ہے۔ یہاں ورک شاپ اور ڈسپنسری بھی ہے۔ ایک میل آگے ایک پرانا مندر ہے جہاں ہندو سرینگر اور دُور دراز سے یاترا کے لئے آتے ہیں۔ اس کے بعد آتا ہے نوشہرہ گاؤں ۔ یہاں سے ایک دشوار گزار راستہ گلمرگ کو جاتا ہے۔ اس کے بعد جہلم کے ساتھ ساتھ آپ بارہمولہ پہنچ جاتے ہیں۔ اس سڑک (Cart Road) سے پہلے، مسافر سیدھے درّہ بارہ مولہ کے اوپر سے ہو کر گزرتے تھے جہاں سے وادیٔ کشمیر کا خوبصورت نظارہ دیکھنے کو ملتا تھا۔

بارہ مولہ ایک بڑا قصبہ ہے۔ یہ دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ دریا پر ایک لکڑی کا پل ہے جو سرینگر اور دوسری جگہوں کے پلوں سے مماثلت رکھتا ہے۔ یہاں ایک ڈاک بنگلہ بھی ہے اور کشتیاں کرایہ پر دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتی ہیں۔ بارہ مولہ سے سری نگر تک تانگہ سڑک اب مکمل ہو چکی ہے۔ لیکن پہاڑی علاقہ سے دھکے کھانے کے بعد اکثر مسافر کشتی کا آرام دہ اور ہموار سفر زیادہ پسند کرتے ہیں۔ نئی سڑک بارہمولہ ایجنسی

روڑے دودھ گنگا پُل سری نگر تک ۳۳ میل ہے۔ بارہمولہ سے تین میل دور خالنسپورہ (خانپورہ) اور ایک میل مزید آگے دلنہ ہے جہاں Dhagibho . E. W نے سڑک کے بائیں جانب اصطبل بنائے ہیں۔ بارہ مولہ میں جو کشتیاں دستیاب ہیں انہیں 'ڈونگا' کہا جاتا ہے۔ اِن کے فرش پر عام طور پر کچھ بچھایا نہیں جاتا، ہاں چھت اور اطراف آراستہ کیئے ہوتے ہیں۔ پچھلا حصّہ ملاح کے کنبہ، کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ رسوئی سے دھواں اور ناقابلِ برداشت عفونت آتی رہتی ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ دو ڈونگے لئے جائیں ایک رسوئی اور نوکروں کے لئے اور دوسرا اپنے لئے۔ حسبِ روایت ان میں کسی قسم کا فرنیچر نہیں ہوتا، البتہ کسی کسی میں ایک عدد کرسی اور تپائی رکھی ملتی ہے۔ بسا اوقات ایسے ہاوس بوٹ بھی نظر آتے ہیں جن میں آرائش کا سامان بھی میسّر ہوتا ہے۔ دریا تک کا راستہ بہت ہی خوبصورت ہے کئی میل تک کا نظارہ جاذبِ نظر ہے۔ پہلے دن کی مسافت میں آپ سوپور پہنچ جاتے ہیں۔ بارہ مولہ اور سوپور کے درمیان ایک گاؤں ہے دوآب گاہ۔ یہاں دراصل نالہ پہرو اور جہلم کا سنگم ہوتا ہے۔ یہاں تعمیری لکڑی کے بڑے بڑے ٹالے لگے رہتے ہیں۔ یہ لکڑی طغیانی کے ایّام میں پہرو کے ذریعے یہاں تک بہائی جاتی ہے۔ اس کام کے لئے مئی، جون، جولائی اور اگست مہینوں کی بارشیں سازگار ہوتی ہیں۔ بارشوں کے بعد پانی اتنا کم پڑجاتا ہے کہ کشتی رانی ناممکن ہوجاتی ہے۔ یہاں سے ایک راستہ لولاب کے لئے نکلتا ہے۔ سوپور میں سیاحوں کی ریل پیل رہتی ہے کیوں کہ یہ وُلر جھیل کے قریب واقع ہے اور مزید براں یہ گلمرگ جانے کے لئے بھی پہلا پڑاؤ ہے۔ ولر کی سیر کے لئے موسمِ گرما کے آواخر میں جانا زیادہ بہتر ہے۔ اس میں ہوا کے تیز جھکڑ چلتے ہیں جو کافی خطرناک ہوتے ہیں اور یہ جھیل ایسے میں بحیرہ کی شکل اختیار کرجاتی ہے۔ لیکن سال کے آخر میں یہ طوفاں شاذونادر ہی اٹھتے ہیں۔ اس لئے وُلر سے گزرنے کے بجائے کشتیوں کو نارو نالے سے گزارا جاتا ہے اور شادی پورہ کے مقام پر جہلم میں اُتارا جاتا

ہے۔اس مسافت کو طے کرنے میں آٹھ گھنٹے لگ جاتے ہیں نارو نالہ سنگھاڑو سے بھرا رہتا ہے شادی پورہ میں نالہ سندھ جہلم سے ملتا ہے۔یہاں ندی میں ایک درخت ہے جس کی جڑوں اور دھڑ کے ارد گرد پتھروں کا باندھ نصب کیا گیا ہے۔اس درخت کے نیچے ایک لنگم ہے جسے ہندو پوجتے ہیں۔اس جگہ کو شادی پورہ دو دریاؤں کے ملاپ کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔دوسری وجہ تسمیہ شردا پور یعنی شاردا دیوی کے نام سے منسوب جگہ ہے۔یہاں نارو نالہ کے اوپر ایک پل ہے جو سرینگر سڑک کو سمبل سے جوڑتا ہے۔

جیسے جیسے آپ آگے بڑھتے ہیں دریا حیرت ناک طریقے سے کشادہ ہوتا جاتا ہے۔شادی پورہ سے سرینگر تک بیچ میں صرف چند گاؤں ہیں۔سوناربنی اور شالٹینگ مع پرانا چھاونی یا کرپارام کی چھاونی۔سرینگر کے مضافات کوئی اچھا تاثر نہیں دیتے۔ پرانی بوسیدہ عمارات جن کی تعداد زیادہ ہے۔دارالخلافہ کے باشندوں کی اقتصادی حالات کی پول کھولتی ہیں۔دریا پہلے پہل کے نزدیک پہنچتے ہی سمٹ جاتا ہے۔دونوں کناروں پر سفیدے کے درخت تقریباً آدھے میل تک نظر آتے ہیں۔سات پلوں میں سے پہلے کو عبور کر کے شہر میں داخل ہوا جاتا ہے۔دونوں اطراف میں شالوں کی بڑی بڑی دوکانیں نظر آتی ہیں۔ان پر انگریزی میں لکھے ہوئے جلی سائن بورڈ یہ پتہ دیتے ہیں کہ ان شالوں کے بہترین خریدار انگریز لوگ ہی ہیں۔

مسافر اپنی کشتیوں کو پہلے پل یعنی امیرا کدل، لال منڈی اور منشی باغ کے درمیان کہیں پر بھی لنگر انداز کر سکتے ہیں۔چنار باغ تو ان میں سب سے بہترین جگہ ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں چنار کے خوبصورت درخت ہیں۔لیکن چونکہ یہ اس نہر کے کنارے پر واقع ہے جو ڈل جھیل کو جہلم سے ملاتی ہے اور نشیب میں ہونے کی وجہ سے بارشوں کے ایام میں اس میں سیلابی پانی بھر جاتا ہے۔

وادیٔ کشمیر (The Vale of Kashmir)

مہاراجہ جموں وکشمیر کی ریاست کی سرحدیں 32.7 شمالی عرض بلند سے 36.58 تک اور 73.26 سے لے کر 80.30 درجہ مشرقی طولِ بلد تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ تقریباً ۸۰۹۰۰ مربع میل کا رقبہ ہے جس میں ۱۸۹۱ء کی رائے شماری کے مطابق آبادی نفوس ۲۵۴۳۹۵۲ ہے۔

اس کی شمالی سرحد پر کچھ چھوٹی چھوٹی نیم خود مختار ریاستیں ہیں جو ریاست جموں کشمیر ہی کے زیر فرمان ہیں یہ سلسلہ قراقرم اور درّہ قراقرم کی شاہراہ جو ہندوستان اور ترکستان کے درمیان بڑی شاہ راہ ہے، کے آس پاس واقع ہیں۔ مشرق میں اکسائی چن، جنوب اور مغرب میں پنجاب کے اضلاع راولپنڈی، جہلم، گجرات سیال کوٹ اور ملک ہزارہ ہے اور ریاست کا حکمران ہز ہائی نس میجر جنرل مہاراجہ پرتاب سنگھ۔ جی۔ سی۔ ایس۔ آئی ہیں۔

کشمیر ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف اقوام آباد ہیں جو مختلف زبانیں بولتے ہیں، مختلف مذاہب کے پیروکار ہیں اور ان کے رسم ورواج بھی الگ الگ ہیں۔

انتظامیہ

مہاراجہ کی ریاست میں کشمیر ایک صوبہ ہے ضلع مظفر آباد بھی انتظامی سطح پر اسی کا حصہ ہے۔ وادی گیارہ تحصیلوں میں تقسیم کی گئی ہے۔

۱۔لار ۲۔سرینگر ۳۔سری پرتاپ سنگھ پور ۴۔ناگام ۵۔اونتی پورہ ۶۔اُتر مچھی پورہ ۷۔ہری پور ۸۔سری رنبیر سنگھ پور ۹۔اننت ناگ ۱۰۔سوپور ۱۱۔پٹن

تاریخ

تاریخ کشمیری سات ادوار میں بانٹی جاسکتی ہے۔

۱۔ ماقبل تاریخ ۲۔ ہندو دور ۳۔ دورِ اسلام ۴۔ مغل دور ۵۔ دُرّانی

۶۔ سکھ ۷۔ ڈوگرہ دور

مشہور کتاب 'راج ترنگنی' جو کلہن پنڈت نے لکھی ہے تاریخ کا سب سے بڑا ماٰخذ ہے۔

آب و ہوا اور موسم (Climate and Meteorology)

کشمیر کی آب و ہوا بہت صحت افزا اور کئی اعتبار سے آس پاس کے ممالک سے مختلف ہے۔ بحیثیت صحت افزا مقام میدانی علاقوں کے دھوپ سے جھلسے ہوؤں کو یہ بہت ہی راس آتی ہے۔ موسم بہار عام طور پر وسطِ مارچ میں شروع ہوتا ہے جب غنچے پھوٹنے لگتے ہیں اور قدرت ایک شاندار رنگ نکھارتی ہے مگر یہ موسم سرد، جھکڑ چلنے اور بارشوں کا موسم ہوتا ہے۔ مئی کے وسط سے موسمِ گرما کا آغاز ہوتا ہے۔ دن گرم مگر راتیں سرد ہوتی ہیں۔ گرمی جون میں بڑھنا شروع ہوتی ہے۔ لیکن یہ کبھی بھی ناقابلِ برداشت نہیں ہوتی۔ ماہ جولائی اور اگست سب سے زیادہ گرم ہوتے ہیں۔ لیکن اکثر اوقات شام کے وقت بادل گرجتے برستے ہیں جس سے ٹھنڈک کا فرحت بخش احساس رہتا ہے۔ جولائی میں بھاری بارشیں اونچے پہاڑوں سے برف پگھلنے کا سبب بنتی ہیں جس سے اکثر سیلاب آتے ہیں۔

ستمبر، اکتوبر اور نومبر خشک مہینے ہیں۔ اکتوبر پُر خنک نسیم سحر کی بابت سب سے خوبصورت مہینہ ہوتا ہے۔ دن میں سورج کھل کر چمکتا ہے اور اس سے بہتر موسم کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ اکتوبر کے اختتام پر بالائی علاقوں میں برف گرتی ہے۔ نومبر کے وسط میں راتوں میں کہرا پڑتا ہے اور درختوں سے پتے جھڑتے ہیں۔ اس سے سبزے کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ جنوری اور فروری میں خوب برف باری ہوتی ہے اور پوری وادی برف کی سفید چادر میں لپٹی رہتی ہے۔

کشمیر کے باشندے (People)

کشمیری آریائی نسل سے ہیں جو مختلف ادوار میں ہجرت کر کے یہاں بسے

ہیں۔ یہ خوبصورت اور بعض اوقات سرخی مائل ہوتے ہیں۔ مرد توانا اور خواتین قبول صورت اور بعض بہت ہی دلکش۔ پردہ نشین خواتین تو کم ہی نظر آتی ہیں۔ مرد لمبا چغہ جسے پھرن کہتے ہیں، پہنتے ہیں، ہندوؤں کے پھرن کی آستین تنگ مگر لمبی ہوتی ہیں۔

کشمیری ایک زبردست چائے نوش قوم ہے۔ لیکن یہ بادہ نوشی سے بالکل شغف نہیں رکھتے۔ اہل کشمیری ایک ذہین قوم ہے جو ہنس مکھ، خوش مزاج اور تخلیقی لیاقت رکھتے ہیں۔ تعلیم کے فقدان اور بیرانی حکمرانوں کی زیادتی سے ان کے چال چلن پر حرف آیا ہے۔ مگر اب تعلیم کے پھیلاؤ، دوسرے اقوام سے تعلقات اور بہتر حکومت انہیں تہذیب یافتہ مقام پر لے آئی ہے۔

۱۸۹۱ء کی مردم شماری برائے وادئ کشمیر و مظفر آباد کے مطابق کل آبادی ۹۴۹۰۴۱ ہے جس میں سے ۶۰۳۱۶ ہندو، ۵۴۷۳ سکھ، ۸۸۳۰۹۹ مسلم، ۱۴۵ عیسائی اور ۸ پارسی ہیں۔ مرد: ۵۰۲۳۴۵ اور خواتین: ۴۴۶۶۹۶ ہیں۔

زبان (Language)

کشمیری ایک مختلف پیچیدہ زباں بولتے ہیں جو سنسکرت کے بہت قریب سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس میں سنسکرت سے زیادہ الفاظ فارسی زباں کے پائے جاتے ہیں۔ ہر سو الفاظ میں ۴۰ فارسی، ۲۵ سنسکرت، ۱۵ اردو، ۱۰ عربی اور باقی ۱۰ تبتی، ترکی، ڈوگری اور پنجابی زبانوں کے پائے جاتے ہیں۔ یہ زبان لکھی نہیں جاتی اور غیر ملکیوں کے لئے سیکھنا قدرے مشکل ہے۔ گاؤں کے لوگ فقط کشمیری ہی سمجھتے ہیں۔

ذخیرۂ الفاظ بہت ہے اور کئی کہاوتیں پُر مغز اور دانشمندی پر مبنی ہیں۔ عدلیہ کی زبان فارسی ہے۔ حالاں کہ حال ہی میں اردو بھی متعارف کی گئی ہے۔ ماضی میں علماء کی زبان سنسکرت تھی، آج کل فارسی ہر جگہ پڑھائی جاتی ہے اور ہر پڑھا لکھا شخص فارسی روانی سے بول سکتا ہے۔ انگریزی بھی کچھ اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے اور لگتا ہے کہ آنے والی

نسلوں کو مغربی زبان میں ہی تعلیم پڑھائی جائے گی۔
تاریخ کا مطالعہ بہت ہی مرغوب ہے۔ تقریباً ہر کوئی تاریخ کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہے۔

مذہب (Religion)

کشمیری اصل میں ناگ مت کے پیروکار تھے۔ وادی بھر میں چشموں کی کثرت ہے جو پہاڑوں کے دامن سے پھوٹتے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے یہ زمین کے وسط سے نکلتے ہیں۔ اور عرصۂ قدیم سے انہیں ناگ پوجا سے متعلق کیا گیا تھا۔ اکثر اوقات پہاڑوں کو ان ناگوں کا مسکن ماننا چاہئے۔ اسی لئے بڑے بڑے مسکن کوثر ناگ مشرقی سرے پر، شیش ناگ امرناتھ کے راستہ پر، اننت ناگ، سالک ناگ اور مالک ناگ قصبۂ اسلام آباد میں، ویری ناگ نے کوکرناگ مشرق میں وغیرہ ناگ کی مثالیں ہیں۔ کئی مقامات ہندوؤں کے لئے مقدس ہیں۔ کشمیر پنڈت شِو اور پاروتی ہی کی اصل پوجا کرتے ہیں۔
اسلام یہاں چودھویں صدی میں آیا۔ کشمیری مسلمان زیادہ تر درویش پرست ہیں۔ ملاح کشتیوں کو کھیتے ہوئے، شکرالدین، نورالدین "اولیاد ستگیر" پکارتے رہتے ہیں۔ شاہِ ہمدان، مخدوم صاحب، حضرت بل، دستگیر صاحب بڑی زیارتیں ہیں جبکہ چرار شریف شیخ نورالدین کی زیارت کو بہت ہی تقدس دیا جاتا ہے۔

تجارت (Trade)

جہلم ویلی کارٹ روڈ (Cart Road) نے تجارت کو وادیٔ کشمیر میں بہت فروغ دیا ہے۔ وادیٔ مجموعی طور پر خود انحصار ہے۔ یہاں تمام بنیادی ضروریات بغیر نمک کے دستیاب ہیں۔ ایک زمانے میں شالوں کی برآمد بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ اس صنعت کے ساتھ ۲۵۰۰۰ افراد وابستہ تھے اور ۳۰ لاکھ سالانہ سے زائد کا کاروبار ہوتا تھا لیکن اب یہ قصۂ پارینہ ہے فرانس جرمن (Franco. German) جنگ سے اسے ایسا دھچکہ لگا کہ

پھر یہ صنعت سنبھل نہ سکی۔ اب جو اشیاء یہاں سے برآمد کی جاتی ہیں ان میں میوہ، ادویات، چمڑا، گھی، تعمیراتی لکڑی، اون سے بنی اشیاء شامل ہیں۔

کشمیری پیپر ماشی کا کسی زمانے میں انگلینڈ میں بڑا چرچا تھا۔ لیکن بعد میں اس کی مانگ کم ہوگئی۔ ووڈ کارونگ بھی ایک پرانی صنعت ہے اس میں آج کل بہت کام ہو رہا ہے۔ لکڑی کا کام کی ہوئی تپائیوں، میزوں جن پر تانبا چڑھا ہو کی بہت مانگ ہے۔ دیودار کی لکڑی سے ختم بند چھت خوبصورتی سے بنائی جاتی ہے۔

کاغذ آج کل ہاری پربت کے نزدیک جھیل میں بنایا جاتا ہے۔ یہ ہاتھ سے بنا ہوا بڑا ہی ملائم ہوتا ہے لیکن پارچہ کی طرح مضبوط۔

چمڑے کی مصنوعات، بندوقیں، تلواریں اور دھات کی مختلف اشیاء جیسے چاقو، اور جراحی کا سامان بھی کشمیر میں بنایا جاتا ہے۔

شراب گپکار ڈل جھیل کے قریب، چشمہ شاہی میں اُگائے انگوروں سے کشید کی جاتی ہے۔ قیمت یوں ہے، کلاریٹ (Claret) چودہ روپے فی درجن (بوتلیں)، برانڈی دو روپے فی بوتل۔ ابریشم کبھی زبردست صنعت تھی لیکن ریشمی کیڑے میں انفکشن لگنے کی وجہ سے یہ صنعت تباہ ہوگئی۔ اس کی طرف دوبارہ توجہ نے اچھے نتائج دکھانے شروع کئے ہیں۔

علمِ آثارِ قدیمہ (Archaeology)

کشمیر میں بہت ساری قدیم عمارتیں ہیں۔ ہندو راجاؤں نے مسلمانوں کے آنے تک بہت سارے مندر بنوائے تھے۔ چشمے بندھوائے تھے اور یادگاریں تعمیر کی تھیں۔ مسلمان حکمرانوں نے فنِ تعمیر میں مزید اضافہ کیا۔ لیکن وقت کے خاموش ہاتھ اور زلزلوں کی اچانک پکڑ نے کچھ کو کر تباہ کر دیا اور کچھ کو جزوی نقصان پہنچایا ہے۔

تخت سلیمان کی کلغی پر بنا شنکر آچاریہ مندر بہت ہی پُرانا ہے۔ اسے جلوکا

(Jaloka) اشوک کے بیٹے سے منسوب کیا جاتا ہے۔اس کی طرزِ تعمیر بنگال کے مندروں سے مشابہ ہے۔

کچھ مندر پانڈوؤں سے منسوب کئے جاتے ہیں جن میں۔ا۔بونیار مندر (بھوانی) ۲۔پٹن کے مندر ۳۔پانڈریٹھن (سرینگر کے نزدیک) قابل ذکر ہیں۔اونتی پورہ کے باقیات بقول لیفٹیننٹ کولے (Cole) راجہ اونتی ورمن کے ۸۵۰ء اور ۸۸۰ء کے بنائے ہوئے مندر ہندوستان بھر میں سب سے اونچی عمارتیں تھیں۔

سکے (Coins)

مہاراجہ نے کشمیر میں جو سکے رائج کئے ہیں وہ ہندوستانی آٹھ آنے کے برابر ہیں اور چاندی کا تازہ جاری کردہ سکہ ہے ہندوستانی ۱۰ آنوں کے برابر ہے۔

تانبے کے ۸ پیسے مہاراجہ کے ایک آنہ کے برابر ہیں جو ہندوستان ۱۲ پیسے پائی کے برابر ہے۔ان سکوں پر حروف J.H.S کنندہ کئے ہوئے ہیں جنہیں اکثر انگریز غلطی سے عیسائی طغرہٗ سمجھ لیتے ہیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں نانک شاہ سکھ مت کے بانی کے نام پر سکہ رائج تھا۔ اس کا مول ۱۶ آنے کے برابر تھا لیکن اس کے حجم کی وجہ سے لوگوں کی نازک مزاجی پر گراں تھا،اس لئے نام روپیہ یعنی آٹھ آنے والا سکہ متعارف کرایا گیا۔لیکن اس سے پہلے ہی نانک شاہی سکے سرینگر کے ٹکسال سے جاری کردیئے گئے جن کی قیمت گزشتہ سکوں سے کم تھی۔اسی کی تمام تر ذمہ داری ٹکسال کے سربراہ کے سر ڈال دی گئی اور بطورِ سزا اس کے دونوں کان کاٹ ڈالے گئے۔

اوزان (Weights)

مندرجہ اوزان کشمیر میں استعمال کئے جاتے ہیں۔

ا خام روپیہ ا تولہ (ماشہ ۱۰۵۴)

۴ خام روپیہ ، اچھٹانک

۴ چھٹانک ، اپاؤ یا ۹ خام روپیہ

۴ پاؤ ، اسیر یا ۶ ۷ خام روپیہ

۶ سیر ، اترک مساوی ۴۸۶ خام روپیہ

۱۶ ترکہ ، اخروار

باپت حکومت کشمیر ۱۵ ترک برابر ہیں ایک خروار کے۔ شالی اور دیگر پیداوار اسی پیمانے سے خریدی جاتی ہیں۔ مَن، جو کہ پنجاب میں ۴۰ سیر کے برابر ہے لیکن کشمیر میں ۴۵ سیر کے مساوی ہے اور کشمیری خروار ۲ من، (۴۵۱۴۵ سیر والے) کے برابر ہے۔

قابلِ دید مقامات

ڈل جھیل: ڈل جھیل ایک پانی کی چادر ہے جس کی لمبائی ۵ میل اور چوڑائی ۲ میل ہے۔ اکثر جگہوں پر پانی کی گہرائی کم ہے لیکن نسیم باغ کے قریب گہرائی ۳۰ سے ۴۰ فٹ ہے۔ لیکن جھیل کی خوبصورتی کو Rugh Grass نے بہت نقصان پہنچایا ہے لیکن اس کے باوجود یہ جھیل بہت ہی خوبصورت ہے۔ بقولِ لارنس ''شاید دُنیا میں کہیں بھی ڈل جھیل جیسی فرحت بخش جگہ نہیں''

نشاط و شالیمار باغ

یہ باغ شہنشاہ جہانگیر کے بنوائے ہوئے ہیں۔ ان باغوں کی خوبصورتی عرصہ دراز سے ماند پڑی ہوئی ہے۔ ان میں دلچسپی کا واحد محرک شہنشاہ اور اُس کی حسین ملکہ نور محل کا حُسنِ انتخاب کیا۔ شالیمار کو پیچھے چھوڑے ہوئے نسیم باغ پہنچا جاتا ہے جسے شہنشاہ اکبر نے تعمیر کیا تھا۔ یہاں ایک نالہ تیل بل جھیل میں داخل ہوتا ہے۔ اس کا پانی بہت ہی صاف وشفاف اور صحت بخش مانا جاتا ہے۔

حضرت بل

تھوڑا سا آگے بڑھ کر سیاح حضرت بل پہنچتا ہے۔ یہاں ایک درگاہ ہے جس میں پیغمبر اسلام کا موئے پاک ایک شیشی میں رکھا گیا ہے۔ مئی اور اگست میں اس کی زیارت کے لئے بہت بڑی تعداد میں زائرین یہاں جمع ہوتے ہیں۔

یہاں سے آگے کشتی نگین باغ اور نالے سے ہوتی ہوئی رعناواری پہنچ جاتی ہے۔

..................☆☆☆..................

✿......کے۔ڈی۔مینی

ضلع کٹھوعہ: تاریخ کے تناظر میں

ضلع کٹھوعہ کو ریاست جموں وکشمیر کا دروازہ مانا جاتا ہے۔یہ ضلع ریاست کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔مشرق کی طرف اس ضلع کی حدیں ہماچل پردیش کے ضلع چمبہ سے ملتی ہیں۔جنوب میں پاکستان کی تحصیل شکرگڑھ اور پنجاب کا ضلع پٹھان کوٹ واقع ہے۔شمال کی طرف ضلع اُدھم پور کی تحصیل رام نگر اور بھدرواہ کا علاقہ آتا ہے اور ضلع سامبہ اس کے شمال مغرب میں پڑتا ہے

ضلع کٹھوعہ کا کل رقبہ 2502 مربع کلومیٹر ہے۔جبکہ ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع کی کل آبادی 5.11 لاکھ نفوس پر مشتمل تھی جن میں 2.69 لاکھ مرد اور 2.42 لاکھ خواتین تھیں۔اس وقت ضلع کٹھوعہ پانچ تحصیلوں یعنی تحصیل کٹھوعہ، تحصیل ہیرا نگر، تحصیل بلاور، تحصیل بسوہلی اور تحصیل بنی پر مشتمل ہے۔اس کے آٹھ ترقیاتی یعنی بلاک کٹھوعہ۔برنوٹی۔ہیرانگر۔بلاور۔ملہار، بسولی۔بنی اور ڈوگون ہیں۔جبکہ یہ ضلع 244 پنچایت حلقوں اور 512 گاؤں اور 89347 خاندانوں میں منقسم ہے۔ضلع کٹھوعہ کی کل آبادی میں سے 0.79 لاکھ افراد شہری علاقوں میں آباد ہیں جبکہ 4.32 لاکھ آبادی دیہات میں مقیم ہے۔ضلع میں کل چھ شہری آبادیاں ہیں یعنی مونسپل کمیٹی کٹھوعہ۔پرول۔لکھن پور۔ہیرانگر۔بلاور اور بسولی ہیں اور ضلع کٹھوعہ میں پانچ اسمبلی حلقے یعنی کٹھوعہ،

ہیرانگر۔ بلاور۔ بسوہلی اور بنی ہیں

آبادی کے لحاظ سے ضلع کٹھوعہ میں ۲۰۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق 4.93 لاکھ ہندو 0.45 لاکھ مسلمان۔ 0.09 لاکھ سکھ اور 0.02 لاکھ عیسائی، بدھ اور دوسرے لوگ آباد تھے موٹے طور پر ضلع کٹھوعہ تین زونوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جموں، پٹھان کوٹ شاہراہ کے جنوب میں واقع علاقہ کٹھوعہ، ہیرانگر اور گگوال سرحدی پٹی پر واقع ہیں یہاں کی زمینیں میدانی اور زرخیز ہونے کے باعث اس پٹی کے لوگ دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ اور خوش حال ہیں جبکہ شمال میں کنڈی علاقہ جات بلاور اور بسوہلی آتے ہیں اور اس سے آگے پہاڑی بنی اور لوٹی ملہار پڑتا ہے۔ کٹھوعہ تحصیل اور ہیرانگر کا علاقہ گرم ترین ہے جہاں درجہ حرارت 48 ڈگری تک پہنچتا ہے جبکہ بنی اور ملہار سرد ترین علاقے گنے جاتے ہیں جہاں سردیوں میں برف باری ہوتی ہے اور درجہ حرارت 36 ڈگری سے تجاوز نہیں کرتا۔ ضلع میں بارش کی اوسط 200 سے لے کر 1200 ملی میٹر تک رہتی ہے۔ بسوہلی اور بلاور میں دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ بارش ہوتی ہے۔ ضلع میں دو اہم دریاؤں میں کشتی رانی نہیں ہوتی البتہ راوی اور اُجھ دریاؤں میں جنگلات کی لکڑی کے شہتیر بہا کر لائے جاتے ہیں جو مادھوپور اور اُجھ بیراج کے قریب دستیاب کئے جاتے ہیں۔ راوی توی اری گیشن کمپلیکس ضلع میں سینچائی کا اہم ذریعہ ہیں۔ ضلع میں مکی گندم اور شالی کی پیداوار ہوتی ہے۔

کسانوں کا ذریعۂ معاش زراعت اور صنعت کے علاوہ مویشی پالنے پر بھی منحصر ہے۔ 2007 کی مویشیوں کی مردم شماری کے مطابق ضلع کٹھوعہ میں 2.37 لاکھ مویشی۔ 0.85 لاکھ بھینس۔ 2.68 لاکھ بھیڑیں۔ 2.09 لاکھ بکریاں 9100 گھوڑے اور 2400 اونٹ موجود تھے۔

ضلع کٹھوعہ کے عوام کی مادری زبان ڈوگری ہے جبکہ شہروں میں ڈوگری زبان

پر پنجابی کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ لیکن گاؤں میں ٹھیٹھ ڈوگری زبان بولی جاتی ہے۔ لولی ملہار علاقے میں کشمیری بولنے والے خاندان بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ یہ خاندان شال بافی صنعت سے جڑے رہے ہیں اور بسوہلی کی شال کی صنعت کے فروغ میں ان لوگوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ روایت ہے کہ یہ خاندان کشمیر سے آکر لولی ملہار میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ ضلع کے شہروں کے آس پاس مقیم دوّدھی گجر آپس میں اپنی مادری زبان گوجری بولتے ہیں جبکہ ہمسایہ برادریوں کے ساتھ ڈوگری میں بات کرتے ہیں۔

اس وقت ضلع کٹھوعہ کو صنعتی لحاظ سے ریاست بھر میں شہرت حاصل ہے اور ہزاروں صنعتی ادارے کامیابی کے ساتھ فروغ پا رہے ہیں۔ ضلع میں سب سے بڑا کارخانہ چناب ٹکسٹائیل مل ہے جہاں سے دھاگہ تیار کرکے برآمد کیا جاتا ہے۔ اس کارخانے میں پانچ ہزار ورکر کام کرتے ہیں۔ اُدھر بسوہلی پشمینہ شال بافی کی صنعت کے لیے پورے ملک میں مشہور ہے۔ آج بھی اس صنعت کو بسوہلی میں فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ یہاں لداخ سے پشمینہ اون درآمد کی جاتی ہے اور بڑھیا قسم کی کتائی کے بعد عمدہ قسم کے شال تیار کرکے بازاوں میں بھیجے جاتے ہیں۔ بسوہلی فن مصوری کے لیے بھی عہدِ قدیم سے مشہور رہا ہے۔ مغلوں کے عہد میں یہاں اس فن کو فروغ حاصل ہوا اور یہاں کے فن کے نمانے امریکہ، برطانیہ اور ہندوستان کی آرٹ گیلریوں کی زینت بڑھا رہے ہیں۔

ضِلع کٹھوعہ کی وجہ تسمیہ

اگرچہ کٹھوعہ علاقہ کے بارے میں عہدِ رفتہ کی تاریخوں میں زیادہ معلومات دستیاب نہیں اِس کے باوجود یہ بات واضح ہے کہ اس ضِلع کا نام کٹھوعہ شہر کے نام پر مشہور ہوا۔ محکمۂ مال کے ریکارڈ کے مطابق اس وقت جہاں کٹھوعہ شہر آباد ہے وہاں تین گاؤں کا ذکر ملتا ہے۔ یعنی طرف تجوالی۔ طرف مجیالی اور طرف بھجوالی۔ ان تینوں بستوں یا گاؤں کو ملا کر عہدِ رفتہ میں کتھائی کہا جاتا تھا۔ کچھ تاریخ دانوں کا خیال ہے 326 ق۔م میں

سکندر کے ساتھ آنے والے تاریخ دانوں نے اپنے سفر ناموں میں علاقہ کشمیر کی طرف ابھیار (پونچھ) اور کتھالی کا ذکر کیا ہے۔ کتھائی جوراوی دریا کے آس پاس واقع تھا موجودہ کٹھوعہ کا ہی پرانا نام ہے جو آگے چلکر کتھائی سے کٹھوعہ ہو گیا۔

عوام میں یہ بھی اعتقاد ہے کہ اندوترا راجپوت خاندان کے سر کردہ شخصیت جودھ سنگھ کا خاندان 2000 سال قبل مسیح ہستناپور سے موجودہ کٹھوعہ میں آکر آباد ہوا تھا۔ جودھ سنگھ کے تین بیٹے تھے جنہوں نے یہاں طرف تجوالی۔ طرف مجیالی اور طرف بھجوالی تین بستیاں آباد کیں تھیں۔ کیونکہ اُن کے نام تجو۔ کنڈو اور بھاجو تھے اور یہ بستیاں انہوں نے اپنے ناموں کی مناسبت سے آباد کیں۔ پھر یہ خاندان پشت در پشت کٹھوعہ میں آگے بڑھتا اور پھلتا پھولتا رہا۔ آج کل بھی ان راجپوت خاندانوں کو تجوالیا۔ بھجوالیہ اور کھانوالیہ راجپوت کہا جاتا ہے۔ موجودہ کٹھوعہ کا شہر اور بازار کا بڑا حصہ طرف تجوالی میں واقع ہے جبکہ پارلی بنڈ طرف مجیالی اور طرف بھجوالی میں پڑتی ہے۔

موجودہ کٹھوعہ ضلع عہدِ رفتہ کی کچھ نہایت ہی اہم اور طاقتور ریاستوں اور راجواڑوں کا مجموعہ ہے

کٹھوعہ ضلع میں علاقہ بنیفٹ 4200 کی بلندی پر واقع ایک خوبصورت مقام ہے۔ اسی طرح بنی سے 20 کلومیٹر کی دُوری پر داھاگر 7000 کی بلندی پر ایک دلفریب سیر گاہ اور چراگاہ ہے۔ اُدھر پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ڈوگن قصبہ قدرتی حسن اور ست رنگے موسموں کا امتزاج پیش کرتا ہے۔ اِن کے علاوہ بنجیال۔ پھونڈ۔ ناچدی۔ چندیل وغیرہ کٹھوعہ کے دیگر اہم سیاحتی مقام ہیں۔

اُدھر کٹھوعہ علاقہ کو مذہبی سیاحت کے لیے بھی اہم مانا جاتا ہے۔ اس ضلع میں سکرار ماتا کا مندر۔ جودھیاں والی ماتا کا مندر۔ شکتی ماتا۔ ماتا بالاسُندری مندر۔ حروٹہ والی ماتا۔ چھونڈادیوی ماتا۔ زیارت پیر فضل شاہ۔ اور پیر بابا لکھ داتا زیارت ضلع کے اہم مذہبی

مقامات ہیں جن کے لیے کٹھوعہ کو مذہبی ساحت پر ابھرنے کا موقع مل رہا ہے۔

ضِلع کٹھوعہ کا تاریخی پسِ منظر

علاقہ کٹھوعہ عہدِ رفتہ کی مختلف ریاستوں راجواڑوں اور جاگیروں کا مجموعہ رہا ہے جن میں ریاست جسروٹہ بلاور۔ جاگیر منکوٹ۔ لکھن پور بھڈو اور تری کوٹ شامل ہیں۔ یہ راجواڑے اور جاگیریں ریاست جموں و کشمیر کے تشکیل پانے سے پہلے اپنا منفرد تشخص اور پہچان رکھتی تھیں۔ ۱۸۴۶ء میں راجہ گلاب سنگھ۔ معاہدہ امرتسر کے تحت جب ریاست جموں و کشمیر کے مہاراجہ بنے تو ضِلع کٹھوعہ میں واقع یہ ریاستیں اور راجواڑے بھی نئی تشکیل شدہ ریاست میں تحلیل کردیئے گئے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے ان تمام راجواڑے اور جاگیروں کو مِلا کر ایک نئی وزارت قایم کی جس کا صدر مقام پہلے بھڈو مقرر ہوا۔ کچھ عرصہ بعد یہ صدر مقام بھڈو سے جسروٹہ (جسروٹہ موجودہ کٹھوعہ شہر سے 15 کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے آجکل یہاں ایک پرانا قلعہ اور کھنڈرات ملتے ہیں اور اکثر سیاح آثار عہدِ قدیم کے اس تہذیبی مرکز کو دیکھنے آتے رہتے ہیں، منتقل ہو گیا۔ لیکن انتظامی لحاظ سے یہ جگہ بھی اُس وقت کے اہلِ اقتدار کو صدر مقام کے لیے موزوں نہ لگی۔ اُدھر جب جموں پٹھان کوٹ۔ شاہراہ کھُلی تو اس وزارت کو جسروٹہ (موجودہ کٹھوعہ) کے مقام پر منتقل کیا گیا جسے اب ضِلع کٹھوعہ کا درجہ حاصل ہے۔ کٹھوعہ ضِلع میں مدغم ہونے والی ریاستوں اور جاگیروں کا ماضی بڑا شاندار اور جاندار رہا ہے جن پر فرداً فرداً بات کرنی مناسب رہے گی۔

جسروٹہ

جسروٹہ کی ریاست کو علاقہ جموں میں اہم مقام حاصل تھا۔ یہ ریاست موجودہ ہیرانگر سے لے کر راوی کے دریا تک بہت بڑے علاقے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس ریاست کی بنیاد جموں کے راجہ جس دیو نے ۱۰۱۹ء میں جموں شہر سے 45 میل مشرق میں دریائے

اُجھ کے کنارے اپنے نام پر شہر بسا کر رکھی تھی اور نام جسر وٹہ رکھا تھا اور اپنے چچا راجہ کرن دیو کو یہ ریاست عطا کردی تھی۔ راجہ کرن دیو کی اولاد جسر وٹہ میں رہنے کی وجہ سے جسر وٹہ راجپوت کہلائی۔ راجہ کرن دیو نے جسر وٹہ میں محلات تعمیر کرائے اور محلات کے نیچے میدان کو چھاونی کے نام سے منسوب کیا، جہاں فوج قیام کرتی تھی۔ راجہ کرن دیو کے بعد اُس کا بڑا بیٹا رائے کالو جسر وٹہ کا راجہ بنا جس نے 1143ء تک حکومت کی۔ پھر ایمل دیو جسر وٹہ کی راج گدی پر براجمان ہوا۔ ایمل دیو کے بعد بولار دیو نے راج حاصل کیا۔ اس کا بیٹا کلاس دیو تھا۔ راجہ کلاس دیو کے دو بیٹے پرتاپ دیو اور سنگرام دیو تھے۔ بڑا بیٹا پرتاپ دیو جسر وٹہ کا راجہ بنا تو چھوٹے بھائی سنگرام دیو نے بغاوت کردی جس نتیجے میں جسر وٹہ ریاست دو حصوں میں تقسیم ہوگئی اور دریائے اُجھ کے اُس پار دریا سے راوی تک تمام علاقے پر سنگرام دیو کا قبضہ ہوگیا جس نے وہاں اپنی خود مختار حکومت قائم کرلی۔ اس راجہ نے لکھن پور کے مقام پر اپنے محلات تعمیر کرائے تھے اور اپنے خاندان کو لکھن پوریہ راجپوت کے نام سے منسوب کیا۔

اُدھر جسر وٹہ کے راجہ پرتاپ دیو کے سات بیٹے تھے بڑا بیٹا جتار دیو والد کے انتقال کے بعد جسر وٹہ کا راجہ بنا پھر اُس کا بیٹا عطر دیو حکمران ہوا۔ جبکہ چھوٹے بھائی بسار دیو کی کٹھوعہ علاقہ پر عملداری ہوئی۔ عطر دیو کی وفات کے بعد بڑا بیٹا سطان دیو جسر وٹہ کا راجہ بنا جو اکبر کے زمانہ میں اس علاقے کا راجہ تھا۔ پھر بالترتیب سکت دیو۔ دولت دیو اور بھبھو دیو جسر وٹہ کے راجے ہوئے۔ شہنشاہ شاہ جہاں نے بھبھو دیو کو خطاب اور خلعت سے نوازا تھا۔ پھر راجہ بھوج دیو۔ راجہ فتح خان شبب دیو۔ جگ دیو اور دھوب دیو جسر وٹہ کے راجے ہوئے دھرب دیو نے جسر وٹہ کے شمالی علاقے صاف کرا کے شہر کو از سرِ نو تعمیر کرایا تھا۔ دھرب دیو کے بعد اُس کا بیٹا کیرت دیو۔ رتنی دیو تخت نشین ہوئے پھر راجہ بھاگ سنگھ۔ راجہ عجب سنگھ۔ راجہ لال دیو اور راجہ بھوری مل نے جسر وٹہ

کے اقتدار کو سنبھالا۔

راجہ بھوری مل بشمول راجہ اعتبار سنگھ بھڈوال مہاراجہ گلاب سنگھ کی فوجوں کے ساتھ سکھوں کی افواج کے ساتھ زبردست لڑائیوں میں شامل رہے اور جسر وٹہ کو بیرونی حملوں سے بچانے کے لیے زبردست جدو جہد کی لیکن کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ 1834ء میں لاہور دربار کی جانب سے جسر وٹہ کا علاقہ راجہ ہیرا سنگھ والد راجہ دھیان سنگھ وزیر اعظم لاہور دربار کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جاگیر کے طور پر عنایت کر دیا۔ ہیرا سنگھ نے جسر وٹہ پر اپنا تھانے دار مقرر کر کے علاقے پر قبضہ کر لیا اسی دوران راجہ سوچیت سنگھ کا انتقال ہو گیا تو راجہ ہیرا سنگھ نے جموں کے راجہ گلاب سنگھ کو لکھا کہ سوچیت سنگھ کی جاگیر رام نگر کو آدھا آدھا بانٹ لیا جائے لیکن راجہ گلاب سنگھ کو یہ تجویز پسند نہ تھی۔ اگرچہ ہیرا سنگھ نے کوشش کی کہ سوچیت سنگھ کی بیوہ جو سامبہ میں تھیں کو قابو میں کیا جا سکے لیکن بات نہ بنی اور اس طرح راجہ گلاب سنگھ اور اُس کے بھتیجے راجہ ہیرا سنگھ کے رشتوں درمیان بھی کٹھاس آ گئی۔ اُدھر جسر وٹہ پر قبضہ کرنے کے بعد راجہ ہیرا سنگھ نے جسر وٹہ کے راجہ بھوری سنگھ کو کسی قدر نقد مواجب لگا کر اُن کے خاندان کو جسر وٹہ علاقہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیا۔ بھوری سنگھ اپنا وطن جسر وٹہ چھوڑ کر جموں کے نزدیک موضع خان پور میں آ گیا۔ راجہ ہیرا سنگھ نے جسر وٹہ پر اپنے دور اقتدار میں قبضہ کے نزدیک محل دفاتر اور دیگر تعمیرات تعمیر کرائیں اور وزیر بچنا کو تھانیدار بنا کر اپنے نائب کے طور پر علاقے پر متعین رکھا۔ اسی دوران ۱۸۴۵ء میں راجہ ہیرا سنگھ پنجاب کی شورش میں قتل ہو گیا اُدھر ۱۵ر مارچ ۱۸۴۶ء کو جموں کے راجہ گلاب سنگھ اور انگریز حکومت کے درمیان معاہدہ امرت طے پایا۔ جس کے تحت نئی ریاست جموں کشمیر وجود میں آئی جو ۷۵ لاکھ روپے میں راجہ گلاب سنگھ نے خرید لی اور اس کا مہاراجہ بن گیا۔ نئی ریاست جموں و کشمیر کے وجود میں آنے کے بعد جسر وٹہ کی جاگیر بھی ریاست جموں و کشمیر میں تحلیل ہو گئی۔ کچھ دیر کے لئے مہاراجہ گلاب سنگھ نے

جسروٹہ کو نئی تشکیل شدہ وزیر وزارت کا صدر مقام بنائے رکھا لیکن بعد میں نئی انتظامیہ حد بندی کی روش میں علاقے کا صدر مقام جسروٹہ سے کٹھوعہ منتقل کر دیا گیا۔

جسروٹہ سے پہلے راجاؤں کا راج ختم ہوا۔ پھر وزیر وزارت کے دفاتر بند ہو گئے جس کے ساتھ ہی جسروٹہ کی مرکزی اہمیت جاتی رہی۔ جسروٹہ جہاں تین سو کے قریب شال باف اپنا کام کرتے تھے وہ بھوکے مرنے لگے اور علاقہ چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر مقامی آبادی بھی معاش کی تلاش میں دوسری جگہوں میں منتقل ہوتی رہی۔ اس طرح جسروٹہ بڑا بازار حویلیاں اور محل تو قائم رہے لیکن ان میں قیام کرنے والا کوئی نہ رہا۔ جسروٹہ ویران اور بے چراغ ہو گیا۔ ان حالات میں ۱۹۲۳ء مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے حکم کے تحت محکمہ مال نے جسروٹہ کے محلات، حویلیوں اور دوکانوں کی لکڑی اور دروازے نیلام کر دیئے اور یہ صدیوں پرانا تاریخی قصبہ کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا۔ اس وقت جسروٹہ کا علاقہ ضلع کٹھوعہ کے حصہ کے طور پر موجود ہے۔ جسروٹہ علاقہ میں تری کوٹ جاگیر بھی قائم تھی۔ یہ علاقہ بھی اب ضلع کٹھوعہ میں شامل ہے اور ضلع کے دوسرے علاقوں کے شانہ بشانہ پھل پھول رہا ہے۔

لکھن پور

بارہویں صدی عیسوی میں جسروٹہ کا راجہ کلاش دیو وفات پا گیا تو اس کے دو بیٹوں پرتاپ سنگھ اور سنگرام میں اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی اور نوبت ریاست کے تقسیم تک جا پہنچی۔ چنانچہ علاقہ جسروٹہ پر پرتاپ سنگھ کا قبضہ رہا لیکن دریائے اُجھ کے اس پار کا علاقہ دریائے راوی تک پر راجہ سنگرام دیو کا تسلط قائم ہو گیا۔ سنگرام دیو نے اپنی ریاست کا نام لکھن پور رکھا اور محلات وغیرہ تعمیر کر کے راج کرنے لگا۔ اُس نے موجودہ لکھن پور کے قریب راوی کے کنارے ایک قلعہ تعمیر کرایا جس کے کھنڈر آج بھی موجود ہیں۔ سنگرام دیو کے بعد اُس کا بیٹا سید و لکھن پور کا حکمران بنا۔ پھر اقتدار جھو جار دیو کے ہاتھ آیا۔ اس خاندان کے مشہور اہلکار میاں مہتاب سنگھ نہایت قابل اور بہادر شخص تھے جنہیں مہاراجہ

رنجیت سنگھ کے اشارے پر راجہ ہیرا سنگھ کا معتبر بنا کر بسوہلی کا راج حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ لکھن پور کی اہمیت اس لئے بھی تھی کہ یہ ایسے مقام پر واقع ہے جہاں اُس زمانہ میں ہماچل کی ریاست نور پور (کانگڑہ) بسوہلی، بھڈواور جسروٹہ کی سرحدیں ملتی تھیں۔

اٹھارہویں صدری کے وسط میں لکھن پور پر ریاست نار پور (کانگڑہ) کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن ۱۸۴۶ء میں جب ریاست جموں و کشمیر کی تشکیلِ نو ہوئی اور گلاب سنگھ معاہدہ امرت سر کے تحت ریاست کے مہاراجہ بنے تو علاقوں کے تبادلہ کی صورت میں لکھن پور کا علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے حصے میں آ گیا۔ جواب ضلع کٹھوعہ کا حصہ ہے۔

۱۹۴۷ء سے قبل لکھن پور ایک گمنام علاقہ ہوا کرتا تھا جہاں ایک کسٹم چوکی ہوتی تھی اور آس پاس کے تمام علاقے اجاڑ اور ویران ہوا کرتے تھے۔ صرف کٹھوعہ سے بسوہلی جانے والی سڑک یہاں سے گزرتی تھی لیکن ملک کی تقسیم کے بعد لکھن پورہ کو زبردست اہم حاصل ہوگئی۔ کیونکہ ریاست جموں و کشمیر تاریخی شاہراہوں سے کٹ گئی تھی۔ اور جموں سیالکوٹ ریلوے لائن بھی بند ہو چکی تھی۔ اس لئے ریاست کا ہندوستان کے ساتھ واحد راستہ لکھن پور سے ہو کر گزرتا تھا اور لکھن پور کو کشمیر کی شہہ رگ کی حیثیت حاصل ہوگئی اسی لئے لکھن پور کو کشمیر کا دروازہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں مونسپل کمیٹی قائم ہو چکی ہے۔ اچھا خاصہ قصبہ اُبھر آیا ہے۔ رات دن ہزاروں گاڑیاں یہاں سے گزرتی ہیں۔ اس مقام پر کسٹم پوسٹ بھی واقع ہے جہاں کشمیر سے برآمد ہونے والے اور کشمیر میں درآمد ہونے والے مال سامان پر ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ اس طرح لکھن پور اب بارونق قصبے میں تبدیل ہو چکا ہے۔

بلاور

بلاور ضلع کٹھوعہ کی ایک تحصیل اور تحصیل بلاور کا صدر مقام ہے۔ ۱۸۴۶ء سے پہلے بلاور کو ڈوگرہ ریاستوں میں سب سے پرانی ریاست کا درجہ حاصل رہا ہے۔ کلہن کی

راج ترنگنی کے مطابق ۱۰۶۳ء تا ۱۰۸۹ء کے دوران کشمیر پر راجہ کلش کی حکومت تھی۔ یہ وہ دور تھا جب سلطان محمود غزنوی کشمیر پر حملہ کے سلسلے میں علاقہ پونچھ کو روند کر لوہر کوٹ پہنچا تھا جہاں پونچھ اور کشمیر کے حکمرانوں نے مل کر محمود کا مقابلہ کیا اور ڈھائی ماہ کے محاصرے کے بعد محمود غزنوی کو لوہر کوٹ پونچھ سے واپس غزنی جانا پڑا تھا۔ اس کے بعد کشمیر غزنی اور قندھار کے سلطانوں کی نظر میں کھٹک رہا تھا اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے راجہ کلش نے کشمیر وادی کے باہر واقع آٹھ پہاڑی ریاستوں کی ایک میٹنگ سری نگر میں بلائی جس میں والئی پونچھ (لوہر کوٹ) کے اُت کرشن راجپوری (راجوری) چمبہ کا راجہ۔ بدھار پور کا راجہ آست ارشر کا راجہ سنگت (ہزارہ) کانڈ کا راجہ کام بھیرسی کاشٹ واڑ (کشتواڑ) کا راجہ اوتم راج اور ولا پور (بلاور) کا راجہ کلش جو تک کا بیٹا تھا شامل ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں بلاور کے راجہ کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔ ولا پور (بلاور) ایک پہاڑی ریاست تھی جو ۱۶۳۰ء تک ریاست بلاور کا دارلخلافہ رہی۔ ۱۶۳۰ء میں اس ریاست کے دارالخلافہ کو بلاور سے بسوہلی منتقل کیا گیا تھا۔ بلاور کے حکمران بلاوریہ خاندان سے مشہور ہیں اور چندر بنسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

نرسنگھ داس نرگس کی تاریخِ ڈوگرہ دیس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ راجہ مان سنگھ شکیہ سے آٹھ پشت پہلے اُن کا بزرگ راجہ بھوگ پال ہوا جو ترمر راجپوت تھا اور الموڑہ سے بلاور آیا تھا اور اُس نے یہاں قصبہ آباد کیا تھا۔ بلاور کا قصبہ بسوہلی سے ۲۲ میل مغرب میں واقع ہے۔ بلاور میں بود و باش کرنے کے باعث یہ خاندان بلاوریہ کے نام سے مشہور ہوا۔ راجہ بھوگ پال کے بلاور آنے سے پہلے یہاں ایک پرانا مندر ہوا کرتا تھا۔ راجہ نے اس مندر کے گردونواح میں قصبہ آباد کیا پھر آس پاس کے دیہات فتح کئے اور بلاور ریاست کی بنیاد رکھی۔ راجہ بھوگ پال کے بعد راجہ ناگ پال، راجہ سنبھ پال، راجہ بھوج پال، راجہ مان شکیہ، راجہ تنونگ پال، راجہ دولت پال، راجہ کشن پال، راجہ بھونت پال، راجہ سنگرام

پال، راجہ ہنڈال پانی، راجہ کرپال پال، راجہ دھیرج پال، راجہ میدنی پال، راجہ اجیت پال، راجہ امرت پال، راجہ بجے پال، راجہ مہیندر پال، راجہ بھوپندر پال بلاور کے اہم اور قابل ذکر راجے ہوئے ہیں۔

راجہ بھوپندر پال کے انتقال کے بعد ۱۸۳۴ء میں ٹکہ کلیان پال کی رانی بھتیال کے بطن ولادت ہوئی تو بسوہلی کے محلات میں نوبت بجنے لگی اور بسوہلی پر قابض ٹکہ کلیان پال کی دادی رانی جسروٹہ نے گھی کے چراغ جلائے اور اپنے بیٹے بھوپندر پال کی موت کے صدمے کو بھول گئی۔ لیکن جلد ہی رانی بھتپال اور اُس کی ساس رانی جسروٹہ کے درمیان رسہ کشی شروع ہوگئی اور ریاست میں افراتفری مچ گئی۔ اس کا فائدہ لاہور دربار نے اُٹھایا۔ چنانچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایک خاص فرمان کے تحت مئی ۱۸۳۶ء میں ریاست بسوہلی راجہ ہیرا سنگھ فرزند راجہ دھیان سنگھ وزیر اعظم لاہور دربار کو جاگیر کے طور پر عطا کردی۔

راجہ ہیرا سنگھ نے میاں مہتاب سنگھ کو ایک جمعیت کے ساتھ بسوہلی پر قبضہ کے لئے روانہ کیا۔ میاں مہتاب سنگھ نے بلاور کو اپنے تصرف میں لے لیا اور ٹکہ کلیان پال کی بسوہلی کے محل میں پرورش جاری رہی۔ کچھ عرصہ کے بعد راجہ ہیرا سنگھ نے ایک حکم کے تحت بلاور کے اس شاہی خاندان کو جسروٹہ طلب کرلیا اور موضع باختہ تحصیل کٹھوعہ میں اُن کی رہائش کا اہتمام کیا۔ لیکن یہاں کا ماحول اس خاندان کو راس نہ آیا اور ٹکہ کلیان سنگھ اپنی ماں کے ساتھ اپنے ماموں رائے کیسری سنگھ کے پاس رام کوٹ چلے گئے جہاں مہارانی بھتیال کا انتقال ہوا۔ پھر کلیان پال کاہنہ چک آگئے اور پانچ ہزار روپے مقرری لاہور دربار سے حاصل کرتے رہے۔ اسی دوران ۱۸۳۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال ہوگیا اور لاہور دربار میں افراتفری مچ گئی۔ اس افراتفری میں پہلے راجہ دھیان سنگھ مارے گئے اور پھر ہیرا سنگھ ۱۸۴۵ء میں قتل ہوگئے تو ٹکہ کلیان پال پھر سے بلاور آگئے۔ اسی دوران جالندھر کے حاکم رنجودھ سنگھ نے بسوہلی پر قبضہ کرکے اسے اپنی کنیز منگلا کو جاگیر کے طور پر دے دیا۔

اب ٹکہ کلیان سنگھ کو اُس کے حمایتی راجہ گلاب سنگھ کے پاس لے آئے جو اُس وقت لاہور دربار میں موجود تھے ٹکہ کلیان سنگھ نے اپنی جاگیر کی واپسی کا دعویٰ کیا۔ لیکن راجہ گلاب سنگھ نے ٹکہ کلیان سنگھ کو جاگیر تو واپس نہ دلوائی مگر موضع جنڈول کا پٹہ لکھ کر دیا اور کہا کہ جب تک بسوہلی کے حالات قابو میں آتے جنڈول میں قیام کرے لیکن ٹکہ کلیان سنگھ بسوہلی آگئے اور علاقے پر اُن کا دبدبہ قائم ہو گیا۔

اسی دوران ۱۸۴۶ء میں معاہدۂ امرت کے تحت جموں کے راجہ گلاب سنگھ ریاست جموں وکشمیر کے مہاراجہ بن گئے اس معاہدے کے تحت بسوہلی کی ریاست بھی جموں وکشمیر کی نئی ریاست کا حصہ قرار پائی۔ چنانچہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے گنداسنگھ منہاس کو بسوہلی کا تھانے دار بنا کر بھیج دیا اور راجہ کلیان پال کو لکھا کہ وہ جسروٹہ میں آکر مہاراجہ سے ملاقات کرے۔ راجہ کلیان پال مہاراجہ سے ملاقی ہوا اور اپنی ریاست کی واپسی کی استدعا کی لیکن مہاراجہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور پانچ ہزار روپے مقررہ منظور کی۔ اس طرح ریاست بلاور جس کی بناء ڈیڑھ ہزار سال پہلے رکھی گئی تھی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے حکم کے تحت ختم ہوگئی اور اسی علاقے کو ریاست جموں وکشمیر میں ملا دیا گیا۔ چندرسی بلاوریہ خاندان کی ریاست بسوہلی ایک ہزار سات سو پچاس مربع میل علاقے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا طول ۳۵ میل اور عرض ۵۰ میل تھا۔ بسوہلی ۴۷ دیہات کا مجموعہ تھی۔ اس کی آبادی ایک لاکھ سے اوپر اور آمدنی ۶۰ ہزار روپے تھی۔ راجگان بلاوریہ کے عہد میں بسوہلی کی ریاست ۳۱ ٹھڑوں پر مشتمل تھی۔ تھڑے کو آج کے دور میں پٹوار حلقہ کہا جاتا ہے۔ ہر ایک گاؤں کا ایک مقدم ہوتا تھا جسے اب نمبردار کہا جاتا ہے۔ ہر گاؤں میں ایک بٹوال کہتے ہیں۔ جیسے آج کے دور میں چوکیدار ہوتا تھا جسے چھوٹے مقدموں کی شنوائی کا اختیار ہوا کرتا تھا۔ چند تھڑوں پر ایک وزیر ہوتا تھا۔ بلاوریہ عہد میں بسوہلی کو خوب عروج حاصل ہوا اور پشمینہ شال بافی وفن مصوری کے باعث اس ریاست کو پورے ملک میں شہرت حاصل ہوئی تھی۔

بسوہلی میں کشیدہ کاری زردوزی کا بہترین کام ہوتا تھا۔ ۱۲ ہزار آبادی والے قصبہ بسوہلی میں پانچ سو دوکانیں پشمینہ شال بافوں کی ہوا کرتی تھیں۔ دور دور سے سوداگر مال خریدنے کے لئے بسوہلی آیا کرتے تھے۔ یہاں مٹی کے خوبصورت برتن اور پیتل کے برتن بھی تیار کئے جاتے تھے جو صفائی اور دلکش کی بدولت کاری گری کی عمدہ مثال تھے۔

مصوری کے فن میں بسوہلی کو دنیا بھر میں شہرت حاصل تھی۔ آج بھی دنیا بھر کے عجائب گھروں میں بسوہلی کی بنی ہوئی تصویروں اور فن پاروں کو اہم مقام حاصل ہے۔ چاہے وہ لنڈن کا دکٹوریہ ابرٹ میوزیم ہو، فرانس کا بودریا پھر امریکہ کا بستین آرٹ میوزیم ہو، ہر جگہ بسوہلی کا آرٹ لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

بسوہلی میں فنِ مصوری کی ابتداء ۱۶۷۸ء تا ۱۶۹۳ء میں راجہ کرم پال کے عہد میں ہوئی۔ بعد میں بسوہلی کے راجہ سنگرام پال نے یہاں کی تیار کردہ تصویروں کو شاہجہاں کے دربار میں پیش کیا تا کہ بسوہلی کی فن مصوری کی بہت پذیرائی ہو۔ تین سال بعد جب راجہ واپس بسوہلی آیا تو اپنے ساتھ مغل دربار کے کچھ فن کاروں کو بھی لے آیا اور انہیں مستقل طور پر یہاں آباد کیا۔ پھر راجہ کرم پال جب مسند نشین ہوا تو بسوہلی میں مصوری کو عروج اور کمال حاصل ہوا۔ بسوہلی کے فن مصوری میں عام طور پر روحانی اور جسمانی محبتوں کو رادھا اور کرشن مہاراج کے پتریم کی صورت میں اجاگر کیا جاتا ہے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی بسوہلی میں فنِ مصوری کا سفر جاری ہے اور یہ فن ضلع کٹھوعہ کی شناخت کا حصہ ہے۔

منکوٹ

منکوٹ جسے آج کل رام کوٹ کہا جاتا ہے، ضلع کٹھوعہ کی تحصیل بلاور کا ایک اہم قصبہ ہے جو بیشتر ندی کے کنارے پر آباد ہے اور دھار اُدہم پور سڑک پر واقع ہے۔ عہد رفتہ میں یہاں ایک چھوٹا سا راجواڑہ قائم تھا جس کی لمبائی ۲۴ میل اور چوڑائی ۱۵ میل تھی۔ منکوٹیہ جاگیر کی بنیاد راجہ مانک دیو نے رکھی تھی جو جموں کے راجہ نرسنگھ دیو (۱۲۷۲ء تا ۱۳۱۴ء) کے

تحت تھا۔ ۱۸۲۲ء سے ۱۸۴۲ء کے دوران منکوٹ جاگیر راجہ گلاب کے بھائی راجہ سوچیت سنگھ نے اس جاگیر کا نام بدل کر منکوٹ سے رام کوٹ کر دیا تھا۔ راجہ مانک دیو کے بعد راجہ اودھے دیو، راجہ نورنگ دیو، راجہ جیرم دیو اور راجہ شور بیر دیو منکوٹ کے یکے بعد دیگرے حکمران رہے۔ پھر راجہ پرتاپ دیو، ارجن دیو، راجہ ستیل دیو، راجہ مہی پت دیو، راجہ ڈھوتا دیو، راجہ تریڈی سنگھ، راجہ عظمت دیو، راجہ دلیل دیو سنگھ اور راجہ چھتر دیو سنگھ نے منکوٹ پر راج کیا۔

راجہ چھتر دیو سنگھ کے عہد میں جموں کے راجہ گلاب سنگھ کے بھائی راجہ سوچیت سنگھ کو بندالتہ ریاست لاہور دربار کی طرف سے جاگیر کے طور پر عطا ہوئی تو ۱۸۲۵ء میں راجہ گلاب سنگھ نے راجہ سوچیت سنگھ کو لکھا کہ وہ جلد سے جلد منکوٹ پر قبضہ کرے تاکہ اس مقام سے بھدو سمرتہ اور جسروٹہ کا رابطہ جموں سے ہو سکے۔ سوچیت سنگھ نے منکوٹ پر چڑھائی کی تو منکوٹ کے راجہ چھتر سنگھ نے اطاعت قبول کر لی۔ پھر راجہ چھتر سنگھ کو منکوٹ چھوڑ دینے کی ہدایت کی گئی اور راجہ کو مجبوراً اپنی جاگیر سے ہاتھ دھونے پڑے اور علاقہ چھوڑنا پڑا۔ سوچیت سنگھ نے منکوٹ کا نام بدل کر رام کوٹ رکھ دیا۔ سوچیت سنگھ کے مرنے کے بعد جموں کے راجہ گلاب سنگھ نے اس راجواڑے کو جموں راج کا حصہ بنالیا جو بعد میں ریاست جموں و کشمیر میں تحلیل ہو گیا۔ اس وقت یہ علاقہ ضلع کٹھوعہ کا حصہ ہے اور تعمیر و ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔

ریاست بھدو[1]

بھدو تحصیل بلاور کا ایک اہم قصبہ ہے اور ضلع کٹھوعہ کا حصہ ہے۔ یہ علاقہ کسی زمانے میں مقامی راجگان کا راجواڑہ ہوتا تھا جو ۳۶ گاؤں پر مشتمل تھا۔ بھدو قصبہ بھنی نالے کے کنارے آباد ہے جو اُجھ دریا کی شاخ ہے۔ اِس خاندان کے راجے بھدوال راجپوت کہلاتے تھے۔

---

[1]: تاریخ ڈوگرہ دیس...... نرسنگھ دیو جموال

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بلاورراج کے بانی بھوگ پال کی چودھویں پشت ے راجہ کلش پال والئ ریاست ہوا۔ اُس کے دو بیٹے تونگ پال اور توکھ پال تھے۔تونگ پال بسوہلی کے راجہ بنے اور توکھ پال کو موضع ہیٹر جاگیر کے طور پر عطا ہوا۔ لیکن توکھ پال نے بغاوت کردی اور اپنے بھائی تونگ پال سے بہت سا علاقہ چھین کر ۳۶ گاؤں پر مشتمل علاقے کا حکمران بن گیا۔توکھ پال نے اپنے علاقے میں دریائے بھنی کے کنارے ایک قصبے کی بنیاد رکھی اور محلات تعمیر کرائے۔ پہاڑی علاقے میں واقع ہونے کے باعث اِس قصبے کا نام پہاڑ پڑ گیا جو وقت کے ساتھ بدلتے بدلتے پہاڑوے بھڈو ہو گیا۔

توکھ پال کے بعد، بکرم پال، نردھن پال، گودر پال، دھرم پال، ادتم پال، رکھن پال، انردھ پال، نکودر پال، کریدھم پال، اننت پال، جے ان پال اس راجواڑے کے راجہ بنے۔ پھر راجہ ابھمان پال چھتر پال، پرتھوی پال اور راجہ ابتار سنگھ بھڈو کے اہم راجہ ہوئے۔ راجہ ابتار سنگھ بھڈو کا آخری راجہ تھا۔اس راجہ کے عہد میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بھڈو کی ریاست بھی راجہ سوچیت سنگھ کو جاگیر کے طور پر عطا کر دی تھی۔راجہ سوچیت سنگھ نے قبضہ لینے کے لئے کارروائی کی تو راجہ انتار سنگھ نے بغاوت کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا اور راجواڑے سے دستبردار ہو گیا۔ پھر اُسے حکم ہوا کہ وہ اپنی جاگیر چھوڑ دے جس کے لئے اُس نے انکار کر دیا۔راجہ گلاب سنگھ نے بھڈو بزور شمشیر پر قبضہ کر لیا اور بھڈو کے راجاؤں کو موضع تلوک پور ضلع کانگڑہ میں منتقل کر دیا۔تب سے یہ خانداں تلوک پورہ ضلع کانگڑہ میں آباد ہوا ہے۔ لمبے عرصہ تک سالانہ پانچ ہزار روپے راجہ ابتار سنگھ اور اُس کے وارثان کو ملتا رہا۔ ۱۵ رمارچ ۱۸۴۶ء کے بعد جب معاہدہ امرت سر کی روشنی میں ریاست جموں وکشمیر وجود میں آئی تو بھڈو جاگیر بھی اس ریاست میں مِلا دی گئی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے نئی ریاست جموں وکشمیر کی عنانِ حکومت سنبھالی تو انتظامی ڈھانچے کو بھی از سرِ نو

ترتیب دیا گیا۔ جس کے تحت جموں کے مشرق میں واقع تمام علاقہ کو وزارت کا درجہ حاصل ہوا اور اس وزارت کا صدر مقام بھڈو قرار پایا۔ کچھ عرصہ کے بعد وزیرِ وزارت کے دفاتر بھڈو سے جسروٹہ میں منتقل کیئے گئے لیکن جسروٹہ مقام بھی وزارت کے دفاتر کے لئے موزوں نہ سمجھا گیا اور پھر اس وزارت کا نام کٹھوعہ شہر بنا۔ یہی علاقہ اب ضلع کٹھوعہ کے نام مشہور ہے جس میں ریاست جسروٹہ، ریاست بلاور، بسوہلی، منکوٹ اور بھڈو تری بوٹ شامل ہیں۔

..................☆☆☆..................

اَصل: ڈاکٹر گلزار احمد راتھر
کشمیری سے ترجمہ: ڈاکٹر فاروق احمد راتھر

کشمیری مثنویوں میں کشمیر کی منظر کشی

بیشتر اصنافِ سخن کی طرح مثنوی بھی فارسی سے ہی کشمیری زبان میں آئی ہے۔ کشمیری زبان میں چند ہی مثنویوں کا اصلی مواد کشمیر سے متعلق ہے۔ ہمارے مثنوی نگار جنہوں نے چاہے ترجمہ کیا، تلخیص سے کام لیا یا پھر کہانیوں میں ردو بدل کیا، کشمیری ماحول اور کشمیری مناظر سے صرفِ نظر نہ کر سکے۔ کیونکہ وہ جو کچھ لکھ رہے تھے کشمیریوں کے لئے لکھ رہے تھے۔ کشمیر ازل سے ہی حسین اور خوبصورت ہے۔ یہاں قدرتی مناظر کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ چشموں، آبشاروں، کہساروں، مرغزاروں، سبزہ زاروں اور رنگ برنگے پرندوں کی سرزمین ہے۔ کسی بھی قلم کار کے لئے یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ تخلیق کاری کے دوران منظر کشی سے دُور رہے۔ اسی لئے ہمارے مثنوی نگاروں کو جب بھی دلکش اور خوبصورت مناظر کا ذکر کرنا پڑا تو کشمیر کی خوبصورتی ان کے پیشِ نظر رہی۔ مثال کے طور پر محمود گامی کی مثنوی ''لال مجنون'' میں بھی باغ کی تصویر دکھائی گئی ہے اور مقبول کرالہ واری کی ''گل ریز'' میں بھی ''نوش لب'' کے باغ کا نقشہ اور لسہ خان فدا کی ''گل بکاولی'' میں بکاولی کے باغ کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ ''لال مجنون'' کا قصہ عرب، ''گل ریز'' کا ایران اور ''بکاولی'' کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ مثنوی نگاروں نے مذکورہ ممالک کو دیکھا تک نہیں

ہے لہٰذا انہوں نے تصوراتی انداز میں سے ہی کشمیری باغات کا ذکر کیا ہے جن میں لذیذ کشمیری پھل اور پھول، دلکش ہوا اور خوش الحان پرندے نظر آتے ہیں۔ ان باغات کی منظر کشی کرتے ہوئے ہمارے مثنوی نگاروں نے تخلیقی قوت سے بھرپور کام لیا ہے۔ مقبول شاہ کرالہ واری نے بھی اور مثنوی نگاروں کی طرح بیسیوں اشعار میں ان باغات کا ذکر کیا ہے۔

محمود گامی کی مثنوی ''لال مجنون'' میں جس باغ کا ذکر آیا ہے۔ اس میں اگرچہ کشمیری پھولوں اور پرندوں کا ذکر کیا گیا ہے تاہم شاعر نے اسے جنت کے باغ سے تعبیر کیا ہے۔ چند اشعار مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

وُچھن باغاہ عجائب جنتس ہیو — بہشتک باغ تتھ ہیوٗ آسہِ ہے رکھو
گُکل پری اُس تراوان منز پوشن — نِوان اُس روشہِ روشے دِل منوشن
گُلاب تے مانوِ پوشہ تے گل مرجان — کھسان اُسی رزِ رزِ عشقہِ پیچان
چھِ پھلو متی کار پتی سنبل یمبرزل — گُلابو رنگہِ دل تے بنیہِ مسول
سبٹھاہ کستورک پوشے نوٗل بولان — تہِ لوٗزِتھ عاشقن دِل اوس پھولان
قُمری اُسی نالہِ دِوان راتی رانس — پران اُسی ذکرِ حق ساری بذاتس

مقبول شاہ کرالہ واری کی شہرۂ آفاق مثنوی ''گل ریز'' اصل میں نخشبی کی ''گل ریز'' کا ترجمہ ہے۔ اگرچہ اس میں بھی جابجا باقی مثنویوں کی طرح شاعر نے فارسی تراکیب کا استعمال کیا ہے لیکن پھر بھی کشمیری مزاج کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس میں مقامی رنگ کئی جگہ صاف اور واضح نظر آتا ہے۔ نوش لب کے باغ کا منظر اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

لگان بیلہِ آسہِ پوشن واو گراے — ہران اُس عطر باغس جلیہِ جاے
خطائی گُل چھکان عنبر وَتن اوس — سپُن مُت باغ صحرائے ختن اوس
چمن تے ڈوٗرک برٗی ساری پوشو — سگو متی چینہِ کھو نافہ فروشو

گلِ داوُدنۍ پٹھ بُلبُل مست　　زلٲرِ کی پٹھ ورق زن اُسی وردست

تھر بن پٹھ کپا ووزِلی گُلہاے انار　　ژلن بُلبُل گُلن پٹھ ہیوٚ تُن نار

نیٚبنمس اُس تتھ منٛز جاے آرام　　نشاطُک صبح زن درشُن تمہٕیک شام

لیکن یہاں پر اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ شاعر نے جس باغ کا ذکر کیا ہے وہ غیر حقیقت پسندانہ نظر آتا ہے کیونکہ اس میں ایک ہی موسم میں وہ سارے پھول جوبن پر دکھائے گئے ہیں جو کشمیر میں مختلف موسموں میں ہی کھلتے ہیں۔ پروفیسر غلام نبی فراق صاحب اس باغ سے متعلق رقمطراز ہیں:

ترجمہ: یہ دوسری بات ہے کہ بہار کے تمام پھول ایک ساتھ پیش کر کے ایسے نظارے کو پیش کیا گیا ہے جو حقیقت سے بعید ہے۔ یمبرزل شروع بہار جبکہ گلِ داوود خاتمۂ بہار پر کھلتے ہیں۔ کشمیر میں ایسی بہار اور ایسا باغ ممکن نہیں۔ یہ تصویر غیر حقیقی ہی ہے اگر چہ یہ سارے پھول کشمیر میں ہی وقفے وقفے پر نمودار ہو کر کھلتے ہیں۔

مقبول شاہ کرالہ واری نے جس زبان کا استعمال "گل ریز" مثنوی میں کیا ہے وہ مقامی زبان ہے۔ مثنوی میں عاشق اور معشوق کی جدائی کا جو منظر پیش کیا گیا ہے اس میں کشمیر کے بہار، جاڑے کے برف، یمبرزل اور بھونرے کا عکس سامنے آتا ہے۔

ژھفتچِہ زوٚنہٕ سرتکر تھےٚ گرٕہُن پیٚوم　　شوٚگوفس شین گلزارس گرہُن پیٚوم

یمبرزل تس نٔ مبورنہٕ مایہ وُجنٕس　　پھٔرکہ وِنی ژٔرگرکہ ژنہٕ نادِ تجنٕس

وبدا کھاُ بسس دِوان ہجرِچ کران لِلم　　ودلو گرٕتھس ٔہ تازِ یمبرزل

مقبول شاہ کرالہ واری نے "بہار نامہ" مثنوی میں بھی کشمیر کی بہار کا منظر اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ یہ نظارہ نہ صرف آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے بلکہ قاری خود اپنے آپ کو بہار میں پاتا ہے۔ شاعر نے نشاط، شالیمار، ڈل جھیل، تیل بل اور فواروں

کاذکر کیا ہے۔ الغرض یہ مثنوی منظر نگاری کی بہترین مثال ہے۔

بہار آو عالم سپُن سبزہ زار   یوان از ہوا بوے گیسوئے یار
بہار آو پوشو گُلو ہیوّت پھولُن   غمک شیپن زن ہیوّت گُلن تے ژُلن
بہار آو سبزار لوّگ ہر طرف   زِ گُل پاءِ خوش مقامن شرف
بہار آو پیوّو پرتو روے یار   توے کوہ و صحرا سپنز لالہٕ زار
بہار آو لوّگ سیر کشتی بہ ڈل   سمے خیل در خیل در تیل بل
بہار آو پھلی لالہٕ در شالہٕ مأر   چو خوبان خیاباں پننز زر نگار
بہار آو تُل شور پاں ژاد رو   چھِ تراواں مانندِ آیینہٕ رَد
بہار آو دَر جوش پھموار آے   منور سپنز صحن و دبستان سرائے

عبدالاحد ناظم کی مثنوی ''زین العرب'' کی زبان دلچسپ اور آسان ہے اس میں واقعات کی ہو بہو تصویر کشی کی گئی ہے۔ اگر چہ ناظم صاحب مثنوی میں ہیرو اور ہیروین کا سراپا بیان کرتے ہوئے فارسی مثنوی نگاروں کی تقلید کرتے ہیں پھر بھی کشمیری ماحول سے صرف نظر نہ کر سکے۔ جو محاورے، مثالیں، تشبیہات واستعارات سراپا نگاری میں استعمال ہوتے ہیں وہ کشمیری ماحول کے عین مطابق ہیں۔ مثنوی میں جگہ جگہ کشمیر کی منظر کشی کی گئی ہے۔ یہ چند الفاظ اور تراکیب ہی لیجئے جو کشمیر کے گردو پیش کے ہی عکاس ہیں۔ مثلاً ٹاکائی، دأن پوش، دور، ڈبکس ژندن لاگن، ہچ کأر، کلن پیٹھ بادمن نیندر چھن، ژنی پیشن منز سیاہ زاغ (خال) گلالہ سُند بر جگر داغ رٹن، انزنہ گردن، شینس پیٹھ نارندر وال ہیو کمر، پنجر دار وغیرہ وغیرہ۔

زرے نہ گُل بدن واتُن میوّے تل   زرے نو ہلیہٕ ہی تے ضایہٕ مسول
زرے نو سرو قد واتُن مزارس   جُدا قمری دِواں گتھ لالہ زارس
دوپیوّم سیوّ دبہٕ ووچھہن ہول ووچھم ما   دو یو شہمأری زُلفو دِل بُچھم ما

مناظرِ کشمیر کو کم و بیش تمام مثنویوں میں پیش کیا گیا ہے۔ تاہم محمود گامی، عبدالاحد ناظم، مقبول شاہ کرالہ واری، محی الدین مسکین اور ولی اللہ متو خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ولی اللہ متو کی مثنوی "ہی مال ناگر رائے" ایک ایسی مثنوی ہے جس کی ٹوپوگرافی آج بھی موجود ہے۔ بلیہ پور، رنبی آر، سپر سمن، ہی مال ناگ، ناگر رائے ناگ اور یارِ ون ہمارے سامنے موجود ہیں۔ کشمیری قصہ، کشمیری ماحول اور کشمیری مناظر ہونے کی وجہ سے اس مثنوی میں جو لذت ہمارے لئے موجود ہے وہ عیاں ہے۔ محمد یوسف ٹینگ رقمطراز ہیں:

ترجمہ: بلیہ پور، رنبی آر، سپر سمن اور یارِ ون آج بھی اُسی حال میں موجود ہیں جس میں وہ آج سے ہزار ہا سال پہلے "ہی مال" کے وقت تھے۔ اُن جگہوں تک پہنچ کر "ہی مال" کے خیالی پیکر میں سچائی کی گرماہٹ پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ ناگر رائے کے فرضی وجود میں یقین کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

ولی اللہ متو کی مثنوی میں کئی دلچسپ مناظر موجود ہیں۔ مثال کے طور پر جب پاتال میں "ہی مال" کو ناگر رائے کی بیوی ڈس کر اور آدھ موئے حالت میں زمین پر لے آتی ہے۔ ناگر رائے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اسے نیم مردہ حالت میں دیکھ لیتا ہے اور اُسے کہتا ہے کہ میں تجھے یارون لے جا کر جھولے میں رکھ لوں گا کیونکہ یارون کی ہوا ہی تیرا مداوا ہے۔ ناگر رائے دو نوکروں سے جھولا اٹھوا کر اُسے یارون پہنچواتا ہے۔ یہی یارون آج بھی بلیہ پور سے چار پانچ میل دور واقع ایک خوبصورت پہاڑی کی چوٹی پر موجود جنگل ہے۔ اسی جنگل میں ناگر رائے نے "ہی مال" کو مرصع جھولے میں رکھا یہاں یہ بات دلچسپ ہے کہ ولی اللہ کا کہنا ہے کہ وہ چرار شریف کے راستے سے یارون پہنچے۔

دوا یے تو ہوا چھے یارِ ون چھے   مفیدِ جان وتن حُبُ الوطن چھے
ژراہ ژرار لاران یارِ ون وأتی   ترے ژٔنی ہمراہ دہمدم ءسہہ تہ چھکھ ستی
سہ منزٔل ژندنک تے لولہِ گٔے اوس   لدٔن تتھ مژ سہ دِلبر صلاح پیوس

مثنوی نگاروں نے دوسری زبانوں کی مثنویوں کو کشمیری کا جامہ پہناتے ہوئے کشمیری سماج، ثقافت، ماحول اور نظاروں کو پیش کیا ہے۔ جہاں جہاں شادی کی تقریب دکھائی گئی ہے دولہا اور دلہن کشمیری ہی ہیں۔ اس دوران مثنوی نگاروں نے اس بات کا خیال نہیں رکھا ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے قصوں کو کشمیری جامہ پہناتے ہیں۔ مثال کے طور پر محمود گامی نے اگرچہ نظامی کی مثنوی کو سامنے رکھ کر ''لال مجنون'' مثنوی لکھی ہے مگر اس کا سارا تانا بانا کشمیر سے ہی متعلق ہے۔ یہاں مجلوٗن بھی کشمیری مجنون اور لال بھی کشمیری لڑکی ہی ہے۔ شادی کے دوران جگہ جگہ ہجر و وصال کے لوک گیت گائے جاتے ہیں۔

بروٗنٹھ بروٗنٹھ شہزادٕ پتہٕ پتہٕ موئے پانہٕ چھےٗ رنگہٕ ووزٕل یے
تاب دلنہٕ ہتھ چھس پانہٕ دوٕد موئے از ژلہٕ اسہٕ وہٕ ہول یے
دوٕد ماجہٕ روٗشتے کیا قبہٕ ٹوئے بجا انن تم پٹن بول یے
سوٗنمن پانہٕ وأنی ژلہٕ لگنہٕ اوئے از ژلہٕ اسہٕ نبہٕ ہول یے

''یوسف زلیخا'' لکھتے وقت محمود گامی کے سامنے قرآن کریم کے سورہ یوسفؑ کے علاوہ فقط مولانا جامی کی مثنوی ''زلیخا'' ہی تھی۔ مگر مثنوی اس کے الفاظ اور اشعار کے تابع نہیں رہتی۔ مثنوی پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ سوتیلے بھائی یوسفؑ کو جیسے کشمیر کے کوہساروں میں ہی گھماتے ہیں اور ''نیری'' پھولوں کے شگوفے پروتے ہیں۔

پھیرٕ کوہن یہ أنکہٕ أندی نیرٕ پوشن کرٕ ہوس گوٗندی
گبہٕ چھوس دوٕدس پھس لوزٕ کران سہٕ موزٕ ووٕس

گل ریز، وامق عذرا، سوہنی مہیوال اور کئی باقی مثنویوں میں بھی شادی کی رسومات کو سرے سے ہی کشمیری دکھایا گیا ہے۔ خواہ وہ مہندی رات کی رسم ہو یا اور کوئی رسم۔ یہاں تک کہ کسی کے مرنے، دور جانے یا پھر زخمی ہونے پر بھی جو ماتم دکھایا گیا ہے وہ من وعن کشمیری ہی ہے۔

محمود کی مثنویوں میں اگر چہ ناموں کا فرق ہے تاہم کُل ملا کے کشمیری فضا ہی نظر آتی ہے حضرت یوسفؑ کے انتقال پر زلیخا جس طرح نوحہ کرتی ہے وہ ایک ایسی کشمیری خاتون کا ماتم ہے جو وہ کسی عزیز کے گزرنے پر کرتی ہے۔ اگر چہ یہ نوحے مثنوی کی ہیئت میں نہیں ہیں پھر بھی یوسف زلیخا سے قطعاً الگ نہیں۔

مرنہٕ چانے پوٚہ مے گوٚ و موشرا ونس پیوم تاوان خاصہٕ نوٚس یاونس

پژ ہی نو یار میٚے مُشرا وُنس ناد لایے میانہٕ یوسفو وولو

مرنہٕ چانے ترٛوو بوٚلن بُلبُلن مرنہٕ چانے جامہٕ پارے کٔری گُلن

مرنہٕ چانے کاَرِ ژ گئے سوٚمبلن ناد لایے میانہٕ یوسفو وولو

ببر چمن ہیٚہ بِرٛتھ چھم گُلے زُلف سوٚمبُل چشمہٕ چھم یمبر زلے

شوٚبہ ہا ژتے قبرِ پیٹھ ترٛاوِتھ زولے ناد لایے میانہٕ یوسفو وولو

محمود کی اکثر مثنویوں میں کشمیر کی منظر کشی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جس کا اعتراف ناجی منوّر یوں کرتے ہیں:

ترجمہ: محمود کی مثنویوں کا منبع عرب اور ایران ہونے کے باوجود کردار اور واقعات کو ان میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ سبھی کشمیری ہی نظر آتے ہیں۔

عشقیہ مثنویوں کے ساتھ ساتھ رزمیہ مثنویوں کو بھی کشمیری جامہ پہنایا گیا۔ ایسا کرتے ہوئے اکثر شعراء قبولِ عام اور بقائے دوام کی خاطر عشقیہ مثنویوں کی طرح مقامی ماحول کو ہی برتا ہے۔

والمیکی کی ''رامائن'' کا دُنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ کشمیری میں پرکاش رام کری گامی نے تلسی داس کی رامائن کو سامنے رکھ کر رام اوتار چرِت جیسی رزمیہ مثنوی لکھی ہے۔ اگر چہ کئی شعراء اس پر طبع آزمائی کی ہے تاہم پرکاش رام کی رامائن سرفہرست نظر آتی ہے۔ اس میں جذبات نگاری اور محاکات نگاری کمال کی ہے۔ کشمیری

مزاج کے عین مطابق صاف، سادہ اور شستہ زبان کا استعمال ہوا ہے۔ الفاظ کا برتاو پرانا معلوم نہیں ہوتا ہے۔ پرکاش رام کی رامائن کے اشعار ہندوں کی شادیوں پر گائے جاتے تھے۔ مسلمان اور ہندو خواتین اون کاتتے ہوئے اس کے اشعار کو گنگناتے رہتی ہیں۔ یہ موجودہ دور کے لکھے ہوئے اشعار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کشمیر کی منظر کشی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

آد بہار بۄل بُلبُلو — سون دولو بریو شاُدی
کاو قُمیر وُچھ پوشہِ نۄلو — آو نالاں زن فُری یاُدی
باو ووندٕ کرٕ غم غوصہٕ گُلہ — سون وولو بریو شاُدی
ژاد سونتھ تے نب گۄو گھلو — بُرأژ پۆتھ ژۄل فساُدی
ٹیکہٕ ہُنٛز تہٕ ورِ کُیم پھولو — سون وولو بریو شاُدی

جب بھی پرکاش رام نے منظر کشی کی ہے تو ایسے ہو بہو مناظر کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ مناظر قاری کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ خواہ وہ بن میں جھونپڑی میں رہنے کا منظر ہو، رام جی والدین سے رُخصت لینا ہو یا راون کی لنکا کی آن بان کا ہو۔ قاری پڑھتے پڑھتے خود کو اس منظر کا شریک ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔

پرکاش رام داستان رقم کرتے ہوئے جیسے بھول ہی جاتے ہیں کہ اس رزمیہ مثنوی کا اصل ماخذ تو کشمیر سے متعلق نہیں۔ اس لئے تو پرکاش رام نے اس مثنوی میں کشمیر کے باغوں، چشموں، پرندوں، پھولوں اور پہاڑوں کا بار بار ذکر کیا ہے۔ یہ مثنوی اُس نے خالص مقامی رنگ میں قلم بند کی ہے۔

رام چندر جی کی بیوی سیتا زنک کے راجہ نے ایودھیا میں دیکھی تھی۔ جب وہ کھیت جوت رہا تھا اور آخر پر جب اُسے اپنی عصمت ثابت کرنے کے لئے ایودھیا میں آگ میں سے پار ہونا پڑا۔ حالانکہ پیٹھ پیچھے بات کا بتنگڑ ابھی بنا یا اور وہ زمین میں جا گھسی۔ پرکاش

رام کو اظہار کے غلبے کی وجہ سے اس بات کا خیال ہی نہیں رہتا کہ کہاں کشمیر اور کہاں اجودھیا۔اس کا کہنا ہے کہ جب آسمان سے دیوتا سیتا کے درشن کے لئے اُترے اور روتے روتے ریشی سے پوچھا کہ سیتا کس جگہ غائب ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ شاہ بارڈورو کے شنکر پور میں سیتا غائب ہوئی بعد میں وہاں ایک چشمہ نکلا۔

سُمِتھ آکاشٕ دیو آیہٕ کرنہِ درشُن　　کرنہِ سیتائِیہ لگی تم پوشہِ وُرشُن
ریٚشِس پرٕژھ اِد تمو کھرٕ کمہِ گامہٕ　　ہرن اوٗش ییلہِ پرن گیہٕ رامہٕ رامہٕ
دوٗ پکُھ تمی ڈوٗرِ شنکر پورِ منز باگ　　وٕستھ گیہٕ بوٗمہِ تل ساٗئنٕزٕ ستی ناگ
کرٕ ہا اکھ اوس توٚت تام از گُری گام　　وٕستھ ییلہِ گیہٕ سوتیٚلہِ بوزنہٕ مےٚ آم
وُچھم تتہِ ڈورِ منز اکھ ناگہٕ رادا　　ہیوٗتُن سیتایہٕ گُن لائیُن مےٚ نادا

راون نے سیتا کو اشوک واٹکا میں نظر بند کر رکھا تھا جو جنت جیسا باغ تھا۔ سیتا تلاشتے ہوئے جب ہنومان کو وہ باغ نظر آتا ہے تو وہ حیران ہوتا ہے حالانکہ لنکا کے اس ہزاروں سال پُرانے باغ کی مدح خوانی کرتے ہوئے پرکاش رام جیسے کسی کشمیر کے خوبصورت باغ کی تعریف ہی کرتے ہیں جس میں صرف کشمیری پھول ہی ہیں، وہی کشمیری پھول جن میں سے کئی نام اب وہ بھول چُکے ہیں۔ پھولوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ لالہ، ارنی، دان پوش، جافر، گلاب، یمبرزل، کوسم، ببر، بطخ لیوٹ، گل انار، لڈر، ونہ پھٹ، زندور، پمپوش، سوسن، کونگ، مسول وغیرہ ۔

سُمِتھ اِسی سارہِ سمسلہٕ کٔرٕ ئتی گُل　　ادا تتہِ باغ بان کاوٕ ے نہٕ بُلبُل
وُچھن ہیوٚتمُت دِلس پٹھ داغ لالن　　دین دوٗربر بہٕ نوچھس یارٕ ژالن
اُرِنی کھوٗمٕژ نکھس پٹھ داٗن پوشن　　دین جعفر گولابن چھنہٕ پوشن
یمبرزول بہٕ گمٕژ زن برگِ موسم　　دپن کو تاہ زٔرِتھ ہکبہٕ چشمہٕ لوسم
پربیتاب گاٗمٕژ پان مارن　　بطخ لیٹس دپان وُچھ گل انارن

لڑر پوشس دِپان وتہٕ پھٕٹہٕ تہٕ، زندور
ودن پمپوش آسس چشمہٕ لوسن
گولابس اُمس لایان ناد مسول

پھولکھ نے پلنہٕ اسہِ واتیا کرُن زور
تِمس شمشیر ہتھ گوٚو لارِ سوسن
ہتم چھہٕ نورگن راتس دوہس کلپ

موتی لال ساقی ایک معنی خیز نکتہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ پرکاش رام نے رامائن کہانیوں نے براہ راستہ ترجمہ نہیں کیا ہے۔ اس کی مثنوی میں کردار اور واقعات مستعار ہیں لیکن ماحول بالکل کشمیری ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اَتھ کتابہِ منز چھُ کشیر ہندبن اِستھاپنن تہٕ ترہَن ہُند کھلہٕ ڈُلہٕ ذکر۔ تِمی چھُ ماحول پننہٕ اَندٕ پکھٕ منز حاصِل کرِتھ پلاٹس رنگ بوٗ رُمت اَتھ منزِ چھِ گنگہٕ بل یاترلہِ گوٚدھان گوٚدھان وتہِ یم تیرتھ یوان، وبوٗارناگ، گنگہ بل، نٔر، ہرموکھ، مہالش، برہمہ سر، کرینکہٕ ند۔ کتابہِ منز چھِ لُکنہٕ کس گونس منز زیادٕ ترتِمے یاتراین ہُند ہینہٕ آمت۔ یمن ہُند تعلق کشیرِ ستی چھُ یمن یاتراین منز چھے رودِر سندِ یا۔ ترِ سند یا اَکن گامُچ شوبھا بھگوتی، بالہٕ ہامُچ بالکاتہٕ زلایہِ بیتر ہنز تھاپنلیہ کشیرِ منز سارنے رِ ہتس تہٕ تہٕ دنہٕ تہٕ۔"

(شیراز: جنگ نامہ نمبر، جلد: ۱۴، شمارہ: ٦، ص: 171-172)

ترجمہ: اس کتاب میں کشمیر کے استھاپن اور تیرتھوں کا کھل کر ذکر ہے۔ اُس نے اپنے گردو پیش کے ماحول سے ہی پلاٹ تیار کیا ہے۔ اس میں گنگہ بل جاتے ہوئے جن تیرتھوں کا ذکر ہوا ہے وہ ہیں ویڈارناگ، گنگہ بل، نٔر، ہرموکھ، مہالش، برہمہ سر، کرینکہ ندوغیرہ کتاب میں جن جگہوں کے نام لئے گئے ہیں۔ زیادہ تران کا تعلق کشمیر سے ہے۔ جن یاترا کی جگہوں کا نام لیا گیا ہے ان میں "رودِ سندیا" ترسندیا، اکن گام کی شوبھا بھگوتی، بالہامہ کی بالکا اور زالایہ دغیرہ جیسے استھاپن کشمیر میں سبھی کو یاد ہیں۔

مقامی ماحول پیدا کرنے میں پرکاش رام کی لیلائیں اُس کی بہت حد تک مدد کرتی ہیں جو لیلائیں اُس نے مثنوی میں مختلف موقعوں پر لکھی ہیں۔

وہاب پرے حاجنی، لکھمن جو بُلبل اور امیر شاہ کریری بھی فارسی رزمیہ مثنویوں کو کشمیری جامہ پہناتے ہیں۔ امیر شاہ کشمیری مثنوی نگاروں میں واحد مثنوی گو ہیں جو شروع ہی سے کشمیریوں میں جنگی جوش و جنوں کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ کشمیری سخت جاڑے میں کانگڑی کے متواتر استعمال سے انتہائی ڈرپوک ہو کر کسی بہادر کو دیکھ کر لرز جاتے ہیں۔ تاہم شاعر نے کانگڑی جنگ کا نقشہ ان اشعار میں پیش کیا ہے۔

چھِ کاشرِ نشان گُرزٕ خنجرٕ چھتھ اڑان لرزٕ چھکھ کانہہ دِلاورٕ چھتھ
مُنلی جامن اندر گمتی ٹھیلہٕ پوش گُجاورِع ، خفتان گجا تلہٕ توش
مگر تم چھِ ہنگامِ سرادِلیر کڈان کانگرٕ بن کش بمانٕہ شیر
مے کور غیرت از جملہٕ کشمیریاں گرٕم چست وچوبک یہِ کاشر زبان

اسی طرح امیر شاہ کریری میوہ جات کا تذکرہ کرتے ہوئے کشمیر کی تمدنی اور ثقافتی میراث کو زبان عطا کرتے ہیں۔

قند و سرتہٕ شاہلٕہ انبر تہٕ ناکھ سفر قند، زرٕ ہام، کشمش تہٕ داکھ
جگر داُن ، بمہٕ ژوٗنٹھ ، نارنج خاص ژٕنُو ، ژٕیر ، اولچہ ، توت و گلاس

لکھمن جو بُلبُل بھی اپنے "سام نامہ" میں باغ کی منظر کشی کرتے ہوئے مختلف کشمیری پھولوں اور پرندوں کا ذکر کرتے ہوئے کشمیر کے گرد و پیش کی عکاسی کرتے ہیں۔

چمن بُرٕ بُرٕ گلن ہندی رنگ بر رنگ تھر بن پیٹھ بولہٕ وِنی بُلبُل خوش آہنگ
پکہٕ وُن آب جوین آبِ زمزم تِلکِ چشمہٕ کران اُسی کوثرس زم
وُچھِتھ سُے بُلبُل گُل لاگی پامن گلو دُیت چاک جامن تلہٕ دامن
ودا تس خونگٕے دلہٕ چشمہٕ دُیشم گُلالہٕ زان کرزٕ نل چشمہٕ ودچھم

چھُ بوٚمبر ژٕرے یمبر زٕل ہُنٛد تِمس داغ　　چھُ طوطی شکرس چانٛس سٕہ ہیتھ زاگ
چھُ بُلبُل چانہِ گُلزارُک تِمس شوق　　چھُ قمری چانہِ سرٕوُک نالٕک تس طوق

وہاب پرے حاجنی فارسی "شاہنامہ فردوسی" ترجمہ کرتے ہوئے کشمیری زبان میں ایک بیش بہا اضافہ کرتے ہیں۔ بقولِ ڈاکٹر محفوظہ جان:

"وہاب پرے چھُ شاہ نامس منٛز پننہِ قومکی خدوخال اکہِ نتہِ بیٚیہِ رنگہٕ پیش کران۔ یوٚدوے "شاہ نامہ" ایرانی تہذیبک تہٕ ثقافتُک نیم تواریخی بیان چھُ مگر وہاب پرے چھُ شاہنامس منٛز کشیرِ ہنٛز تہذیبک، ثقافتُک، کاشرین عقیدن تہٕ سوچن تراین تہٕ کُلہم پاٹھی کشیرِ ہنٛدس پوٚت منظرس تتھ کنی پیش کران زِپرن وأل‌س چھُ کاشر مقامی رنگ أچھن بروٚنٛہہ کنہِ جلوٕ گر سپدان۔"

(کأشرین مثنوین ہند تجزیاتی مطالعہٕ)

ترجمہ:۔ "وہاب پرے حاجنی "شاہنامہ" فردوسی میں اپنے ہی قوم کے خدوخال مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں۔ اگر چہ شاہنامہ ایرانی تہذیب وثقافت کا نیم تواریخی بیان ہے تاہم وہاب پرے شاہنامہ میں کشمیری تہذیب، ثقافت، عقائد، سوچ اور کُل ملا کے کشمیر کے پسِ منظر کو اس طرح پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ قاری کے سامنے کشمیر کا پورا مقامی رنگ جلوہ فگن ہوتا ہے۔"

مثال ملاحظہ ہو۔

چون سوسن بہ سوسن بہم رنگ اُسی　　کران سوسنس ستی تم جنگ اُسی
وولو سوسنو کمی ژٕرے کوٚر نے یہِ رنگ　　کوٚ چھُکھ ژٕ دِل تنگ بالاتے سنگ
چھُ ہر کانٛسہِ اتھ سوسنس باج دُیِن　　کلٕس سارِنے سوسنگ تاج دُیِن
رَٹے جاے اُلِس اندر کوترن　　نکھس تے پکھن واش کوٚڈشہہ پرن

گربدن بأ کبوتر کرن دست زور   کبۆتر گھٹِتھ رۆد در تپر گور

گربدس أمِس دأرِتھ پتے آو شال   بہ صحرا مُور کوترن پروبال

اسی طرح وہاب پرے حاجنی نے ''جنگِ ایران'' میں صبح کا جو سماں پیش کیا ہے وہ ایران کی بجائے کشمیر کی صبح کا خوبصورت عکس ہی نظر آتا ہے۔

صُبح پھۆل تہٕ کۆستۆری ٹُل کربکہٕ ناد   قُمری دردِ دِل کوترس پووياد

سرِ شاخ ٹُل بُلبلو ہاے و ہۆل   تمے لولہٕ بولہٕ نے پوشنول

شمالن مُشُر سرو شرٲبن ہوا   جنوبس پھِرُن اتھہٕ مژی نوا

..................☆☆☆..................